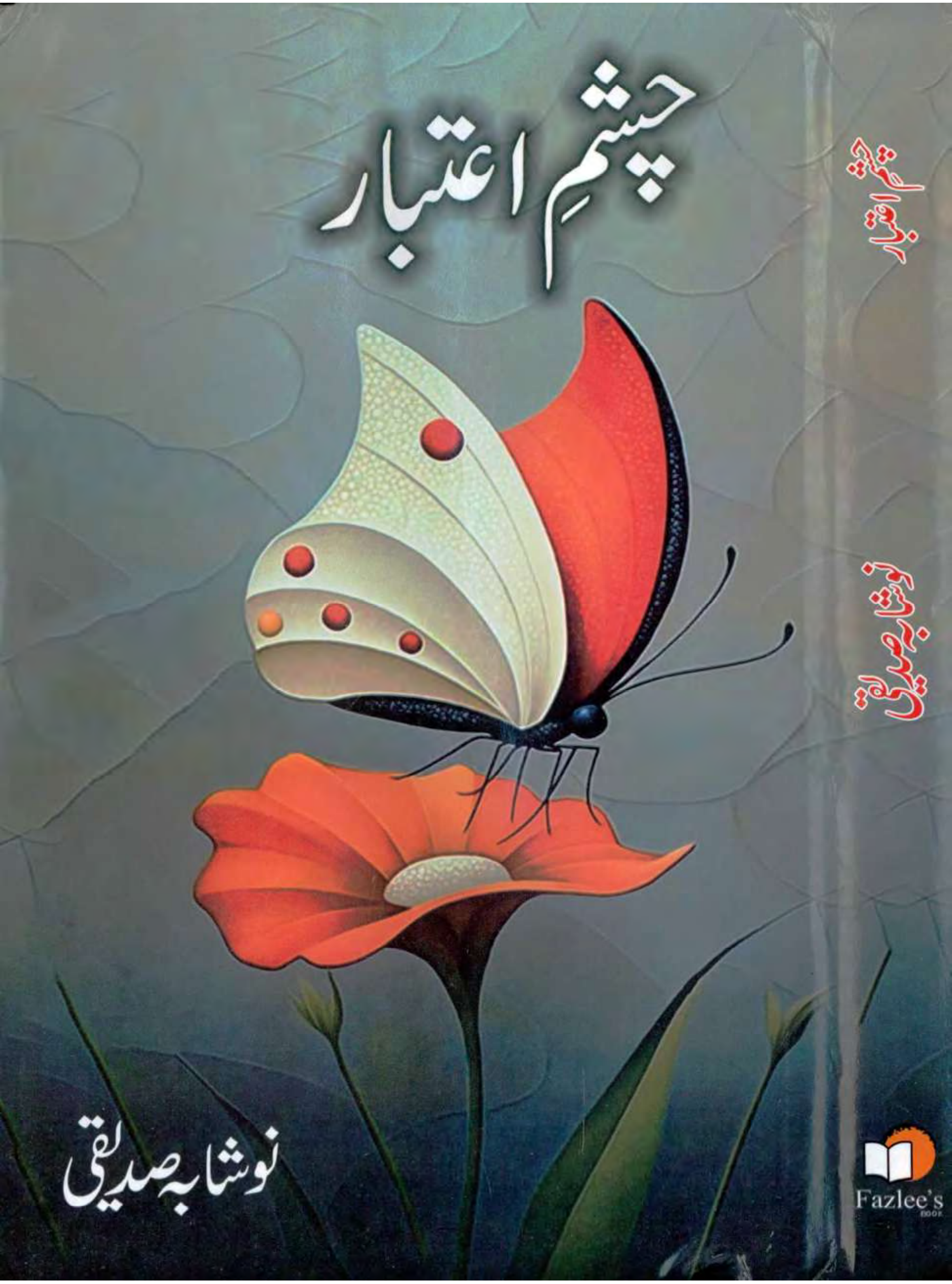

چشمِ اعتبار
نوشابہ صدیقی
چشمِ اعتبار
نوشابہ صدیقی
Fazlee's

نوشابہ جو خاکہ لکھتی ہیں اس میں اپنی یادیں پُروتی چلی جاتی ہیں۔قلم کی بے ساختگی ۔ روز مرہ کے مکالمے ۔ جُزیات نگاری ان کے مضامین میں سب کچھ مل جاتا ہے ۔ ساتھ ہی مصنفہ سے بھی یہیں ملاقات ہو جاتی ہے ۔نوشابہ جتنا برجستہ بولتی ہیں ۔ اتنا ہی برجستہ لکھتی بھی ہیں ۔ کتاب کے بعض خاکے واقعی خاکے ہیں ۔مثلاً جمیل جالبی ۔شفیع عقیل اور خود ان کی اپنی والدہ کا - کتاب رات دو بجے ختم کی ۔ فون کیا تعریف کی جواب ملا" کیوں اپنا وقت خراب کرتی ہیں" اب اس کا فیصلہ تو قارئین کریں ۔

پروفیسر ڈاکٹر نگار سجاد

نوشابہ صدیقی کے قلم نے نثر کو فکری گہرائی، تہذیبی لطافت اور نسائی بصیرت کی دل آویز آمیزش عطا کی ہے ۔سفر نامہ ہو یا ناول ۔ خاکہ ہو یا سوانح ہر صنف میں ان کی تحریر متانت - شائستگی اور فکری دیانت کا نمونہ ہے ۔وہ سادہ اور شفاف اسلوب میں گہرے نکات بیان کرنے کا ہنر رکھتی ہیں ۔

پروفیسر ڈاکٹر سہیل شفیق

میں نے نوشابہ صدیقی کے خاکے ۔ناول مضامین سب پڑھ رکھے ہیں ۔ مجھے ان کا انداز بیان اچھا لگا۔ان کا اظہار خلوص میں گندھا ہوتا ہے۔وہ ممدوحین کے سروں پر نہ تو تقدس کا صافہ باندھنے کی کوشش کرتی ہیں اور نہ ہی عیب جوئی کو اپنا شعار بنایا ہے۔چشم نم سفر نامہ بہت تاثراتی تحریر ہے جسے خشک آنکھوں سے پڑھنا تو کم از کم میرے لیے ممکن نہیں تھا۔فن کی معراج یہ ہے کہ وہ رقّتِ قلب پیدا کر دے ۔سو مجھ پر بھی یہ کیفیت طاری ہوئی۔

ایاز محمود

چشمِ اعتبار

نوشابہ صدیقی

Fazlee
BOOK

ISBN: 978-969-441-353-2
Chashm e Aitebar
(Mazameen)
by: Prof Naushaba Siddiqui

کتاب	:	چشمِ اعتبار
مصنف	:	نوشابہ صدیقی
اشاعت	:	۲۰۲۵
تعداد	:	۳۰۰
صفحات	:	۳۴۴
قیمت	:	/1000 روپے

Published & Distributed by

Fazlee's BOOK

507/3, Temple Road, Urdu Bazar, Karachi

0336 2633887

fazleebook@gmail.com

From Ideas to Pages – Perfect Book Printing, Digitally Crafted!

author contact: ashernoor@gmail.com

☆ جنید شارق ☆

☆ تابش فرحان ☆

☆ یونس جبران ☆

☆ موسیٰ شارق ☆

اپنے بچوں کے ننھے منے بچوں کے نام

جو آج کھلونے کھیلتے ہیں

کل کتابیں پڑھیں گے اور کہانیاں لکھیں گے

یہی تو میری چشمِ اعتبار ہیں

حسنِ ترتیب

دوسرا حصہ: ڈرامے

تیسرا حصہ: میری کتابوں پر تبصرہ

چوتھا حصہ: میرے تبصرے کتابوں پر

☆☆☆

دل کی بات

چشم حیراں اور چشم نم کے بعد چشم اعتبار اب آپ سب کے ہاتھوں میں ہے۔
چشم کی تکرار آپ کو بری نہیں لگے گی کہ چہرے پر قدرت کی دی ہوئی دو آنکھیں ہی تو ہیں جو خواب دیکھتی ہیں۔ اور بقول پیرزادہ قاسم

میں ایسے شخص کو زندوں میں کیا شمار کروں
جو سوچتا بھی نہیں خواب دیکھتا بھی نہیں۔

جیتے جیتے ایک مقام پر آ کر ہم سوچنے بیٹھ جاتے ہیں کہ بس اب آنکھ بند ہونے والی ہے۔ ہم دنیا چھوڑنے والے ہیں۔ زندگی خواہ کتنی ہی تکلیف دہ گزری ہو پھر بھی ہر شخص کو اپنی زندگی پیاری ہوتی ہے۔ اور وہ شخص مزید جینا چاہتا ہے۔ مگر چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ دینے والے نے جتنے دن لکھے ہیں اس میں ایک لمحہ بھی کم زیادہ نہیں ہوسکتا۔

ایسے مقام پر آ کر وہ اپنی زندگی کو سمیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے پہل اپنی کوتاہیوں، اپنی عبادات کا جائزہ لیتا ہے جو ہر شخص کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی سزا اسے دوسری دنیا میں بھگتنا پڑے گی۔ جسے اللہ نے توفیق دی ہوتی ہے وہ عبادت کی طرف لگ جاتا ہے ایسا کرنے والا سمجھدار انسان ہوتا ہے۔ دن اپنے آپ کو نیکیوں میں مشغول رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور راتیں چشم گریہ میں بسر ہوتی ہیں۔

ہاں دنیادار اپنی چیزوں سے دلچسپی کم کر دیتے ہیں اور محبوب چیزوں کو محفوظ کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے والے اپنی کتابوں کے بارے میں سوچتے ہیں کہ جنہیں زندگی بھر جمع کرتے رہے ہیں۔ جنہیں سطر سطر پڑھتے رہے ہیں۔ تکیے کے نیچے اور بستر پر بکھری اور قرینے سے الماریوں میں سجی رہی ہیں انہیں اب سمیٹ کر کسی کتب خانے میں منتقل کر دیں تا کہ دوسروں کا بھلا ہو اور اپنے گھر میں وہ الماریاں بچوں اور بچوں کے بچوں کے کھلونوں اور ان کی اپنی جمع شدہ کتابوں کو جگہ دے سکیں۔

اگر کچھ اپنی ایسی تحریریں ہیں جو چھپی نہیں ہیں انہوں نے کتاب کی شکل نہیں پائی ہے تو انہیں کتاب کا چہرہ دے دیں کہ اگر حروف چھپ گئے تو وہ رہ گئے۔

میرے قلم سے نکلے ٹوٹے پھوٹے الفاظ مجھے بھی اور لوگوں کی طرح عزیز ہیں۔ کچھ اپنے دوستوں کی یاد میں مضمون کا درجہ پا گئے کچھ تحریریں ضرورتاً تقریبات کے موقعے پر جبراً لکھوائی گئیں۔ سو انہیں یکجا کر لیا کہ بکھرے صفحات کی صورت میں میرے بعد وہ گم ہو جائیں گے کہ میں تو انہیں اپنی زندگی سے جوڑ کر رکھنا چاہوں گی کہ کہیں وہ بعد میں شکوہ نہ کریں۔

بہت سی تحریریں شاید میرے پاس نہیں رہنا چاہتی تھیں از خود لاپتہ ہو گئیں مجھے ان کی جدائی کا دکھ ہے۔ بطورِ خاص ان ڈراموں کا جنہیں میں نے اپنے دور کے مشہور ریڈیو پروگراموں کے لیے تحریر کئے۔ بچوں کے لیے۔ طالب علموں کے لیے اور خواتین کے مخصوص پروگرام کے لیے کہ اس زمانے میں ریڈیو کا دور دورہ تھا اور ابھی ہم نے ٹی وی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ مختلف تاریخی دنوں پر بھی ڈرامے لکھے ان کی آواز فضا میں بلند ہوئی اور پھر ہوا بُرد ہو گئی۔

وہ آوازیں مجھے آج بہت یاد آ رہی ہیں لیکن ان کا نصیب اس نومولود بچے جیسا تھا جو دنیا میں تو آتا ہے مگر اپنی پہلی چیخ یا آواز کے بعد دنیا سے چلا جاتا ہے اور ماں باپ کے شجرہ نسب میں نام تک نہیں لکھوا پاتا۔ چشمِ اعتبار میں مضامین کے بعد دوسرا حصہ آپ کو صرف تین ڈراموں کا ملے گا۔ جو اسٹیج ہوئے۔ اپنے کالج میں اپنی طالبات کے لیے لکھے۔ وہ محفوظ رہ گئے اور اب اس کتاب میں جگہ پا گئے ہیں۔

تیسرا حصہ اپنے دوستوں کی ان تحریروں سے متعلق ہیں جو انہوں نے میری کتابیں پڑھ کر مجھے اس لائق جانا کہ میں ان کی تحریروں کا احترام کروں انہیں ضائع نہ جانے دوں اگر چہ میں نے تو انہیں ڈرڈر کر پڑھنے کے لیے دیں اور کبھی نہیں چاہا کہ وہ میری کتابوں پر میری تقریروں پر تبصرہ کریں۔ زبانی کی حد تک گفتگو اچھی بھی لگی اور بغیر جھجک کے ان کی رائے سنتی رہی۔ لیکن قسم لے لیں کہ کبھی کسی سے جو یہ کہا ہو کہ براہ مہربانی اس پر کچھ لکھ دیں بلکہ ڈرتی ہی رہی کہ کہیں وہ لوگ ایسا کر نہ دیں مگر اکثر ایسا ہوا بھی کہ از خود مہربانوں نے مہربانی کی۔ کسی نے ہاتھ میں اچھی تحریر پکڑا دی۔ اور کسی نے بغیر بتائے رسالوں، اخباروں اپنی اپنی کتابوں میں چھاپ دیں۔ مدتوں بعد

میری نظر سے خود ہی گزریں تو اپنے خزانے میں شامل کر لیں۔ میں ان سب کی شکر گزار ہوں
پھر ایسا بھی ہوا کچھ دوستوں کچھ عزیزوں کچھ شاگردوں نے اپنی اپنی تحریر اسی خواہش کے ساتھ دیں کہ میں اپنے قلم سے اپنی رائے اس پر لکھ دوں۔ یہ لمحات میرے آزمائش والے تھے اپنے آپ کو اس کا اہل کبھی بھی نہیں جانا تھا۔ مگر ہوتا کچھ یوں کہ میری تحریر ان کی کتاب کی اشاعت کو روکے رکھتی۔ ایسا میں کیسے ہونے دیتی پھر جو بھی لکھ پاتی لکھ دیتی۔ شکریہ وصول کرتی۔ کتاب حاصل کرتی اور یوں وہ بھی میرے خزانے میں جمع ہو جاتی ایسا بھی ہوا کتابوں کے ڈھیر میں ایسی کئی کتابیں مجھے اس موقع پر ملنے سے رہ گئیں۔ وہ رہ گئیں بقیہ تبصرے چشم اعتبار کے چوتھے حصے میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ

جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے
تب بوجھ اتارا کرتے ہیں

یہ خوشگوار بوجھ اکھٹا کیا تو ضائع ہونے سے بچانے کا جی چاہا بلکہ دکھ بھی ہوا کہ میرا حلقۂ احباب تو بڑے قیمتی لوگوں سے بھرا پڑا تھا ان لوگوں سے جی کڑا کر کے گزارش کر لیتی لکھوا ہی لیتی تو کیا ہی اچھا ہوتا مروتاً وہ لوگ کچھ نہ کچھ لکھ ہی دیتے مگر میرے مزاج میں یہ خانہ خالی تھا خالی ہی رہا اب وقت گزر چکا ہے۔ مزید باقی نہیں جلدی کروں اور ایک کتاب ان ہی کی جمع شدہ تحریروں کو چشم اعتبار کا نام دے کر اس اعتبار کو اپنی ذات کا ساتھی بنا کر چھوڑ جاؤں کہ لفظ چھپ جائیں تو رہ جاتے ہیں اور شیلف میں تھوڑی سی جگہ ہی طلب کرتے ہیں۔

اب اگلا کام آپ کے سپرد ہے جہاں سے بھی آپ کو یہ کتاب ملے اپنے خالی وقتوں میں پڑھیں اور میرے بارے میں جو بھی رائے قائم کرنا چاہیں کر لیں۔ مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ چشم حیراں، چشم نم نے اگر کچھ لوگوں کو متاثر کیا ہے تو میری چشم اعتبار بھی آپ کے اعتبار پر پوری اترے گی۔

میں ہوں نہ ہوں آپ کی مشکور ہوں گی۔

نوشابہ صدیقی
۱۲ جون ۲۰۲۵

پہلا حصّہ

مضامین

مر گئے، کمال کیا...... ہارون رشید

ساٹھ کی دہائی تھی' دن مہینا یاد نہیں۔ شاید اکتوبر رہا ہو یا نومبر' شاید تین نومبر ہو یا تین اکتوبر۔ آخر یہ تین اکتوبر یا تین نومبر کا کیا قصہ ہے' ابھی نہیں بعد میں بتاؤں گی۔

ہمارے قد بس یہی کوئی چار فٹ رہے ہوں گے' بہت سارے لڑکے بہت ساری لڑکیاں جمع تھیں' آرٹس کونسل کی راہداری تھی۔ ہمیں احساس نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے' یہاں کیا ہوتا ہے۔ ہاں ہم کیوں جمع ہیں یہ ہمیں معلوم تھا۔ ہم سب شہر کے بہت بڑے لکھاری تھے۔ روزنامہ امروز میں بچوں کے صفحے کے کہانی کار اور شاعری کرنے والے بھی۔ ہمیں سب ہی جانتے تھے، شہر بھر کے سارے لوگ۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اخبار صرف شہر کراچی ہی نہیں سارے پاکستان میں جاتا ہے اور ہم سے سارا پاکستان واقف ہے۔

قد تو چار فٹ تھا لیکن ہم اپنے آپ کو بہت بلند اور بہت بڑا سمجھتے تھے۔ یہ بات ہمیں اچھے بھیا باور کرا چکے تھے۔ اچھے بھیا بچوں کے صفحے کے نگراں اور مشہور ریڈیو ڈرامے ''حامد میاں کے ہاں'' کے انجم ماموں یعنی افضل صدیقی تھے۔

ہم میں سے کچھ اپنے اپنے مضامین اور شاعری لیے ایک تنقیدی نشست میں شرکت کے لیے آئے تھے، بقیہ حاضرین کی صف میں بیٹھنے کے لیے۔

ہم لکھنا تو جان گئے تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ اپنی تحریر حاضرین کو سنائی بھی جاتی ہے، اور پھر ہماری تحریر کی خوبیاں اور خامیاں بھی بتائی جائیں گی۔ یہ تجربہ بڑا خوش گوار تھا۔ اختتام پر ہم ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ یونس ہمدم' سلمان ہاشمی' رشید شکیب' طاہر نقوی' عرفان عابدی' رضوان صدیقی' ایم الیاس' فصیح چغتائی' بدر بدیع خان' شاہنواز پروین' انور شعور' ہارون رشید' عارفہ شمسہ۔

ہم دلچسپی سے ایک دوسرے کے چہرے کے خدوخال کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رہے تھے۔

تحریریں پڑھتے رہتے تھے‘ اب صورت آشنا بھی ہوگئے۔ یہ وہ نام تھے جو زندگی بھر کے لیے ہمارے حلقۂ احباب میں آ گئے۔

ہاں بڑے ہوکر کسی نے پاسپورٹ بنوا لیے‘ اُڑ کر کسی اور ملک چلے گئے۔ کچھ نے دوسرے شہر میں ٹھکانہ بنایا۔ کچھ نے آسمان پر پرواز کرلی۔ چند جو بچ گئے ابھی تک بچے ہوئے تھے کہ ایک اس میں سے تین نومبر کی تاریخ اپنے نام لکھوا کر شہر ہی نہیں دنیا چھوڑ گئے۔ وہ ہارون رشید تھا۔

ایک دن پوچھنے لگا: سنو، جب میں پہلی بار ملا تھا ''کیسا تھا؟''

میں نے کہا: گورا سا، موٹا سا۔

پوچھو تم کہ تم کیسی تھیں؟

نہیں نہیں‘ میں نہیں پوچھنا چاہتی۔

کیوں، پوچھے جانے سے ڈرتی ہو؟

نہیں‘ ہرگز نہیں۔ بس جاننا نہیں چاہتی۔

میں تو بتاؤں گا‘ بغیر پوچھے بتاؤں گا۔

میں نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ ہونٹ ہلنا بند ہوگئے‘ تب میں نے انگلیاں نکال لیں‘ وہ شرارت سے بولا:

بال پونی ٹیل تھے‘ گھیردار فراک اور ناک چڑھی سی ایک لڑکی۔

میں نے ہوا میں مکا لہرایا اور وہ ہنس پڑا۔ دیر تک ہنستا رہا۔

اب وہ چھ فٹ کا تھا‘ میں پانچ فٹ سے پانچ انچ تک۔

کئی دہائیاں بیت چکی تھیں۔ ہمارا گروپ بدستور موجود تھا۔ وہ تو اب زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ چار فٹ کے بچے اپنی کچی تحریر کو پختہ کر چکے تھے۔ بدر فزکس کا استاد تھا۔ سائنسی ادب سے دل لگا بیٹھا۔ فصیح نے ڈھیر سارے مضامین لکھ ڈالے۔ الیاس نے رسالہ نکالا اور کئی درجن ناول اور کہانیاں لکھ کر شہرت حاصل کی۔ طاہر نقوی نے افسانے اور ڈرامے میں نام کمایا۔ عرفان عابدی نے شادی اور افسانے دونوں میں کامیاب تجربہ کیا۔ انور شعور نے تو کمال ہی کردیا۔ اردو شاعری

میں صفِ اول کا شاعر بن کر اپنا تو اپنا، ہمارا بھی نام روشن کر دیا۔ یونس ہمدم نے فلمی دنیا میں یوں قدم رکھا کہ بے شمار گانے فلموں کو بخش کر ایسا مشہور ہوا کہ ہم سب زور زور سے کہتے ''یہ جو یونس ہے یہ ہمارا بچپن کا ساتھی ہے''۔ شمسہ تو ریڈیو کی تھیں، ریڈیو کی رہیں۔ گود میں بیٹھ کر پہلا پروگرام کیا تھا، گود میں بٹھا کر دوسروں کو بڑا کرتی رہیں۔ ہارون رشید نے اچھا بولنا، اچھا لکھنا اور پڑھنا سیکھا۔ معلوماتی تعلیمی مضامین لکھے اور شہر کی ہر محفل کی جان بن گیا۔ بچپن ختم تھا۔ جاتا جلدی ہے، چھایا عمر بھر رہتا ہے۔ بعد کی کہانی میں ہارون قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ہرا گاؤن پہنا اور آگے پیچھے ایک ساتھ ہرا گاؤن اتارا۔ یہ تمام لمحات چند سالوں پر نہیں مکمل چالیس سال پر محیط تھے۔ یہ گورا سا موٹا سا لڑکا مختلف کالجوں میں ادب پڑھاتا تھا اور الیکشن لڑتا تھا۔ ہم جب آمنے سامنے ہوتے تب ایک دوسرے کی مخالفت کرنا ہم پر فرض ہوجاتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہمیں اس کے خلاف بولنا ضروری تھا۔ میں کچھ بھی کہتی وہ اسے رَد کر دیتا۔ دیکھنے اور سننے والے سمجھتے ہم دو مخالف گروپ کے ایک ایک فرد ہیں۔ ہمارے درمیان نہ جانے کب اور کیسے یہ unwritten معاہدہ تشکیل پا گیا جسے ہم نے ہمیشہ اپنی پکی دوستی کی پختہ مہر مانا۔

ہرے گاؤن کی چالیس سالہ کہانی بس لڑتے جھگڑتے گزر گئی۔ اب وہ تعلیمی موضوع پر تواتر سے مضمون لکھتا، صبح صبح فون آتا:

''میرا مضمون پڑھا؟

کون سا مضمون؟ میں بے خبر بن جاتی۔

جنگ میں، نوجوانوں کے صفحے پر۔

جنگ تو میرے گھر آتا ہی نہیں۔

آتا تو ہے، میں نے خود تمہارے گھر رکھا دیکھا ہے۔

آتا تھا، اب بند کر دیا ہے۔ میں کہتی۔

اچھا اب میں فوٹو کاپی ڈاک سے بھیجتا ہوں۔

ڈاک سے مضمون آجاتا۔

ملا تمہیں؟ وہ پوچھتا۔

نہیں تو۔

ضرور ملا ہے، تم جھوٹ بول رہی ہو۔

پھر موبائل کا رواج ہوا، واٹس ایپ آ گیا۔

پڑھا تم نے؟

نہیں، اتنا باریک مجھ سے نہیں پڑھا جاتا۔

وہ جانتا تھا کہ میں پڑھ چکی ہوں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرے گھر جنگ اخبار آتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میں سب سے پہلے اس کا مضمون پڑھتی ہوں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں کبھی اس کے مضمون کی تعریف نہیں کروں گی۔ مگر ہم دوست تھے، کبھی کبھی پڑھنے کا اقرار بھی کر لیتی، تب اتنی برائیاں کرتی کہ دوسرا کوئی ہوتا تو ہاتھ اٹھانے سے گریز نہ کرتا، مگر وہ مسکراتا رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ بین السطور کچھ اور ہے، یہی کہ میں اس کی دوست ہوں، ہماری دوستی کے معاہدے پر مخالفت کی پکی مہر لگی ہوئی ہے۔

ہماری عمر تیزی سے بڑھ رہی ہے، زندگی گھٹ رہی تھی۔ پھر ہم نے ایک دوسرے سے الگ الگ ملنے کے بجائے ایک ساتھ ملنے اور ملتے رہنے کا پروگرام بنایا۔ شروع شروع میں ساری بیٹھک میرے گھر ہوئیں۔ ہم خوب ہنستے، خوب بولتے، خوب لڑتے اور خوب کھاتے۔ دوبارہ ملنے کی تاریخ طے کرتے اور جدا ہو جاتے۔ وہ کہتا ''چلو ہم شہر میں اپنے جیسا کوئی دوسرا گروپ تلاش کریں کہ جو اتنے بہت سے سال گزر جانے کے بعد بھی دوست ہیں، آج تک ملتے ہیں اور ایک دوسرے سے اتنی گہری محبت کرتے ہیں جتنا کہ ہم کرتے ہیں۔'' اگلی نشست میں سب اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیتے۔ ''نہیں ایسا کوئی گروپ نہیں، ہو بھی نہیں سکتا۔'' اس تحقیق پر سب متفقہ طور پر دستخط کر دیتے۔

ہم ڈائری پر تحریر بھی کرتے۔ ہر بیٹھک پر تبصرہ کرتے۔ دوسری بیٹھک پر وہ سنایا جاتا۔ بدر کی انگلیاں کانپنے لگی تھیں۔ الیاس کے کانوں میں آلہ لگ گیا تھا۔ فصیح کی نماز کا وقت جلد جلد آ جاتا۔ طاہر نقوی سب کچھ بھول بھال چکا تھا۔ انور شعور کے سر پر دوسری صبح قطعہ لکھنا سوار رہتا۔ ہارون مجھ سے قلم اور کاغذ مانگتا رہ جاتا اور مجھے ہارون کی ہر بات سے اختلاف کرنا ضروری تھا اور بیٹھک جاری تھی۔ کبھی کبھی ہم پر دنیا کی بے ثباتی چھا جاتی، ہم اداس گفتگو کرتے ''کب یہ سارے دن گزر جائیں گے، ہم نہ ہوں گے مگر دنیا یوں ہی رہے گی۔'' ایک دوسرے کو ڈانٹ کر چپ کرا دیتے۔

''ایسی ہزاروں بیٹھکیں ابھی باقی ہیں۔ہم زندہ رہیں گے' ہم سب زندہ رہیں گے۔خبر دار جو کسی نے جلدی کی۔'' کسی ایک کی دھمکی پر ہم سب سر جھکا دیتے۔

وہ تین اکتوبر کا دن تھا' بدر نے کہا'' اب کے ہمارے گھر آؤ۔''

ہم سب وقت پر پہنچ گئے۔ ہارون غیر حاضر تھا، اور جب وہ آیا تو ہم سب نے غیر حاضری کے دوران جتنے جملے برسانے کے لیے یاد کر رکھے تھے اُس پر وار دیے۔ میں نے کچھ نہیں کہا' صرف گھونسا دکھایا۔ اس کا غصے سے منہ لال ہو گیا۔ میں جانتی تھی یہ لالی غصے کی نہیں اداکاری کی ہے۔

اب وہ گورا سا موٹا سا لڑکا نہیں تھا۔ داڑھی سرک کر اس کے چہرے پر پھیل چکی تھی۔ وہ اور بھی معتبر بن گیا تھا۔ میری پونی ٹیل کب کی غائب ہو چکی تھی۔' نک چڑھی' تو اس نے چڑانے کے لیے کہا تھا' میں اس وقت بھی نک چڑھی نہیں تھی۔

وہ میرے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ جانے کیوں میرے ذہن میں وہ دن اتر آیا۔ آرٹس کونسل کی اجاڑ سی راہداری' ڈھیر سارے بچے اپنے اپنے ہاتھوں میں اپنی تحریر لیے۔ پھر جیسے میں اپنا مضمون پڑھ رہی ہوں اور دوسرے اس پر تنقید کر رہے ہیں۔

اُس دن اور آج کے دن کے درمیان ساٹھ سال کا عرصہ موجود بھی تھا اور گزر بھی چکا تھا۔ وہ موٹا سا گورا سا لڑکا آج داڑھی والا خوب رو شخص تھا اور میرے خاکوں پر ایک کے بعد ایک کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ''چشمِ حیراں'' تو نہیں تھی لیکن اسے ایک ایک خاکہ از بر تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے میری کسی تحریر پر گفتگو کی تھی۔ وہ تفصیل سے بول رہا تھا اور مجھے یہ غرض نہیں تھی کہ وہ کیا بول رہا ہے، مجھے تو بس وہی دن یاد آ رہا تھا جس دن ہم پہلے پہل صورت آشنا ہوئے تھے۔

شام ہونے کو آئی، ہم سب اٹھ گئے۔ اس تقریب میں یہ قرارداد پیش کی گئی کہ اب ملنے کا دورانیہ کم کر دیا جائے کہ ہماری عمریں بڑھ گئی ہیں اور راہیں بدلنے کے امکانات زیادہ ہو گئے ہیں۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بات تو سچ ہے، ہر کسی کی جسمانی، ذہنی اور فکری صورتِ حال تشویش ناک تھی۔

میں نے کہا صرف ہارون ایسا ہے کہ آئندہ آنے والے پچاس سال تک تو اسے کہیں جانے اور بچھڑ جانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ میں نے یہ بات زیرِ لب کہی تھی لیکن سن سب نے لی' حتیٰ کہ

الیاس نے کان میں لگے آلے کے باوجود بھی۔

لفٹ سے اترتے ہی اس نے فرمائش کر دی مجھے آرٹس کونسل چھوڑ دو۔ وہ اچک کر میری گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اس سے پہلے والی نشست میں اس نے بتایا تھا کہ ڈرائیور کی چھٹی کر دی ہے، گاڑی سے چھٹکارا پالیا ہے اب میں کریم (گاڑی) استعمال کرتا ہوں۔

وہ کیوں؟ میں نے پوچھا بھی تھا۔

میں زندگی کو آسان بنانا چاہتا ہوں۔

پچھلے چند سالوں سے اس نے تقاریب میں جانا شروع کر دیا تھا۔ آرٹس کونسل کی ہر تقریب میں شرکت کرتا' شہر کی ہر ادبی اور علمی تقاریب میں وہ مقرر ہوتا۔ گلدستہ اور ہار اس کے گھر روز جاتے۔ وہ اچھا بولتا تھا، ہر ایک سے دوستی رکھتا تھا، وہ اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ اب جالبی صاحب' عالی صاحب' اسلم فرخی' فرمان فتح پوری تقریب سے رخصت ہو چکے ہیں۔ صدارت کی کرسی اور مقررین سے روسٹرم خالی ہو رہے ہیں۔ خاموشی سے اُس نے اس کمی کو پورا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ فیس بک استعمال کرتا تھا اور اپنی روز روز کی مصروفیات کا اندراج اس پر کر رہا تھا' وہ اس میں کامیاب بھی تھا۔

ایک دن میں نے اس سے کہا: فیس بک کوئی کتاب نہیں ہے اور روسٹرم سے آواز غائب ہو جاتی ہے۔ قلم پکڑو' کچھ لکھو کہ تمہیں لکھنا بھی آتا ہے۔ یوں تم زیادہ جانے جاؤ گے اور تمہیں جانے جانے کا شوق بھی ہے۔

وہ کبھی کبھی میری بات پر توجہ دیتا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ مجھے اپنی کامیابی کا احساس نہ ہونے پائے، مگر اس دن اس نے کہا: تم ٹھیک کہتی ہو' میں اپنے مضامین کو یکجا کروں گا۔ پہلے پہل انہیں کتابی صورت دوں گا، پھر کچھ اور لکھوں گا۔

مجھے آرٹس کونسل چھوڑ دو۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اصرار کیا۔

نہیں تم گھر جاؤ' رات زیادہ ہو گئی ہے۔

نہیں' میں نے وعدہ کیا ہے' مجھے ایک تقریب میں شرکت کرنی ہے۔

وعدہ کرو اب تقریب سے زیادہ تحریر پر توجہ دو گے۔

وعدہ۔ جانے کیوں آج وہ صلح سے گفتگو کر رہا تھا۔

ہم نے گاڑی روکی۔ اب اترو ہمیں گھر جانا ہے۔

نہیں، تم بھی اترو۔ اور اس نے اصرار سے ہمیں بھی اتار لیا۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی، وہ نماز پڑھنے چلا گیا۔ جب لوٹ کر آیا تب ہم دونوں اسی راہداری میں کھڑے تھے جس میں سالوں پہلے ایک دوسرے سے ملے تھے۔ سنو، تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے؟ شاید وہ بھی ان ہی دنوں کو یاد کر رہا تھا مگر ایسا موقع تو اس تمام عرصے میں درجنوں بار آیا تھا۔

ہاں مجھے یاد آ رہا ہے، ہم تم یہیں ملے تھے نا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ کئی لمحے خاموشی سے سرک گئے۔ اس کی آنکھوں میں جانے نمی سی کیوں تھی، یا میں نے ایسا محسوس کیا۔ آج کے دن ہم نے ایک بار بھی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ ہماری گفتگو میں نرمی اور محبت تھی، اختلاف کا دور دور پتا نہیں تھا۔ ہم دونوں کا رویہ یکسر مختلف تھا۔

ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے میرے ہاتھ سے میری کتاب ''چشمِ حیراں'' لی۔ ''آؤ، ہم تصویر کھنچوائیں''۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ یہ سب نارمل نہیں تھا۔ پھر وہ اس ریمپ پر دھیرے دھیرے چڑھنے لگا۔ میں اس راہداری میں کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ مجھے لگا وہ آہستہ آہستہ چل نہیں رہا، اڑ رہا ہے۔ سامنے دیوار نہیں آسمان تھا۔ پھر وہ موڑ مڑا جو اسے منظر اکبر ہال لے جانے کے لیے تھا، مگر وہ تو آسمان پر جا کر گم ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی آنکھیں ملیں، مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا؟ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اب وہ مجھے کبھی نہیں ملے گا، مجھے ایسا کیوں لگا؟

میں دیر تک یوں ہی کھڑی رہی۔ گاڑی میں بیٹھی، وہاں اس کی آواز اب بھی گونج رہی تھی: مجھے جانا ہے۔

نہیں، جاؤ گھر جاؤ۔ رات زیادہ ہو جائے گی واپسی پر۔

تم میں میری اماں اور دادی کی روح سما گئی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں تم کچھ عرصے سے میرا زیادہ خیال رکھنے لگی ہو۔

اترانے کی ضرورت نہیں' ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

میں گھر آ گئی۔ یہ معمول کی بات تھی، کتنی ہی بار ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا تھا۔ اب کیا ہورہا ہے؟ اس سوال نے مجھے دیر تک سونے نہیں دیا۔

رات بارہ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ پہلے تو کبھی رات کی گھنٹی پر چونک جایا کرتے تھے، مگر اب امریکہ، کینیڈا جیسے ممالک سے رات ہی میں کال آتی ہے کہ وہاں دن ہوتا ہے۔

میں نے فون اٹھالیا۔ ہارون کی آواز آئی:

مجھے معلوم تھا تم جاگ رہی ہوگی۔ میرا خیال کرتی ہونا؟ میرے بارے میں سوچ رہی تھیں نا۔

جی نہیں، میں تو سوگئی تھی، خوامخواہ اٹھادیا۔ بولو اتنی رات گئے کیا بات ہے؟

میں گھر پہنچ گیا ہوں۔ چپ چاپ سوجاؤ لڑکی۔

وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔

صبح نثار نے کل کی بیٹھک پر تبصرہ شروع کردیا:

مجھے تم لوگوں کی دوستی پر رشک آتا ہے' دوست تو میرے بھی ہیں مگر تم لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے بعد مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو بس ملنے جلنے والے ہیں۔ ان کی گفتگو میں احتیاط کا عنصر ہوتا ہے' وہ نپے تلے جملے بولتے ہیں، ایک دوسرے کا لحاظ کرتے ہوئے الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں۔

اب میرے سامنے واقعی اپنے ان دوستوں کی دوستی سب سے مختلف نظر آئی۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کے لیے ادا کرنے سے پہلے جملے نہیں سوچے۔ کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے کبھی خفا بھی ہوسکتا ہے۔ میرے اندر اطمینان کی ایک ٹھنڈی سی، میٹھی سی لہر دوڑ گئی۔

اگلے دن واٹس ایپ پر ہارون کا میسیج تھا، ہمیشہ چھوٹا سا کوئی ایک جملہ ہوتا مجھے خفا کرنے کے لیے۔ کبھی کوئی ایک شعر منانے کے لیے۔

اس بار بھی ایک شعر تھا ؎

کس قدر ساتھ جی لیے ہم تم
کیا بُرا ہے جو اب جئیں تنہا

مجھے یہ شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بہت برا محسوس ہوا اور وزن سے گرا ہوا بھی۔ جواب دیا ''شعر وزن میں نہیں ہے۔''

آخر اس نے ایسا کیوں سوچا؟ میں دیر تک شعر پڑھتی رہی اور سوچتی رہی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا ''میں زندگی کو آسان بنا رہا ہوں۔ بہت کچھ سمیٹ رہا ہوں۔'' کبھی اس نے یہ بھی کہا تھا ''وقت کم ہے۔''

یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔ دو رات پہلے والا وہ احساس مجھ پر پھر طاری ہوا' وہ اوپر اٹھ رہا ہے۔ آسمان کی طرف جا رہا ہے' وہ چھپ گیا' اب نظر نہیں آ رہا ہے' اس لمحے مجھے اس پر سخت غصہ آیا وہ مجھے اذیت کیوں دے رہا ہے؟

میں نے انتقاماً ایک شعر اسے لکھ بھیجا ؎

کتنی دلکش ہو تم کتنا دل جو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

تمہارہ جانے اور مر جانے پر یہ دونوں اشعار ہم پر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہو رہے تھے کہ 9 اکتوبر کو صرف 6 دن بعد وہ اسپتال میں تھا۔ یہ خبر نہیں دھماکہ تھا۔ ایسے کیسے ممکن ہے! ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے خود اپنا یہ جملہ یوں سنائی دے رہا تھا کہ جیسے میں ابھی بھی یہی بول رہی ہوں ''اگلے پچاس سال تک تو ہارون کہیں نہیں جا رہا۔''

میں نے سر جھٹکا۔ یہ کیسا خیال آیا مجھے۔ وہ اسپتال میں ہے' شاید کوئی تکلیف ہو' معمولی سی۔ میں نے دل کو بھی سمجھایا۔

مگر اسپتال کی ایک ایک سیڑھی چڑھتے ہوئے اس تک پہنچنے سے بھی خوف زدہ تھی۔

کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی اسی خوب صورت سی مسکراہٹ نے استقبال کیا۔ پاس گئی' بولنے کی کوشش کی۔ کیا کہا' کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سیدھی جانب کے سب اعضاء ساکت تھے۔ ہونٹ بھی' پاؤں بھی' ہاتھ بھی' وہ انگلیاں بھی جن سے وہ لکھا کرتا تھا۔ وہ ہونٹ بھی جن سے بولا کرتا۔ وہ پاؤں بھی جن سے چلا کرتا۔ سب اعضاء نے جیتے جی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا' وہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔

میری آنکھوں میں لبالب آنسو بھرے ہوئے تھے' کوئی بھی ایسا جملہ میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا جو میں اس کے خلاف بول کر اپنی دوستی نبھاؤں۔ وہ بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا' فتح مندی کے ساتھ کہ آج میں ہار رہی تھی اور وہ جیت رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس کے خلاف کچھ بول کر اسے شکست دے دوں کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات نے میری شکست کو اور بھی واضح کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی دکھ کے آثار تھے مگر اس نے ہمت سے کام لیا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ہار جاؤں۔ اپنے بائیں ہاتھ سے میرے دائیں ہاتھ کی کلائی زور سے پکڑ لی۔ اپنے سیدھے بے سدھ ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ اس لمحے کا کرب بیان کرنے کے لیے ہم دونوں کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس نے کئی بار اپنی پلکیں جھپکی تھیں اور میں نے مکمل طور پر اپنی دونوں آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اسپتال سے رخصت ہوتے وقت میں اپنے آپ کو خود دلاسہ دے رہی تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میرا دلاسہ فریب تھا۔ اُس نے اگلے مہینے کی تین تاریخ کا انتخاب کر رکھا تھا۔

ہم سب دوست تین نومبر تک مستقل فون پر تھے۔ اب ہم جلدی جلدی ملا کریں گے۔ یہ جملہ ہماری آخری رخصت کی قرارداد تھی جس پر ہم سب نے تائیدی دستخط کیے تھے۔ ایک دوسرے کو یاد کرا رہے تھے۔ بس ہارون اگلے پچاس سال تک تو کہیں نہیں جاتا' یہ جملہ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ ہم سب اپنے پاؤں پر کھڑے تھے اور ہارون سفید لباس پہنے چار غم زدہ لوگوں کے کندھے پر سوار مسجد کی جانب جا رہا تھا۔ میں نے اسے ایسے ہی جاتے دیکھا جیسے مغرب کی نماز پڑھنے تین اکتوبر کو آرٹس کونسل کی مسجد میں جاتے دیکھا تھا۔ جس کے بعد وہ آسمان کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ میں نے اس دن ہی سے اس کی رخصت کا خوف اپنے دل میں بٹھا رکھا تھا۔

اس رات واٹس ایپ پر میں نے اسے ایک شعر لکھ بھیجا، یہ جانتے اور مانتے ہوئے کہ وہ اپنا موبائل ساتھ لے کر نہیں گیا ہے ؎

بسترِ مرگ پر تھی اک دنیا
اور تم مر گئے کمال کیا

☆☆☆

سب کے انیس......انیس زیدی

حاضرینِ کرام!

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے مقدر میں اس کے حصے کی آزمائش لکھ رکھی ہے۔ میرے لیے آج کی آزمائش یہ ہے کہ مجھے انیس زیدی کے بارے میں کچھ بولنا ہے۔ اس انیس زیدی کے بارے میں جس سے ہر لمحے میری تکرار رہتی ہے اور رہتی رہی ہے۔

سچ بولنا آسان ہوتا ہے، جھوٹ بولنا اس لیے مشکل ہوتا ہے کہ اس میں احتیاط برتنی پڑتی ہے، اسی لیے میں چند جھوٹ تحریر کر کے ساتھ لائی ہوں۔

میں نے طے کیا ہے کہ آج جھوٹ بولوں گی اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں بولوں گی۔

انیس زیدی کو میں نے خبردار بھی کیا تھا کہ اتنے بہادر نہ بنو کہ مقررین کی فہرست میں میرا نام لکھواؤ۔ جانتے ہو کہ تمہارے بارے میں میرے خیالات اچھے نہیں۔ ہم پچھلے سو برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک لمحے کو بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں ہوئے ہیں۔

مگر ایک جان لیوا حقیقت ہے کہ ہم پھر بھی دوست کہلاتے ہیں۔

یہ دوست بنتے کیسے ہیں؟ بس یہ خدا کا دیا ہوا انمول تحفہ ہوتے ہیں جو زیادہ تر ہمیں ہماری درس گاہوں سے ملتے ہیں۔

انیس زیدی بھی مجھے کراچی یونیورسٹی سے ملے۔ ہم دونوں دو مختلف شعبوں، دو مختلف مضامین پڑھتے ہوئے ایک دوسرے کو زیادہ وقت تو نہیں دے سکے تھے لیکن جب وہاں سے نکلے تب دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی فیصلہ کیا، وہ یہ کہ ہرا گاؤن پہن لیا جائے۔ ہمیں انیس زیدی کی پہلی شناخت ان کے الیکشن لڑنے لڑانے اور اس میں جان کی بازی لگا دینے سے ہوئی۔ ہم آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک امیدوار کی ہم موافقت کرتے تو انیس زیدی جھٹ اس کی مخالفت کرتے۔ برسوں یہ سلسلہ چلتا رہا، وہ خود بھی امیدوار بنتے رہے۔ جیت جاتے تو چہرے پر خوشی

کے کوئی خاص آ ثار نہیں پائے جاتے۔ ہار جاتے تب بھی چہرہ سپاٹ رہتا۔ وہ خوب صورت دور تھا، جہاں مخالفت دشمنی نہیں اختلاف کا نام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دو طرف رہنے کے باوجود بھی دوست بنے رہے۔ محسوس ہوا کہ ہم تو ایک دوسرے کو دکھ دے ہی نہیں سکتے۔ ہم تو ہمیشہ ایک دوسرے کے حق میں ہیں۔ ہم بحث کرتے ہیں، متفق نہیں ہوتے۔ بات جہاں چھوڑتے ہیں دوسرے دن وہیں سے پھر شروع کر دیتے ہیں۔ دوست اپنے ہی ہوتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ وفا کرتے ہیں۔ دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بدعہدی نہیں کرتے، دوستی کی یہی پہچان ہے۔ سامنے لڑتے ہیں، غیر موجودگی میں بڑے بڑوں سے الجھ جاتے ہیں۔ دوست اسی کو کہتے ہیں۔

جب انیس زیدی کی شخصیت کی چیر پھاڑ کی، تب پتا چلا کہ وہ دوستوں کے دوست ہیں، ان کے گرد لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے، وہ جس کے بھی ہوجاتے ہیں اُس سے آسمان بھی دشمنی کرتے ہوئے کتراتا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ محبتیں بانٹنے کا ہنر جانتے ہیں بلکہ ان میں تو دولتِ ہنر ہی چھپی ہوئی ہے۔

وہ دریا دل ہیں۔ خوب خرچ کرتے ہیں، اپنے پر نہیں دوسروں پر۔ ان کی جیب میں تحفہ ہے، محبت ہے، مدد ہے اور وقت ہے۔

انیس کی شخصیت میں ایک اچھا سا انسان چھپا ہوا ہے جو شائستہ بھی ہے، ہنس مکھ بھی ہے، خوش پوش ہے، خوش اوقات ہے، خوش گفتار ہے کہ اس سے جب ملیں، ملنا اچھا اور نہ ملنا برا لگتا ہے۔

برجستہ گفتگو کرتے ہیں، جس محفل میں بیٹھ گئے وہ بزم، بزمِ بہاراں بن گئی۔ صبح سے شام تک لطیفے گھڑتے نہیں تھکتے۔ جتنا چاہیے جھوٹ بلوا لیجیے، چٹکلوں کی صورت میں سناتے رہیں گے۔ درودیوار پر ذرا ترس نہیں کھاتے۔ سب سے زوردار قہقہے خود ان کے اپنے ہوتے ہیں۔

کتابیں پڑھنے اور ان میں نئے نئے زاویے تلاش کرنے کا وائرس ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے، بلکہ وہ کتابیں پڑھتے نہیں اپنے اندر اتار لیا کرتے ہیں۔

حافظہ بلا کا ہے، جو پڑھتے ہیں اس کا بیشتر حصہ اپنے ذہن کے نہاں خانے میں گھر کرلیا کرتے ہیں۔

مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ پتا نہیں چلنے دیتے کہ کون سا میدان ان کا اپنا ہے۔ ادب پڑھیں تو ادب کے افلاطون نظر آتے ہیں۔ نفسیات کی بات ہو تو نفسیاتی باریکیوں کو بیان کرتے ہیں۔ جغرافیہ ہو تو میدان، سمندر، ہوا، موسم بلکہ ساری دنیا ان کی غلام بن جاتی ہے۔ تاریخ ہو تو جانے کتنی صدیوں کو جھاڑ پلا دیتے ہیں۔ سیاست پر منہ نہ کھلوایئے تو بہتر ہے۔

شاعری ہو، نثر ہو، ادب کوئی سی صنف ہو، کوئی سی کتاب ہو، کوئی سا مصنف ہو، انگریزی زبان کا ہو یا اردو زبان کا......تعارف رکھتے ہیں۔ کم بھی جانتے ہوں، نہ بھی جانتے ہوں تو سامنے والے کی کم علمی سے فائدہ اٹھا کر زیادہ بتانے کا ہنر ان میں خوب ہے۔

گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ دوسروں کو بولنے کا موقع دینا ان کی طبیعت سے لگا نہیں کھاتا۔ پتا نہیں سوتے میں بھی چپ ہوتے ہیں یا نہیں، یہ میں نہیں جانتی، لیکن سوتے میں بولنے والوں میں ان کا شامل نہ ہونا حیران کن ہوگا۔

کسی موضوع پر کب بولنا ہے اور کتنا بولنا ہے، ضروری نہیں کہ اس پر وہ سوچیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بے چارہ شاعر اپنا کلام سنانا چاہتا ہے تب اُس کے ایک شعر کے بدلے وہ اُس کی غزل کے تمام شعر خود سنانے لگ جاتے ہیں، وہ صرف منہ دیکھنے کا کام کرتا ہے۔

کسی کی بھی مدد کرنے کا جنون ان پر طاری رہتا ہے۔ ایک ایک کے پاس جا کر ہزاروں روپے جمع کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں انہیں مانگنے میں عار نہیں، ان کا کہنا ہے ''پوٹلی تو ضرورت مند کو ہی ملتی ہے نا۔''

کھانے میں سبزیاں پسند ہیں۔ بس یہی میری شامت ہے کہ جس دن انہیں کہیں اور سے کھانا نہیں ملتا میرے گھر کی گھنٹی بجتی ہے۔ ناشکرے اتنے کہ ہزاروں بار ضرورت مند سمجھ کر کھلائے ہوئے کھانوں کے جواب میں تعریف اور شکریے کا ایک بول بھی کبھی نصیب نہیں ہوا۔ صرف یہ جملہ سننے کو ملا ''کس قدر بدمزہ پکاتی ہو تم، جمعرات کا گھر آیا کھانا جمعہ کو مجھے کھلا دیتی ہو۔''

میں نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ وہ خوش پوش ہیں مگر بے حد بدسلیقہ ہیں۔ گھر جا کر دیکھیں، الماری کے بجائے بیڈ پر درجنوں قمیضیں، درجنوں پینٹ اور ہزاروں ٹائیاں ایک دوسرے میں گتھم گتھا ملیں گی۔ ٹائیوں کی تعداد ہزاروں بتائی ہے، اس میں مبالغہ ہرگز نہیں کہ ٹائیاں ان کی کمزوری ہے۔

انیس کہتے ہیں کہ وہ اپنے دوستوں کو تحفے میں ٹائی ہی دیتے ہیں۔ایک بار انہوں نے مجھے بھی اکٹھا چار ٹائیاں دی تھیں جنہیں میں نے خوش دلی سے قبول کرلیا تھا۔ٹائی جان کرنہیں، دوستی کا تحفہ سمجھ کر۔

انیس کبھی مجھ سے چھوٹے بن جاتے ہیں،تب مجھے باجی اور آپا کہہ کرمخاطب کرتے ہیں،اور کبھی بڑے بن کر بچے اور بیٹے پکارنے لگتے ہیں۔وہ بڑے بن کر بھی اچھے لگتے ہیں اور چھوٹے بن کر بھی برے نہیں لگتے۔ہم جب بھی ملتے ہیں اور جلدی ملتے ہیں، بہت لڑتے ہیں، جی بھر کر لڑتے ہیں۔ہم کبھی ایک شخص، ایک بات، ایک سوچ پر متفق نہیں ہوتے لیکن ہاں اس ایک بات پر متفق ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی دکھ نہیں دے سکتے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے لیے ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں گے۔

ہم گزرے سو برس سے ایک دوسرے کے دوست ہیں اور آنے والے سو برسوں تک دوست رہیں گے۔یہ ہمارا سچا اور پکا عزم ہے،اس میں جھوٹ کی ذرہ بھر بھی آمیزش نہیں۔

حاضرین کرام!

میں نے شروع ہی میں آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ سے سراسر جھوٹ بولوں گی اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں بولوں گی۔

میرے اس سارے جھوٹ کا لب لباب یہ ہے کہ اب میں خود انیس زیدی سے مخاطب ہوجاؤں:

انیس زیدی تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے دوست تمہیں چاہتے ہیں۔تمہارے لیے انہوں نے دعائیں مانگی ہیں۔یہ خوب صورت محفل سجائی ہے۔بہت سارے سچے دوستوں کو بلایا ہے۔کچھ بولنے والے تمہارے بارے میں سچ بولیں گے...... مجھے حیرانی نہیں ہوگی۔بس اس سچ کو اپنے دل میں چھپا کر رکھ لینا کہ یہ تمہارے لیے تحفے سے کم نہیں اور جینے کے لیے ضروری ہے۔میری طرف سے بھی دعائیں، اور اپنی صحت کا خود خیال رکھنا کہ اب تم بڑے ہوگئے ہو۔میرا جھوٹ ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے۔تم جیو ہزاروں سال...... یہ میرا تم سے آخری سچ ہے، کھرا سچ۔

☆☆☆

ہمدمِ دیرینہ ...... یونس ہمدم

ہر انسان تین زمانوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک زندگی تو زمانۂ حاضر یا لمحۂ موجود کی ہے۔ باقی دو زندگیاں پچھلے اور اگلے زمانوں کی ہیں۔ ہم سانس تو موجودہ عہد ہی میں لیتے ہیں مگر دل و دماغ پر گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ چھایا رہتا ہے۔ یہ ہر انسان کا یکساں معاملہ ہے۔

گزرے زمانے میں ہمارے بہترین اور بدترین دن ہوتے ہیں۔ ہمارے مخلص دوست ہوتے ہیں جو ہماری زندگیوں سے جڑ جاتے ہیں۔ جن کی یاد اور صحبت کے بغیر زندگی بے معنی ہوتی ہے۔ ہم ان دنوں کو اپنی زندگیوں سے خارج کبھی کر ہی نہیں سکتے۔

یونس ہمدم گزرے دنوں کے وہ ساتھی ہیں جو بچپن میں ہمیں مل گئے تھے۔ ہم نے ان کا انتخاب خود نہیں کیا تھا، مگر اُن دنوں کے لمحۂ موجود نے ہماری کسی نیکی کے بدلے از خود ہمارے حصے میں لکھ دیا تھا۔

یونس بچپن کے قلم کا کچا کچا سا ساتھی تھا، بعد کی زندگیوں میں پکا بن کر ساتھ ساتھ۔ اور ہم دونوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ''وقت کی چھلنی'' ہماری چھان پھٹک کر ہی نہیں سکتی۔

گزشتہ صدی کے چالیس برس اور پھر صدی بدل جانے کے بعد کے بائیس برس ہماری زندگی کا وہ حصہ ہیں جو ایک دوسرے کو یاد کرتے، محبت کرتے، باتیں کرتے، ملتے جلتے، لکھتے پڑھتے، دور نزدیک رہتے بستے گزرے۔ اچھے گزرے اور یقین ہو گیا کہ آنے والے وہ تمام دن جو ہماری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھ دیے گئے ہیں۔ گزرے اور گزرتے دنوں کو ملا جلا کر زندگی کو مکمل کر دیں گے خوبی اور خوب صورتی کے ساتھ۔

میں نے یونس ہمدم کی ہر ہر تحریر پڑھی۔ فلمی ہو غیر فلمی ہو، نثر ہو، شاعری ہو اور اب نئی تازہ شاعری ''ریزہ ریزہ شبنم'' ہو۔

اس بات پر مگر حیرت ہے کہ جب یونس کو یہ معلوم ہے کہ میں اس کی تحریر کو کس نظر سے دیکھتی

ہوں تو اسے یہ ضرورت کیوں آ پڑی کہ میں روسٹرم پر آ کر بھی اقرار کروں!

چلیے آج یونس کے بارے میں روسٹرم پر بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ یونس ہمدم خوش باش، زندہ دل، دبلے پتلے قیمتی انسان ہیں۔ اخلاق میں بے حد وزنی، مروت میں رچے بسے۔ ان کے مزاج میں اپنائیت، خلوص اور والہانہ پن ہے، اسی لیے ان سے ملنا اچھا لگتا ہے۔ یونس کو ہم نے نہ کبھی پریشان دیکھا نہ کبھی ضرورت سے زیادہ خوش۔ یوں کہیے کہ ابنارمل حد تک نارمل ہیں۔ ذہن کی چوکسی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا۔ سن و سال اور بدلی ہوئی صدی نے بھی انہیں اندر سے بوڑھا نہیں کیا۔ ان کا اندازِ گفتگو ان کی مجموعی شخصیت کی طرح برجستہ، بے تکلف اور تصنع سے پاک ہے۔ سچ پوچھیں تو دشمن ان سے مل کر اپنی دشمنی بھول جائے۔ جس طرح کچھ لوگوں کو ٹکٹیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے اسی طرح یونس کی ''ہابی'' محبتیں جمع کرنا ہے۔

یونس قلم کا استعمال کریں تو غزل اور گیت کے شہزادے ہیں۔ فلمی شاعری سے بچ کر ان کے شعری مجموعے کی طرف آتے ہیں جس میں دو عدد حمد، ایک نعت، باقی حصہ متفرقات سے مزین ہے۔

یونس اپنی بات اور سوچ کو نہایت دھیمے، ملائم اور نرم لہجے میں کہتے ہیں، اسی لیے قاری اسے دل و جان سے قبول کر لیتا ہے۔

ہاں عشق کو عزیز ہے دیوانگی بہت
رشتہ بنائے رکھا ہے یوں وحشتوں کے ساتھ

ان کا یہی پیرایہ، یہی اسلوب ان کو فاتح القلوب بناتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ مجموعہ ایک ایسا گلدستہ ہے جس سے مختلف صنائع و محاسنِ کلام کی مہک پھوٹ رہی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

صنعتِ تلمیح:

اک حسرتِ نادیدہ اک خواہش افسردہ
جنت سے نکلنے کا اک صدمہ یہ دنیا ہے

صنعتِ تضاد:

ترے دہلیز پہ دل رکھ کے چلے آئے تھے
وہ ترے دل میں دھڑکتا ہے کرامات تو دیکھو

''کرامات تو دیکھو'' ہپناٹائز کردیتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے پانچ سال کا بچہ اپنی انگلی ٹیڑھی کر کے ماں سے پوچھے ''ایسا کوئی کرسکتا ہے!'' اور داد کا طالب ہو۔

دن گزرتے رہے، عمر گھٹتی رہی۔ ''سودا گھاٹے کا تھا پھر بھی کھاتے رہے''۔ وارداتِ قلبی دیکھیے:

عشق کی راہ سے الجھ بیٹھے
دشت سے کوئی آگہی بھی
اس کا سایہ گزرتے دیکھا تھا
خالی کمرے میں بھی ہنسی سی ہے

صنائع لفظی و معنوی کے حامل مندرجہ بالا اشعار سے ان کی قادرالکلامی ثابت ہوتی ہے۔

ہر شاعر کا احساس بروقت جاگتا رہتا ہے۔ وہ عصری اور خارجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سنیے یہ اشعار:

کیا ہو گا ایسے دکھ سے بڑا اور کوئی دکھ
اپنا ہی کوئی اپنوں کو نظروں سے گرا دے
ماضی سدا عذاب بنا رہتا ہے ہمدمؔ
ایسا کبھی ہوا ہے کوئی ماضی کو بھلا دے

فراقؔ نے کہا تھا:

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

یونس نے کہا ہے:

عاشقی کا اب یہی دستور ہے
غم ملے تو مسکرانا چاہیے

یونس کی شخصیت جن خصوصیات سے مل کر بنی ہے وہی خصوصیات اس کی شاعری میں جھلکتی ہیں۔ نیازمندی، خاکساری اور انکساری دیکھیے اس کے اشعار میں کیسے آئی ہے:

محلوں میں رہو یا کٹیا میں
کل مٹی مٹی ہونا ہے
سب کچھ رہ جائے گا دنیا میں
پھر خاک ہی سب کا بچھونا ہے

یونس خاموش بیٹھا ہو تو آپ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں، جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سوتے میں بھی اور اکیلے میں بھی بولتا رہتا ہے۔

لیکن جب وہ گفتگو کر رہا ہو یا اپنی غزل کے اشعار سنا رہا ہو تو آپ اسے قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ شعر کہتے وقت اسے سوچنا نہیں پڑتا بلکہ سوچ کے دھارے کو روکنا پڑتا ہے کہ کہیں حالتِ جذب میں وہ کچھ نہ کہہ دے جو وہ کہنا نہیں چاہتا۔

انگریزی میں ایک کہاوت ہے: "Lightly Loaded Walk faster."
دیکھیے یونس نے اسے کیسے بیان کیا ہے:

سفر پر آئے ہو سامان مختصر رکھو
یہ کیا کہ دنیا کو منزل سمجھ لیا تم نے

''یہ کیا'' میں جو حیرت و جستجو چھپی ہے وہ شعر کا درجہ بڑھا دیتی ہے۔
یادیں ہمیشہ دائمی مرض کی صورت ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ نظم ''بیٹھک'' کا مطالعہ کریں۔

دوستوں کی بیٹھک ہو اور چائے چینک ہو
قصے کچھ پرانے ہوں یادوں کے خزانے ہوں
بیتے پل ہوں آنکھوں میں ان کی خوشبو سانسوں میں
چاندنی ہو چاہت کی ہو فضا محبت کی
گرم گرم بتیاں ہوں مست مست رہتا ہوں
کوئی پھر سے لوٹا دے وہ ہمیں لمحے لا دے

صحنِ دل میں بکھرا دے وہ فضائیں چاہت کی
وہ ہوائیں راحت کی
عمر اب زیاں سی ہے زندگی دھواں سی ہے
وقت کا سفر مانگے دل گداز وہ کاندھے
تھک کے چُور بیٹھے ہیں سب سے دور بیٹھے ہیں

یہ اشعار اپنی گہرائی میں ایک نوحہ ہیں۔ تہذیبی انتشار کا المیہ ہیں۔ اسلوب سادہ ہے۔ جو کہنا چاہا کوئی اہتمام نہیں بس کہہ دیا۔

میرؔ کا یہ شعر آپ سب کو یاد ہے:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
گویا آگے چلیں گے دم لے کر

یونس اسی خیال کو لے کر یوں کہتے ہیں:

موت کی راہ سے جائیں گے اس طرف
جس طرف منتظر ہے نئی زندگی

وزیر آغا نے بھی تو کہا تھا:

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اتار کے

یونس شعر میں کہانی کہتے ہیں، مثلاً:

بیٹھے ہوئے کسی دریا کے کنارے ہم تم
دیکھتے رہتے بس اک دوسرے کو گُم صُم
مسکراتا تری آنکھوں کا میں کاجل ہوتا

لفظوں کو متحرک آوازوں اور سُروں کا روپ دینا ''ریزہ ریزہ شبنم شبنم'' کی غزلوں کا وصفِ خاص ہے۔

پھول اُس نے لگایا ہے بالوں میں
کِھل گئے پھول پھر خیالوں میں
ہم نے مانگا تھا اک جواب ہمدمؔ
وہ الجھتے گئے سوالوں میں

یہ لفظی تصویریں یقیناً یونس کی غزل کی پہچان ہیں۔ یونس نے ان اشعار میں افسانوی لمس پیدا کر کے انہیں زیادہ اثر انگیز اور دل کش بنا دیا ہے۔ مجھے کہنے دیں وہ جملہ باز نہیں جملہ ساز ہیں۔

حاضرین کرام! آپ میں سے بہت سے لوگوں کے لیے یونس ایک شاعر ہے۔ بہت سے لوگ اسے ایک اچھا اور نیک انسان سمجھتے ہیں۔ کچھ کا وہ نیا نیا دوست ہے۔ کچھ بس یوں ہی ادبی نشست میں اسے سننے آ بیٹھے ہیں، مگر مجھے کہنے دیجیے کہ یونس میرے لیے خدا کی طرف سے دیا گیا ایک انعام ہے۔

میرے بچپن میں ملا ہوا ایک تحفہ ہے جس سے مل کر خوشی ہوتی ہے، جس سے دور رہ کر کمی محسوس ہوتی ہے، جس سے باتیں کر کے مزا آتا ہے، جسے پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔

اگر آپ کے پاس پوری زندگی کے ہر رنگ میں رچا بسا کوئی دوست موجود ہے تو جان لیجیے کہ وہ یونس ہمدم ہے۔

اجازت ہو تو میں اب شاعر یونس ہمدم سے کچھ بات کرلوں۔

یونس اب کی بار پاکستان سے جاؤ تو کچھ ایسا لکھنا کہ جب واپس پاکستان آؤ تو ہم پڑھ کر کہہ سکیں یہ شاعری ''ریزہ ریزہ شبنم شبنم'' سے بھی بہت آگے چلی گئی ہے۔

زندگی رہی تو اسی روسٹرم پر ہم تمہارے نئے مجموعے کے منتظر ہوں گے۔ ان شاءاللہ۔

☆☆☆

ڈور دیس کی دوست...... سیما صغیر

کراچی آرٹس کونسل میں گذشتہ پندرہ سالوں سے عالمی اردو کانفرنس کا ہر سال کے آخر میں انعقاد ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے شاعر ادیب آتے ہیں۔ یہ کانفرنس شہر کراچی کا ایک ادبی میلہ سا بن جاتا ہے۔ آرٹس کونسل کی وسیع عمارت شہر کراچی کی علمی ادبی شخصیتوں سے بھر جاتی ہے۔ چار روزہ یہ میلہ ختم ہونے کے بعد سے ہی اگلے سال کی کانفرنس کا انتظار شروع ہوجاتا ہے۔ غالباً چوتھا یا پانچواں سال تھا، ہندوستان سے محترم ارتضیٰ کریم صاحب مدعو تھے۔ ان ہی دنوں میں نے اپنے مرحوم والد کا کلام مرتب کر کے چھاپا تھا۔

والد صاحب کا تعلق علی گڑھ سے تھا اور آج تک منٹوای میں ہی قیام ہے۔

میں سرکاری ملازمت کی وجہ سے باوجود دلی خواہش کے کبھی ہندوستان نہیں جا سکی۔ چاہتی تھی کہ جاؤں اور ''افکارِ حسن'' شعبہ اردو اور یونیورسٹی لائبریری میں رکھ دوں۔ اردو کانفرنس میں ارتضیٰ کریم سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں راستے میں روک لیا۔ کتاب ان کے سامنے کی اور مخاطب ہوئی:

''میرے والد کا کلام ہے، آپ واپس ہندوستان جائیں تو اسے مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھوا دیں۔ اگر ایسا نہ کرسکیں تو دہلی ایئرپورٹ پر اترتے ہی اسے کہیں پر بھی رکھ دیں، یا علی گڑھ جائیں تو اسٹیشن پر ہی کہیں ڈال دیں۔ بس میں چاہتی ہوں یہ میرے والد کے دیس پہنچ جائے۔ کیا آپ کے سامان میں اتنی گنجایش ہے؟''

ارتضیٰ کریم نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، یقیناً وہ یہ یقین کرنا چاہ رہے تھے کہ میں صحیح الدماغ ہوں یا نہیں۔

انہوں نے میرے بارے میں کیا نتیجہ اخذ کیا معلوم نہیں، کتاب ہاتھ میں پکڑ لی اور ہجوم میں گم ہوگئے۔ شاید میں مطمئن ہوگئی کہ کتاب پہنچ جائے گی۔

2014ء وہ سال تھا جب میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی ہوئی۔ ملازمت سے بھی سبک دوش ہو چکی تھی۔ وہ اپنی ملازمت پر سعودی عرب روانہ ہو گیا تو میرا گھر میری آخری اولاد کے بعد ویران ہو گیا۔ بس دوسرے ہی دن میں نے اپنی بہن کو جو اعظم گڑھ میں رہتی ہیں' مدد کے لیے فون کیا۔ دو ہفتے میں تمام کارروائی مکمل ہوئی اور 19 مئی 2014ء کو میں دہلی ایئرپورٹ پر تھی۔ میری زندگی میں آنے والا یہ دن پوری زندگی کے ایک ایک دن سے بالکل مختلف تھا۔ سفرنامہ ہندوستان ''چشمِ نم'' میں اس کی تفصیل درج ہے۔

علی گڑھ میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں بھی کسی کو نہیں جانتی تھی' سوائے منٹوای کی ایک قبر کے، جس کی کشش مجھے وہاں لے کر گئی تھی کہ جس مسلم یونیورسٹی کے احاطے میں میں نے اپنی پیدائش کے بعد کے دو سال گزارے تھے۔

گیسٹ ہاؤس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، میں سمجھی کوئی ملازم ہوگا۔ دروازہ کھلا تو سامنے ایک صاحب کھڑے تھے۔

تعارف کرایا ''میں صغیر افراہیم ہوں، شعبہ اردو میں پڑھاتا ہوں، ''تہذیب الاخلاق'' کا مدیر ہوں۔''

میں حیران ان کے مقابل کھڑی تھی۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر آپ کو میرا خیال کیوں اور کس لیے آیا؟ میں تو یہاں کے لیے گمنام شخصیت ہوں۔'' میں نے گھبرائے ہوئے، اٹکتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے ارتضیٰ کریم صاحب نے فون پر اطلاع دے دی تھی کہ آج آپ یہاں آ رہی ہیں اور میں آپ سے ضرور مل لوں۔''

دہلی کے ایک دن کے قیام کے دوران میں نے ارتضیٰ کریم صاحب کو فون کر کے اپنا تعارف اور آمد کی اطلاع دے دی تھی، مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ مجھے کراچی کی اس ملاقات کے حوالے سے یوں سنجیدہ لیں گے، جہاں ان سے ایک منٹ کی گفتگو کسی بہکے ہوئے دماغ کی شخصیت والی کی گفتگو تھی۔

خوشی اور حیرانی کے ساتھ اپنی پذیرائی مجھے بہت اچھی لگی۔ دوسرے ہی لمحے میں ان کے

ساتھ تہذیب الاخلاق کے دفتر میں تھی۔ ڈھیروں لوگ مجھ سے یوں مل رہے تھے جیسے مدتوں سے وہ میرے ہی انتظار میں ہوں۔

وہیں ایک سیدھی سادی، دبلی پتلی خاتون نظر آئیں جو خاموش آخری کرسی پر بیٹھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر اُن تک پہنچی کہ وہ اتنے مردانہ ہجوم میں ایک خاتون تھیں۔

''میں سیما صغیر ہوں، اردو پڑھاتی ہوں۔'' میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ لگا ہی نہیں کہ پہلی بار مل رہے ہیں، اور یہ یقین تو ہرگز بھی نہیں تھا کہ چند دن کی یہ اتفاقی ملاقات دوستی میں بدل جائے گی۔

تین دن کے قیام میں ہم کئی بار ملے اور پھر اپنے اپنے دیس میں رہنے لگے۔ موبائل نے خط کتابت ضرور ختم کردی ہے لیکن انگلیوں نے قلم کا کام شروع کرنے کے بعد جلد جلد مخاطب ہونے کا موقع فراہم کردیا ہے۔ جلدی جلدی ہم دونوں ایک دوسرے کے نام خط لکھنے لگے جو برقی تحریر کہلاتے ہیں۔ آواز بھی سنتے، چہرے بھی دیکھتے۔

دوستی پکی ہوچکی تھی، ان کے دیے ہوئے ہندوستانی سوٹ کو میں جب بھی پہنتی، جی چاہتا ان کا یہ تحفہ انہیں ضرور دکھاؤں۔ خواہش میں شدت ہو تو خواہش پوری ہو ہی جاتی ہے۔ اگلے ہی سال عصمت چغتائی کی سوسالہ پیدائش کے جشن پر میں علی گڑھ سرکاری طور پر بلالی گئی۔

وہ تمام لوگ جو تین دن کی ملاقات میں ملے تھے پھر سے ملیں گے سوچ سوچ کر اچھا لگ رہا تھا۔

میری تقریر تھی، سیما سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ نظروں میں وہ نشست آج تک جوں کی توں ہے۔ سیما یوں ہی بیٹھی ہیں اور مسکرا رہی ہیں، لیکن کچھ ہی دیر کے بعد وہ غائب ہوگئیں۔ میں گیسٹ ہاؤس پہنچا دی گئی۔ میرے ساتھ حنا آفرین بھی آئیں جو دہلی سے شرکت کے لیے مدعو تھیں۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ سیما کی طبیعت خراب ہوگئی، اسپتال میں ہیں۔ یہ گمان بھی نہیں گزرا کہ معاملہ شدید نوعیت کا ہوگا کہ صغیر افراہیم صاحب مسلسل مجھ سے دن میں کئی کئی بار ملتے رہے اور یہی بتاتے رہے کہ سیما بیمار ہیں، ابھی اسپتال سے آرہا ہوں، ابھی اسپتال واپس جاؤں گا۔

یہ مختصر سی ملاقات تھی۔ وہ کسی حد تک بہتر ہوئیں، ہم کئی بار ملے اور بہترین دوست بن گئے۔ ایک ادبی تقریب میں گئے۔ شعبہ اردو گئے۔ گیسٹ ہاؤس میں بیٹھے مگر وہ تھکی تھکی سی نظر آئیں۔ مسکراہٹ مگر جیسے ان کے چہرے کا جزو تھی۔ واپس اپنے وطن آ گئی، ساتھ اُن کا دیا ہوا تحفہ بھی تھا، کتابیں بھی تھیں، مگر ہاتھ ملانے کی گرمی کی اہمیت سب سے زیادہ محسوس ہوتی رہی۔

اس عرصے میں اُن کی اردو ادب کی خدمات، اعزازات، انعامات کی تفصیل صغیر افراہیم صاحب سے تو ملتی رہی مگر میری دوست سیما نے کبھی اپنی خدمات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بس ایک بار پھر ملنے کی دعا کرتی رہیں۔

میں صغیر صاحب کے فون پر فون کرتی، اکثر وہی اٹھاتیں۔ میں چھیڑتی ''میاں کا فون چیک کرتی ہو۔''

کہتیں ''ارے نہیں بھئی، ان کا فون ادھر اُدھر پڑا رہتا ہے، وہ خود کہیں ادھر اُدھر ہوتے ہیں۔'' پھر وہ دونوں مل کر ہم سے باتیں کرتے، اور ہر گفتگو اس وعدے سے شروع ہوتی کہ ہم دونوں آپ کے گھر ضرور آئیں گے، اور میں تاکید کرتے ہوئے یہ کہنا نہ بھولتی کہ صغیر صاحب اکیلے آنے کی آپ کو اجازت نہیں ملے گی، سیما ضرور ساتھ ہوں گی۔

صغیر افراہیم صاحب زور دے کر کہتے ''پکا وعدہ ہے، سیما ضرور ساتھ ہوں گی''۔ کئی بار سیما کی بیماری کی خبر ملی، پھر اللہ کا شکر کہہ کر اطلاع دیتے ''اب بہتر ہیں''۔

مگر یہ خبر کہ سیما کو دہلی لے آئے ہیں، اسپتال میں ہیں، ٹھیک نہیں ہیں، اب بہتر ہیں، لیجیے بات کر لیجیے۔ نحیف سی مسکراتی آواز آتی۔ میں وعدہ یاد دلاتی۔ ''ٹھیک ہو جاؤں، ضرور آؤں گی۔'' پھر آواز ڈوب جاتی۔ صغیر افراہیم صاحب کا حوصلہ قابلِ تعریف ہی نہیں، حیرت ناک بھی تھا۔ اعتماد سے کہتے ''ویزہ نہیں ملا تو دبئی میں ملیں گے، آپ بھی وہاں پہنچ جایئے گا''۔ ہم فوراً اس راستے کی ملاقات کا بھی وعدہ کر لیتے، مگر دوسرے ہی لمحے مُکر جاتے، کہتے نہیں ''آپ کو میرے گھر آنا ہے۔''

صغیر افراہیم صاحب سیما کی طرف سے مجھے یقین دلاتے ''ہم دونوں آئیں گے۔''

ایک دن خبر دی ''سیما وینٹی لیٹر پر چلی گئی ہیں''۔ اس چھوٹی سی ہولناک خبر نے جیسے نڈھال

کر دیا۔ پانچ دنوں تک فون کی طرف دیکھنے سے بھی خوف آتا تھا کہ ایک دن فون کو تو آنا ہی تھا۔

''ہم دہلی علی گڑھ کے راستے میں ہیں، گھر واپس جا رہے ہیں۔ سیما بھی میرے ساتھ ہیں مگر اب ہم آپ سے کیا وعدہ پورا نہیں کر سکیں گے جو کئی سال سے مسلسل کر رہے تھے۔''

سیما اتفاقاً زندگی میں دوست بن کر آ گئی تھیں، اب میں اپنے شہر میں سب کو یہ کہہ کر حیران کرتی تھی کہ علی گڑھ میں میری ایک پیاری سی دوست رہتی ہے۔ دوستی کی عمر بہت کم ہے مگر دوستی میں اتنی شدت ہے کہ ہمیں یہ یقین دلا رہی ہے محبت ایک نظر میں ہو جاتی ہے مگر وہ ایک نظر کمیاب ہوتی ہے۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک ساتھ سما جانا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ میں سیما کو کھو چکی ہوں۔ اب کبھی علی گڑھ گئی تو اسے ڈھونڈنے اسی منٹوای میں جانا ہوگا جس میں اپنے ابا کو ڈھونڈنے آدھی صدی کے بعد گئی تھی مگر وہ مل تو گئے تھے بات نہیں ہو پائی تھی۔

پھر بھی میں سیما کو اس کا وعدہ تو ضرور یاد دلاؤں گی۔

☆☆☆

(رسالہ 'سیما' جو انتقال کے بعد صغیر افراہیم نے نکالا، اس کے پہلے شمارے میں یہ مضمون چھپا)

''اِدھر نگاہ کرو، پھر سے رسم وراہ کرو'' طلعت اشارت

دونوں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک نے رک کر دوسری سے کہا۔ میں طلعت اشارت ہوں اور تم۔۔۔؟ دوسری مَیں تھی اور مَیں بھی رک گئی۔ ہم دونوں نے اشتیاق بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم ناموں سے واقف تھے مگر صورت آشنا نہیں تھے۔ ہمارے قد ابھی چار فٹ سے زیادہ نہیں تھے اور ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔ یہ سڑھیاں روزنامہ جنگ کے دفتر کی تھیں اور ہم نونہال لیگ کے بچوں کے بھائی جان شفیع عقیل سے ملنے جارہے تھے۔ ہر اتوار میرا مضمون اور اور طلعت کی نظم بچوں کے صفحے پر چھپا کرتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہیں چھپ جانا بڑے اعزاز کی بات تھی اور ہمیں اپنے اپنے اعزاز کا اچھی طرح علم تھا۔ دوسری بار جب ہم پھر اتفاقاً ان ہی سیڑھیوں پڑ چڑھتے ملے تب ہم دونوں سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ قد بھی بڑھ چکا تھا۔ طلعت نے کہا۔ میں نے ڈی جے کالج میں داخلہ لے لیا ہے اور میرا یونیفارم نہیں ہے، پھر یہ سفید لباس کیوں۔۔۔۔؟ ہاں نیشنل کالج میں ایسی کوئی قید نہیں ہے مگر مجھے سفید کپڑے اچھے لگتے ہیں۔ انہیں پہن کر ایسا لگتا ہے کہ ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ بہت قابل بھی ہو گئے ہے۔ مَیں نے واقعی اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ طلعت ہنس پڑی۔ اگر صرف سفید کپڑے پہننے سے ہم بڑے ہو جائیں اور قابل بھی تب تو یہ بڑا آسان نسخہ ہے، تم کچھ بھی سمجھ لو۔ اب ہم کچھ اسی قسم کی باتیں کرنے لگے تھے۔ اس بار ہم دونوں نے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے دیر تک باتیں کیں۔ اس نے میرے کئی مضامین پر تبصرے کئے۔ میں نے اس کی کئی نظموں کو بے حد سراہا۔ دونوں نے الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ واقعی اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ ''اور قابل''۔۔۔۔؟ میں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''شاید وہ بھی''، وہ مسکرائی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب گھر سے اسکول کالج کے علاوہ کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مَیں نے کسی انٹر کالجیٹ مباحثہ میں شرکت کی۔ تب وہ اپنے کالج سے مباحثہ

سننے ضرور آئی اور مَیں نے اسے کئی مشاعروں میں طالب علموں کے ساتھ سنا۔

یوں یہ دوستی دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔

ایک دن یونی ورسٹی سے واپسی پر ہم دونوں ایک ہی بس میں سوار تھے۔ وہ پھولدار قمیص اور سفید شلوار دوپٹے میں ملبوس تھی اور مَیں حسبِ عادت سفید لباس میں۔ ان دونوں شلوار دوپٹہ ہمیشہ سفید ہی ہوا کرتا تھا اور صرف قمیص بدل لینے سے جوڑا بدل جایا کرتا تھا۔ میرا پاؤں بس کے آخری پائیدان پر ٹکا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ بس کے ڈنڈے کے پکڑے تھا اور دوسرا فائل کو سینے سے چپکائے ہوئے تھا۔ وہ بس کے اندر کھڑی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میرے ہاتھ سے فائل لے لیا۔ کہ یہ اس زمانے کے آداب میں داخل تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں کی بھی کوئی تمیز نہیں تھی۔ فائل پکڑانے کے بعد میرا دوسرا ہاتھ دوسرے ڈنڈے کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ بس یونی ورسٹی کے بعد آنے والے ''صحرا'' سے گزرتی ہوئی گرومندر کی جانے رواں تھی۔ ایسے موقع پر ہم باتیں نہیں کر سکتے تھے کہ توازن بگڑ جانے کا ڈر تھا۔

اسٹاپ آنے کے بعد اس نے مجھے فائل پکڑایا اور ہم دونوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گلِ رعنا کلب کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

تم نے کس شعبے میں داخلہ لیا۔۔۔؟ اس بار بھی پہل اُسی نے کی۔

''معاشیات میں''۔ اور تم نے۔۔۔؟ مَیں نے پوچھا۔

''مائیکرو بیالوجی میں۔ تم دنیا کو دُور بین سے دیکھنا مَیں خورد بین سے دیکھوں گی۔۔۔''

''خوب''۔ ہم دونوں بہت ہنسے۔

''دنیا کو خورد بین سے کیوں دیکھنا چاہتی ہو۔۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

مَیں بہت قریب سے اس کی باریکیاں جاننا چاہتی ہوں۔ دیکھو دنیا میں جاننے کے لیے کتنا ہی کچھ ہے نا۔ اس نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

سفید کپڑے میں نے پہن رکھے ہیں اور دانشوری کی باتیں تم کر رہی ہو؟ مجھے اپنی وہ گفتگو یاد تھی جب کالج کے زمانے کی ایک ملاقات میں مَیں نے اس سے کہا تھا کہ سفید کپڑے پہننے والے قابل ہوتے ہیں۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ ہم یوں ہی کھڑے ''قابلیت'' کی باتیں کرتے رہے جس میں ایک موضوع یہ بھی تھا کہ ہم دونوں نے اردو میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟ اس نہ کہا مگر یہ ضروری تو نہیں کہ ادب پڑھنے والے ہی لکھنا جانتے ہوں۔ پھر اس نے بہت سے قابل لوگوں کے نام لینے شروع کر دیئے جنہوں نے مختلف مضامین پڑھے مگر بڑے شاعر اور ادیب بنے۔ میں اس کی باتوں سے رعب میں آ رہی تھی۔ وہ بغیر سفید کپڑے پہنے ہوئے بھی قابل اور بڑی بڑی لگی۔

پھر ہماری ملاقاتیں یونیورسٹی میں ہونا شروع ہوئی۔ ہم تو پوسٹ آفس اور جمنازیم کے اسٹاپ پر اتر کر آرٹس فیکلیٹی میں داخل ہو جاتے تھے اور وہ بس میں بیٹھی دور ویران جزیرے یعنی سائنس کی طرف بڑھ جاتی۔

ہم دونوں کے بلاک کے درمیان لائبریری اور ایڈمنسٹریشن کی عمارت حائل تھی۔ لیکن ٹیلی فون کی سہولت یہاں پر ہی تھی۔ ایک دن وہ اپنی اکنی کے ضائع ہو جانے پر افسردہ تھی۔

''یہ ڈبہ اکثر اکنی کھا جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔

یہ دردِ مشترک تھا۔ میں بھی اپنے کنگورے دار اکنی سے کئی بار ہاتھ دھو چکی تھی۔ ویسے بھی ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے تھے کہ نقصان اٹھاتے پھریں اور دکھ بھی محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا'' یہ ڈبہ مہینے میں چار دن ٹھیک رہتا ہے۔ بقیہ دنوں ہمارے پاس پیسے بھی ہضم کر جاتا ہے اور ہماری آواز بھی مطلوبہ جگہ نہیں پہنچاتا۔ ہم اس پر مضمون لکھیں گے۔'' اب ہم بڑے بھی ہو گئے تھے اور بچوں کا صفحہ چھوڑ کر طالب علموں کے صفحے پر لکھ رہے تھے۔

طلعت کہنے لگی اور اسے دیکھو یہ جو موچی بیٹھا ہے۔ پورا ایک آنہ لیتا ہے اور ہماری دو پٹی کی چپل میں صرف دو کیل ٹھونک دیتا ہے۔

اسے موچی سے بھی شکایت تھی۔ حالانکہ میں ان دنوں موچی کو بالکل دوسرے نظریئے سے دیکھتی۔ دو پٹی کی چپل جانے فیشن میں تھی یا سستی ملتی تھی، ہم سب وہی پہنتے لیکن ٹوٹنے کے لیئے اسے صرف یونیورسٹی ملتی۔ ہم ایک پاؤں سے ننگے ہو جاتے اور چپل ہاتھ میں اٹھا کر موچی تک پہنچ جاتے۔ ہمیں چپل پہننے کے قابل بنا دیں۔ میں نے طلعت سے کہا۔ دیکھو اگر یہ موچی جامعہ میں نہ ہوتا تب بتاؤ کیا ہوتا؟

تم دنیا کو دُور بین سے دیکھو، خوردبین سے دیکھنا میرا کام ہے!

طلعت میری توجہ ادھر سے ہٹا دیتی۔ مجھے وہ موچی جتنا اچھا لگتا طلعت کو اتنا ہی بُرا۔

پھر ہم دونوں اکثر جامعہ کی وہ وہ چاٹ کھانے ٹھیلے پر پہنچ جاتے جہاں چار آنے میں ایک پیالہ مختلف پھلوں کا مل جاتا۔

میری شکل دیکھتے ہی چاٹ والا پپیتے کی پھانک نکال لیتا اور آدھا کیلا کاٹ کر اس کے عوض میرا چاٹ والا پیالہ بھر دیتا۔

''تم پپیتا کیوں نہیں کھاتیں؟'' وہ پوچھتی۔

مجھے کالے کالے اتنے سارے گتھم گتھا بیج دیکھ کر جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوتی ہے۔ مَیں بولی۔

بیج تو نکال دیئے جاتے ہیں تمہارا کیا بگاڑتے ہیں۔ وہ کہتی۔

مجھے وہ دُور بین سے کچرے کے ڈبے میں جا کر بھی ہلتے جلتے نظر آتے ہیں۔ مَیں کانپ کر کہتی۔

چاٹ کھانے کو دوران دُور بین کہیں رکھ دیا کرو۔ وہ اطمینان سے بولتی اور پپیتے سمیت چاٹ کا پیالہ خالی کر دیتی۔

ایک پیالہ سے ہم دونوں کا پیٹ بھر جاتا۔

پھر میں نے ایک مضمون لکھا ''جامعہ کی چاٹ، موچی اور ٹیلیفون'' جسے بس میں بیٹھ کر ہم دونوں نے ساتھ ساتھ ایک بار پڑھا۔

مَیں اس مضمون کے ذریعے یونیورسٹی میں معتبر ہو گئی تھی کہ فون کا ڈبہ اب مہینے میں صرف چار دن خراب رہتا۔ بقیہ دنوں میں اٹنی ہضم نہیں کرتا تھا۔ موچی کا ریٹ ایک آنے سے کم ہو کر دو پیسے ہو گیا تھا اور چاٹ والے نے بقیہ آدھا کیلا بھی میرے پیالے میں ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ بقول اس کے کہ میرے مضمون سے اس کی چاٹ دور دراز کے شعبوں تک مشہور ہو چکی تھی اور طالب علم جوق در جوق کھانے آتے۔ طلعت نے اس مضمون کی افادیت پر دیر تک گفتگو کہ یہ بیک وقت تین مسائل پر مبنی ایک مضمون تھا اور قابلیت سے بھرپور تھا۔

ہم دونوں نے اپنے اپنے مضمون کو دور بین اور خورد بین کے ذریعے مکمل کرلیا تھا۔ لیکن اس مضمون کو آزمانے نہ طلعت نکلی نہ میں۔

وہ روزنامہ جنگ کی نئی بلڈنگ کی چمکدار اور صاف ستھری سیڑھیاں ایک دم چڑھ گئی اور اب خواتین کے مسائل پر لکھے گئے مضامین ٹھیک کر کے چھاپنے لگی۔ مَیں نے اخبارِ جہاں سنبھال لیا۔ ہم دونوں ایک ہی بلڈنگ کے دو اخباروں میں ملازمت کر رہے تھے۔

ایک دن پھر ہم سیڑھی کی ریلنگ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''یہ ہم کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

مجھے نہیں معلوم۔ جواب تو مجھے بھی نہیں آتا تھا۔

پھر وہ یہ ملازمت چھوڑ کر اخبارِ خواتین چلی گئی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مَیں کیا کر رہی ہوں؟

صحافت اور لکھنا میرا شوق سہی لیکن مجھے اپنی دور بین کو ہاتھ سے نہیں رکھنا ہے۔ مجھے اب معاشیت ہی پڑھانی ہے۔ مَیں کالج میں جا کر پروفیسر کہلانے لگی۔ وہ پکی صحافی بن چکی تھی۔

ہم بہت دن ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ ہمارے دفتر دور تھے ہمارے راستے مختلف تھے۔ پھر طلعت کی شادی ہوگئی۔

ایک دن جب میں سوسائٹی کے پہاڑی والے ماڈل اسکول سے ہوتی ہوئی لمبا چوڑا میدان پار کر کے پوسٹ آفس والی گلی سے اس اسٹاپ پر آئی جو میٹروپول کا اسٹاپ کہلاتا تھا تب وہاں مجھے طلعت کھڑی مل گئی۔ ٹوٹا پھوٹا سا گھاس پھونس والا یہ ہوٹل جس کی دیوار پر ایک کوئلے سے کسی منچلے نے ہوٹل میٹروپول لکھ دیا تھا۔ واضح رہے کہ ان دنوں کراچی میں ایک ہی ہوٹل بہت مشہور تھا جس کا نام میٹروپول تھا اور وہ صدر کے علاقے میں واقع تھا۔ بلڈنگ آج بھی موجود ہے۔ صدر زینب مارکیٹ سے آئیں یا آرٹس کاؤنسل جانے کو مڑیں۔ یا گورنر ہاؤس کی طرف جائیں یا کلفٹن کے برج کی طرف بڑھیں درمیان میں آپ کو میٹروپول کی بلڈنگ ضرور روکے گی۔ سنا ہے وہ اندر سے کھوکلی ہو چکی ہے اور اب وہاں کچھ اور بننے جا رہا ہے۔ لیکن ہماری یادوں میں تو سوسائٹی کا وہی ہوٹل موجود ہے جس کے بائیں جانب ایک گھنا سایہ دار درخت تھا اور جس کے تنے سے لگے دو پتھر آمنے سامنے یوں رکھے تھے کہ جیسے وہ ہم دونوں کی ملاقات کے لیے ہی تھے۔ ہم دونوں اب

اکثر اسی پر بیٹھ جاتے۔ دُوربین اور خوردبین کی باتیں کرتے۔ ان دنوں ہمیں اچھے اچھے شعرا کھٹے کرنے کا شوق تھا۔ میں نے پوچھا۔ ان دونوں جوتم نے سب سے اچھا شعر پڑھا یا سنا ہو، بتاؤ۔

ہم دونوں نے الگ الگ ایک پرچے پر لکھا اور جب پرچے کا تبادلہ کیا تب پتا چلا کہ دونوں نے ایک ہی شعر لکھا ہے

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلّم کا

فرید جاوید کا یہ شعر ہم دونوں کو ایک ساتھ پسند آیا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔ مَیں نے ریڈیو پر ان کی آواز میں سنا تھا۔ ان پتھروں پر بیٹھ کر ہم نے مصطفیٰ زیدی کے بہت سارے اشعار کا بھی تبادلہ کیا تھا۔ وہ زندگی کی باریکیوں کو دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ مَیں اب بھی سفید کپڑے پہنتی تھی اور بڑا بننے کی کوشش میں تھی۔

ایک دن اس نے کئی ایک صفحے مجھے پکڑا دیئے اور کہا۔ دیکھو میری شاعری تمہیں پسند آتی ہے یا نہیں؟

کیوں نہیں؟ مَیں نے شوق سے وہ کاغذ اس کے ہاتھوں سے لے لیے۔ اس کا ایک مجموعہ اشارات چھپ گیا۔ مجھے اس پر بہت رشک آیا۔

لوتم بھی صاحبِ کتاب ہوگئیں۔ مَیں نے پریس کلب کی اس چھوٹی سی راہداری سے جو جھاڑیوں سے خود بخود خوبصورت بن گئی تھی۔ گزرتے ہوئے کہا۔ ''مبارک ہو''

مجھے تمہاری مبارک باد بہت قیمتی لگی۔ میرے لیے سرمایہ ہوگی۔ ہم بچپن سے ساتھ ساتھ چلتے چلے آرہے تھے۔ بعد میں اس نے اپنے دوسرے مجموعے کا نام سرمایہ ہی رکھا۔ جانے کب ہمارے راستے الگ ہو جائیں۔ مَیں نے دل ہی دل میں ایک دکھ بھرا جملہ ادا کیا۔ ان دنوں میں یوں ہی سوچنے لگی تھی۔

پھر واقعی طلعت امریکہ چلی گئی۔ مجھے جب یہ خبر ملی تب ساتویں، آٹھویں کلاس کی جغرافیہ کی کتاب کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ جہاں لکھا ہوتا اس ملک میں چنا، جو، باجرا، روئی، پٹ سن پیدا ہوتے ہیں اور دساور بھیج دیئے جاتے ہیں۔

دساور کے معنی نہ کبھی ٹیچر نے سمجھائے نہ ہم نے کبھی لغوی معنی سمجھنے کی کوشش کی۔ بس اس کے معنی یہی سمجھ لیے کہ دساور کوئی ایسی جگہ ہے جہاں چیزیں پیدا ہونے کے بعد چلی جاتی ہیں۔

امریکہ بھی پاکستان کے لئے دساور ہی ہے۔ کتنے ہی پیارے دساور چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کا حال ہم نے کسی جغرافیے کی کتاب میں نہیں پڑھا تھا سو یقین کر لیا۔ طلعت اب دساور سے کبھی واپس نہیں آئے گی۔

اب فون کے ڈبے اتنی ہضم نہیں کرتے۔ ہماری اکثر فون پر اپنی مختلف دوستوں سے باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ طاہرہ حسین بتاتی کہ طلعت اچھی ہے۔ طلعت بیمار ہے۔ اسپتال میں ہے۔ اسپتال سے آ گئی ہے اور پھر اسپتال میں داخل ہو گئی ہے۔ طلعت دنیا سے چلی گئی۔

آخری فون کی اس اطلاع نے ماضی کے سارے لمحوں کو پل بھر میں یکجا کیا اور پھر وہ تمام لمحے پل بھر میں ''منجمد'' بھی ہو گئے۔

طلعت نے دنیا سے جاتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے چند دنوں کی مہلت مانگی تھی۔ اپنی بیٹی کو سرخ جوڑا پہنانے کی اور اپنے معصوم بیٹے کو محفوظ ہاتھوں میں سونپ دینے کی۔ اللہ نے اس کی یہ دونوں خواہشیں جلد پوری کر دیں۔ اس نے اپنی کتابِ زیست کو بند کیا، چند اوراقِ پریشاں جو ابھی چھپنے سے رہ گئے تھے ان پر ''اشارات'' اور ''سرمایہ'' کی دو کاپیاں رکھ کر دبا دیا کہ وہ اڑ نہ جائیں۔

ادھورا کام کسی کے ہاتھوں بھی پورا ہونے کے لیے چھوڑ گئی۔

مجھے لگتا ہے میٹروپول ہوٹل کے ان دو پتھروں پر ہم دونوں نے آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنے پرس سے ڈھیر سارے صفحے نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما رہی ہے۔

دیکھو یہ ان سارے لمحوں کی داستان ہیں جن میں آخر آخر میں جیتی رہی۔ اب یہ منجمد ہو رہے ہیں! میرے جانے کے بعد تو ہو ہی جائیں گے۔ لو میں یہ تمہیں سونپ رہی ہوں۔ جو چاہوں ان کے ساتھ سلوک کرو۔ اس کے پیارے طارق بھائی نے بھی شاید اُس گھنے سایہ دار درخت کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی یہ گفتگو سن لی۔

دساور سے پاکستان آئے۔ مجھے ڈھونڈا، ان منجمد لمحوں کو میرے حوالے کیا۔

''اسے چھاپنا ہے۔''

''میرے لیے یہ اعزاز ہوگا۔'' طلعت اشارت تم سیڑھیاں چڑھ کر کسی نامعلوم کمرے میں چلی گئیں۔ مَیں نے تمہاری تلاش میں کئی سیڑھیاں پھلانگ لی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں تمہارے ''منجمد لمحے'' کی ایک کاپی ہے۔ یہ کتاب مجھے تم تک پہنچانی ہے۔ مَیں کمرہ کمرہ ڈھونڈتی تم تک ایک دن ضرور پہنچ جاؤں گی۔

اِدھر نگاہ کرو پھر سے رسم و راہ کرو

تمہارا یہ مصرعہ دہراؤں گی اور پھر ایک شعر سنا کر تمہیں انتظار کی کیفیت میں ڈال دوں گی۔

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اتار کے

☆☆☆

صراطِ ہجر کی نیم جاں... حجاب عباسی

شاید کوئی اور شہر بھی کراچی جیسا ہو، مگر مجھے تو لگتا ہے کراچی جیسا کوئی شہر نہیں جو ہندوستان جیسے پورے ملک کو اجاڑ کر بسا ہے۔ ہر روز اس شہر پر لاکھوں قیامتیں ٹوٹتی ہیں اور اس شہر میں رہنے والے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی روانی رکتی نہیں، پھر بھی دکھی دل اور برستی آنکھوں کے ساتھ یہاں کوئی نہ کوئی شام سجتی ضرور ہے، جہاں سب اپنے اپنے دکھوں کی گٹھڑی کو گھڑی بھر گھر کے کسی کونے میں سنبھال کر رکھ آتے ہیں اور یوں ہر تقریب بہر ملاقات ثابت ہوتی ہے۔ یہاں ہر شام ایک دوسرے سے شناسائی بڑھتی ہے، دوست بنتے ہیں اور زندگی بہت ساری دشواریوں کے ساتھ آسان بھی ہوجاتی ہے۔ ورنہ اتنے بڑے شہر میں ہم اپنی پسند کے لوگ کہاں ڈھونڈ کر ملیں؟

برسوں پہلے حجابؔ یونہی ایک تقریب میں ملیں اور پھر ملتی گئیں، یہاں تک کہ حجاب کے تمام پردے اٹھ گئے اور وہ میری اچھی دوست بن گئیں۔ یہ اُن شاعرات میں سے ہیں جنہیں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اور پھر بعد میں انہیں سن کر اور بھی خوشی ہوتی ہے۔ ان کی خاموشی میں محبت اور ہاتھ ملانے میں اپنائیت ہے۔ چیختے، دھاڑتے، گولیاں برساتے اور خون اگلتے اس شہر میں حجاب سی دوست گہرے سمندر کی طرح معتبر سی لگتی ہیں۔

''تجدید ہجر'' کے بعد ''تخیر ہجر'' ہمارے ہاتھ آئی۔ اس ہجر کا وصال ہمیں اچھا لگا۔ جس طرح ایک انسان کو پہلے اس کے لباس سے پہچانا جاتا ہے، پھر بعد میں اس سے ملاقات ہوتی ہے، اسی طرح میرے ہاتھ میں جب کوئی کتاب آتی ہے تب میں اس کے ظاہری حسن سے پہلے ملتی ہوں۔ صفحات پلٹتی ہوں، لکھائی چھپائی کا جائزہ لے کر پھر ملاقات کے لیے تیار ہوجاتی ہوں۔ الفاظ پڑھتی ہوں، معنی ڈھونڈتی ہوں۔ دل اور دماغ دونوں کو ساتھ ملنے کا موقع دیتی ہوں، پھر ملاقات مکمل ہوجاتی ہے۔

دنیائے ادب کے اوجِ کمال نے اس کے ظاہری حسن کو الفاظ کے حسن سے پوری طرح قریب رکھنے کی کوشش کی ہے، اور وہ اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ پشت پر حجاب کی

تصویر ہے جسے دیکھ کر میرے ذہن میں کسی کا یہ شعر فوراً آ موجود ہوا:

بولتی آنکھ اور سمٹتا بدن
یہ ادھورا حجاب رہنے دے

ایک اچھے شعر کی تعریف یہ ہے کہ نشستِ الفاظ نثر سے بے حد قریب ہوں۔ روانی ہو، نرم و نازک ہوں۔ ہاں شعر کی عمدگی کا انحصار نزاکتِ خیال پر ہے۔ اور شاعری کا کمال یہ ہے کہ پہلے مصرعے کو کسی بھی دوسرے مصرعے سے ملا کر پڑھیں تو کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ اسی طرح ان کی دونوں کتابوں ''تجدیدِ ہجر'' اور ''تحیّرِ ہجر'' کو بھی آپ متبادل کے طور پر سوچ سکتے ہیں۔ یعنی وہ تجدیدِ ہجر ہو یا تحیرِ ہجر، ہجر تو پھر ہجر ہی ہوتا ہے۔ اسے آپ اس قافیے پر مت پرکھیے گا کہ ڈگری تو پھر ڈگری ہی ہوتی ہے۔

اچھا شعر کہنے کے لیے دونوں جہان ہارنے پڑتے ہیں۔ عورت کو اپنی قسمت اور محبوب پر اعتبار بڑی مشکل سے آتا ہے، لیکن جب آجاتا ہے تب وہ مست ہوا کی طرح بے سمت چلتی جاتی ہے۔ وہ مرد کے کھو کھلے لفظوں کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود فریبی میں لذت محسوس کرتے ہوئے ان لفظوں کا اعتبار کرے، لیکن پھر بھی وہ مرد کو اپنی بے رخی کے چور دروازوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ وہ جب الجھ بھی جاتی ہے تب اس وقت بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنا اس کا مقصد نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ بات چیت کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہے ؎

اُسے تفریق کر کے جب بھی دیکھا تو یہ سارا جہاں صحرا لگا ہے
کبھی اس نے کہا تو کچھ نہیں ہے مگر پھر بھی مجھے اپنا لگا ہے

یہ سودا دل کا سودا ہے، خسارہ ہو نہیں سکتا
تو پھر کیوں یہ گماں ہے دوبارہ ہو نہیں سکتا

☆

رکھ تو دوں میں ترے اصرار پر سب تیر و کماں
یوں مگر ہار کا امکان بھی ہو سکتا ہے

ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ حجاب کی غزل ابہام اور الجھاؤ سے پاک ہے۔ رواں دواں اور دو

ٹوک بات کرنے کا نمونہ ہے:

تجھ سے ناراض تو نہیں لیکن　　دل کے شیشے میں بال ہے سائیں
تجھ سے کہہ تو دیا بھلا دیں گے　　پر بُھلانا محال ہے سائیں

زخم رکھتا ہے سب ہرے میرے
میرا کتنا خیال رکھتا ہے

ایک خاص بات جو مجھے اس شعری مجموعے میں نظر آئی ہے وہ یہ کہ ان کی اکثر غزلیں ''بقید یک قافیہ'' ہیں۔ میں نے بہت کم شاعرات کے دیوانوں میں یہ خصوصیت دیکھی ہے۔ یا یہ کہ میرا مطالعہ محدود ہے۔

کچھ دن تصورات نے بے چین تو رکھا
پھر خواب سے، خیال سے آگے نکل گئے
جب خود کو بے مثال بنانے کی ٹھان لی
ہر اس بے مثال سے آگے نکل گئے

☆

وہ کہانی تھی ضبطِ وحشت کی　　یہ دلِ رائیگاں کا قصہ ہے
کس خرابے میں آ گئے ہم تم　　ہر زیاں پر زیاں کا قصہ ہے

حجاب کی غزل میں لفظ ''آنکھیں'' اور ''دل'' ایک بلیغ استعارہ اور کلیدی حوالہ بن کر آیا ہے جو اس شعری مجموعے میں 32 اور 45 مرتبہ بالترتیب استعمال ہوا ہے۔ وہ عجیب تیور سے اپنی بات کہتی ہیں۔ ان کے بے ساختہ پن میں انہیں دیکھیے اور ان کی برجستہ گوئی پر داد دیجیے:

حصارِ چشم میں رقصاں مسلسل　　وہ صورت میرے پیچھے پڑ گئی ہے
دردِ موسم کو رکھا دل میں چُھپا کر پھر بھی　　آنکھ کر دیتی ہے اظہار، میں کب بولتی ہوں
آنکھوں کے صحیفوں کی بھی تحریر پڑھا کر　　دیکھا بھی تو کر، دیدۂ حیران سے آگے

''حصارِ چشم میں رقصاں'' اور ''آنکھوں کے صحیفے'' کی تراکیب مجھے تو بڑی پہلودار اور کثیر المعنی لگتی ہیں۔ مضمون بھی نیا نیا سا محسوس ہوتا ہے۔ طرزِ ادا بھی منفرد ہے۔ زیرِ لب دھیمی دھیمی سی آواز پورا

ادبی حسن اورفنی رچاؤ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

انگریزی میں کہتے ہیں "Lightly Loaded, Walk Faster" یعنی کم سامان رکھنے والے زیادہ تیز چلتے ہیں۔

حجاب اسی بات کو یوں کہتی ہیں ؎

سفر دشوار ہوتا ہے بہت سامان رکھنے سے
سفر میں صرف یادیں کچھ سہانی ساتھ لے جاؤ

ان کی شاعری میں خوش گوار تازگی ہے۔مثلاً:

میں صراطِ ہجر میں نیم جاں، وہ وہیں سے راہ بدل گیا
وہ ذرا سا رک کے یہ سوچتا کہ یہی تو وقتِ وصال ہے

ایک جگہ تو حجاب نے کمال کر دیا ہے۔انہوں نے قاری کے سامنے جیسے جامِ جمشید رکھ دیا ہے جس سے وہ خود موجودہ دور کی ہولنا کیاں اور سفا کیاں دیکھنے کے ساتھ ساتھ آنے والے دور کی ویرانیوں کا تماشا بھی دیکھ سکتا ہے۔مثلاً:

ایسا برباد کر دیا اس نے مجھ کو بغداد کر دیا اس نے

مجھے یوں لگتا ہے آئندہ ''بغداد کر دینا'' لُغت میں بطورِ محاورہ استعمال ہونے لگے گا۔ یہ شعر ''دبُش'' اور نہتے بغدادیوں کے حوالے سے انتہائی مؤثر اور بے مثال ہے۔

بچھڑنے کا ہے ارادہ تو برملا کہہ دو
یہ فیصلے پسِ دیوار تھوڑی ہوتے ہیں

یہ خطاب کتنا براہِ راست، عام، سادہ، سلیس اور بامعنی ہے۔بس یوں صرف حجاب ہی کہہ سکتی تھیں۔

جون ایلیا ہماری اردو شاعری کے ایک نہایت اہم، معتبر اور منفرد لہجے کے شاعر ہیں جو اب ہم میں نہیں۔ہم سب جانتے ہیں ''مُردے نہیں بولتے''

یہ کیا کہ بعدِ مرگ کوئی بولتا نہیں
تم توڑ دو یہ رسمِ کُہن جون ایلیا

اس شعر میں حجاب نے جون ایلیا کی اپنی شخصیت کو صرف رسمِ کہن کو توڑ دینے کا واسطہ دے کر بے حجاب کر دیا ہے اور ایک بار پھر کمال کر دیا ہے۔

رفتگاں کے ذکر پر ہر شخص آب دیدہ ہوتا ہے۔حجاب بھی کہتی ہیں ؎

کچھ دن گئے، کہ ہوں گے ان ہی میں شمار
جن رفتگاں کی خیر خبر بھی نہیں کوئی
کچھ دیر تو ٹھہرو تمہیں آنکھوں میں بسا لوں
کب کون بچھڑ جائے پتا کچھ نہیں ہوتا

عبیداللہ علیم نے بھی کچھ یوں ہی کہا تھا ؎

کچھ دن تو بسو مری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا

مرد کو بچھڑنے کا دکھ کم ہے۔عورت کو بچھڑنے سے پہلے بچھڑنے کا ملال ہے۔لیکن اس کے آگے ان کی خواہش اور کوشش کس قدر معصوم ہے ؎

نہ بجھ جائے چراغِ بزمِ ہستی
ہوا سے رابطہ کرنا پڑے گا

اور پھر اپنے عہد کا نوحہ ایک شعر میں انہوں نے کس خوبی سے کیا ہے ؎

ہم یہ کس عہدِ ستم گر میں چلے آئے ہیں
خود بھی مر جاتی ہے ماں، مار کے بچے سارے

اگر میں حجاب سے اپنے خیال کی مکمل ہم آہنگی آپ پر واضح کرنا چاہوں تب میں ان کا یہ شعر آپ کو ضرور سنانا چاہوں گی ؎

جو اپنا نام صفِ معتبر میں لکھتے ہیں
خود ان سے اپنی ملاقات تھوڑی ہوتی ہے

☆☆☆

(28 جون 2011ء کو آرٹس کونسل میں کتاب کی افتتاحی تقریب میں پڑھا گیا)

صدائے کُوکُو ... انوارعزمی

پنجاب میں مشہور ہے کہ فاختہ ''یوسف کھوُ ہ، یوسف کھوُ ہ'' (یوسف کنویں میں ہے، یوسف کنویں میں ہے) اُس وقت سے ہی پکارتی چلی آ رہی ہے۔
انوارعزمی کی شاعری کے کرب کا ادراک کرتے ہوئے میں نے اپنے مضمون کا یہ عنوان رکھا ہے۔

انوارعزمی صاحب کی ''حروف کی سوغات'' سوغات کے طور پر مجھے ملی۔ کتاب کا تحفہ تو ہر کسی کی طرح مجھے بھی اچھا لگتا ہے لیکن ساتھ ساتھ ایک حکم نامہ تھا کہ مجھے ان کی شاعری پر کچھ بولنا بھی ہے۔

میرے لیے یہ بات ذرا نہیں بہت کٹھن ہے، مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہے۔ ہاں شاعری پڑھتی ہوں، بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اپنی بساط کے مطابق سمجھتی بھی ہوں اور لذت بھی حاصل کرتی ہوں۔ تقریبات میں شرکت کرتی ہوں اور حاضرین میں جگہ بناتی ہوں۔
آج اسٹیج پر ہوں اور شاعری پر گفتگو کر رہی ہوں کہ بہت سی درخواستوں کے باوجود عزمی صاحب کا عزم مصمم رہا۔ سو اب آپ سے گزارش ہے کہ آپ پر جو کڑا لمحہ ہے اسے برداشت کریں۔

''حروف کی سوغات'' کے اوراق پلٹتے پلٹتے میرے ذہن میں غالب کا ایک شعر شدت کے ساتھ آ موجود ہوا۔ یہ شعر اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک انسان کے اندر جذبے کی سچائی زندہ ہے۔
شعر ہے ؎

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

مختصراً مجھے انوارعزمی کی شاعری اسی شعر کا پھیلاؤ معلوم ہوتی ہے، لیکن جذبوں کی تکمیل اور خوابوں کی تعبیر کا انتظار تب ہی ممکن ہے جب انسان کے اندر تمنا کرنے کی صداقت ہو۔ اس تمنا کے فنکارانہ اظہار میں حُسن ودیانت ہو، اور پھر اس تمنا کو عمر بھر زندہ و برقرار رکھنے کا حوصلہ بھی ہو۔

ان کی تمنا ہے ؎

میری آواز ہر اک رخ سے ہو میری آواز
اے خدا صاحبِ اسلوب بنا دے مجھ کو

حروف کی سوغات کی پہلی غزل کے اشعار ہیں:

اب تو کسی بھی جرم پر جھکتی نہیں نظر
ہم کتنے شرمسار تھے پہلی خطا کے بعد
اب وہ تکلفات وہ قدریں کہاں رہیں
اب کون پھونکتا ہے کسی پر دعا کے بعد

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ باتیں اگر دہرائی نہ جایا کرتیں تو اب تک سب ختم ہو چکی ہوتیں۔ ایسے میں حفیظ ہوشیار پوری کہتے ہیں ؎

دل کی حالت دمِ رخصت مت پوچھ
ہائے وہ شکل، وہ صورت! مت پوچھ

عابد علی عابدؔ کہتے ہیں ؎

وقتِ رخصت وہ چُپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

انوارعزمی اسی مضمون کو یوں باندھتے ہیں ؎

وہ منظر میری آنکھیں بھول جائیں غیر ممکن ہے
کسی کا وقتِ رخصت صورتِ تصویر ہو جانا

صورتِ تصویر ہو جانے کی لذت سے آشنائی اسی کو ملتی ہے جس پر یہ منظر گزرا ہو۔ انوارعزمی کی غزل میں بنیادی کسک اسی تجربے کی دین معلوم ہوتی ہے جو ہجر و وصال اور لب و رخسار کے

حوالے سے ہماری غزل کی عمومی فضا تیار کرتی ہے۔لیکن غالب رجحان کی حیثیت سے وہ ''آدمی'' کو اپنی شاعری کا مرکز بناتے ہیں۔ یوں کہیے کہ ان کی شاعری کے طلسم کا کلیدی لفظ آدمی ہی ہے جسے انہوں نے بشر، ہمسفر، مسافر، راہبر، مکین، ساتھی، منصف، عادل، شخص اور انسان کے الفاظ سے پکارا ہے۔

وہ آدمی کے بارے میں ایک معقول رویہ رکھتے ہیں۔اسے فرشتہ سمجھنے کے بجائے خطاؤں کا پُتلا گردانتے ہیں اور اسی معیار پر اس کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں ؎

ماتھے پہ نہ ہو جس کے خطاؤں کی عبارت
اُس خاک کے پُتلے کو بشر کون کہے گا

....

یہ بھی درست نہیں عَنقا ہے آدمی
یہ بھی غلط نہیں کہ انسان مر گیا

....

آدمی خود کو خسارے میں نہ سمجھے لیکن
کل بھی نقصان میں تھا آج بھی نقصان میں ہے

افلاطون سے ایک قول منسوب کیا جاتا ہے ''رٹی رٹائی باتیں نہ کرو، اپنے تجربات بیان کرو کیونکہ علم اسی انداز میں پھل پھول سکتا ہے''۔ سوغزل میں انوار عزمی نے اس قول کو اپناتے ہوئے اپنے تجربے بیان کیے ہیں۔ان کی تمام غزلوں میں ایک نظم وضبط موجود ہے۔انہوں نے ممکنہ حد تک پینترے بازی سے گریز کیا ہے اور قطعی طور پر اپنے تجربات کی بنیاد پر سچی اور کھری غزل کہی ہے، کہتے ہیں ؎

پسند میں نے کیا تجربوں کا پیراہن
تمام شہر حصارِ قبول و رد میں رہا

....

نگاہِ اہلِ سخن میں کھٹک رہے ہیں ہم
سخن میں ہم نے نیا راستہ نکالا ہے

....

اب کاروانِ شعر نئی منزلوں میں ہے
اب کہنہ شاعروں کی بیاضوں میں کیا رہا

....

آواز مری سب سے الگ سب سے جُدا ہے
ہر شعر کے ماتھے پہ مرا نام لکھا ہے

....

نہیں ہیں جس پہ کسی کے نقوشِ پا عزمیؔ
پسند مجھ کو وہی رہ گزر ہے کیا کیجیے

میں نے انوار عزمی کی شاعری میں سہلِ ممتنع کے کمالات دیکھے ہیں۔ اتنے آسان لفظوں میں زندگی کے اتنے مشکل حقائق کو سمو دینا ان ہی کا حصہ ہے۔ اب تک جو اشعار میں نے آپ تک پہنچائے ہیں ان میں آپ کو جا بہ جا اس سلاست کی جھلک ملی ہوگی۔ ان کی غزل اور نظم دونوں ہی اپنی تازگی، بے ساختگی اور سادہ بیانی سے اپنے پڑھنے والوں کے احساس کو جگاتی ہیں۔ ان کے یہاں لفظ کو برتنے کے سلیقے اور خوبصورت علامتی اظہار نے ایک نامانوس سا حسن پیدا کر دیا ہے جو دھیرے دھیرے مانوس ہونے لگتا ہے۔ ان کی غزلوں میں شاعری سے لطف اندوزی کا وصف موجود ہے ؎

انقلاباتِ زمانہ تو دیکھیے
آئینہ پتھر کا ضامن ہو گیا

....

سچائی کا باندھ کر عمامہ
ہر شخص جھوٹ بولتا ہے
جب بھی بستا ہے کوئی شہر نیا
جانے کتنے درخت کٹتے ہیں

....

اہلِ عالم کا ہے عجیب چلن
دل ہیں پتھر کے، آئینے کے بدن

گہری حساسیت انہیں شعر کہنے پر آمادہ رکھتی ہے، اس میں ذاتی زندگی کی تلخیوں کا احساس جا بجا موجود ہے۔ وہ دوسروں کی بے رخی، بے مہری اور بے حسی کا شکار نظر آتے ہیں مگر شکایت کے بجائے انہوں نے ایک بے نیازانہ رویہ اختیار کیا ہوا ہے ؎

بے حسی جامۂ انساں ہے تو حیرت کیسی؟
جیسا موسم ہے یہاں، ویسی قبا چلتی ہے

....

اندھوں کا شہر ہے یہاں پر
کیا قدر بھلا ہو روشنی کی

....

سچائیوں کی ہار ہوئی ہر محاذ پر
عزمیؔ کسی دیار میں یہ سانحہ نہ ہو

....

پھر کہاں پیرہن کہاں اجسام
یہ تکلف اسی صدی تک ہے

انوارعزمی کی شاعری میں زندگی کے مسائل تواتر کے ساتھ آتے ہیں۔ کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ جسم و جاں کے رشتے کو برقرار رکھنا جدید دور میں ایک نہایت مشکل امر ہے۔

تمام عمر اسی آس میں تمام ہوئی
کہ اب نظامِ گلستاں بدلنے والا ہے
بیچ ڈالوں گا میں خود کو عزمیؔ
جب ملے گی مجھے قیمت اچھی

....

دعوتِ فکر ہے اربابِ وطن غور کریں
لوگ کیوں فیصلۂ ترکِ وطن تک پہنچے

ان کے کھاتے میں ایسے مہ وسال بھی ہیں جوانہوں نے خودنہیں گزارے، اوران مہ وسال میں وہ شب و روز بھی ہیں جوانہوں نے خودکو کرائے پر چڑھا کر گزارے ہیں۔ والدین کے انتخاب سے لے کرنسل اورعقیدے کے انتخاب تک ان کی اپنی کوئی چوائس نہیں۔ کچھ عرصہ دوسروں کا مرتب کردہ نصاب پڑھاتے رہے، پھراپنے گھر میںPaying guest کی طرح رہتے ہوئے زندگی بتانے کا ہنر جان گئے۔حتیٰ کہ ایک دن جس طرح کوئی کمرۂ امتحان میں بیٹھا ہو اورآواز سنے "The time is over"،اس بات کا خوداعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اک ایسی نسل سے ہے میرا رشتہ
کسی کی بات جو سنتی نہیں ہے
گزرتا جا رہا ہے وقت لیکن
کسی کو کوئی بھی جلدی نہیں ہے

....

ڈھیر ہو جائے نہ جانے کب مکانِ زندگی
چند اینٹیں گر چکی ہیں جسم کی دیوار سے

....

دوسری دنیا کا ہر منظر نظر آجائے گا
اپنے دل کو اپنی سانسوں کو ٹھہرنے دیجیے

شاعرسچائی کا انکشاف کرتا ہے۔ وہ پیغمبرہی ہوتا ہے،خواہ اس کی ٹوپی میں آسمانی پُھندنا ہو یا نہ ہو۔''حروف کی سوغات'' ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جوآج کی ادبی صورتِ حال کے بعض گوشے ہمارے سامنے لاتا ہے۔مثلاً ادب ذات فروشی کا نام ہےاورہُنر مفادات حاصل کرنے کی صورت۔آدمی اورآدمی کے درمیان فاصلے بڑھتے جارہے ہیں اوراديب نے مقامِ ذات کی

تقدیم وتاخیر کے چکر میں ادب کی اساسی حرمت کوفراموش کردیا ہے۔ جب منافقت ہنر بن جائے تو جذبہ کیوں نہ اپنے آپ سے شرمائے۔

کہنا پڑا ہے آج اسے میرِ کارواں
جو شخص میرے نقش قدم چومتا رہا
اہلِ دنیا نے مرے فن کو سراہا لیکن
چند پتھر بھی مرے شیشۂ فن تک پہنچے

انوارعزمی نے اپنی شاعری کا سفر چُپ دریا کی طرح جاری رکھا جس کی گہرائی کا اندازہ دُور سے نہیں کیا جاسکتا۔

''حروف کی سوغات'' کی پہلی غزل سے آخری شعر تک انوارعزمی کی شاعری ایک دائرہ بناتی چلی جاتی ہے۔ ان کی غزل کی ابتدا فنی رکھ رکھاؤ اور رموز وعلائم کو اپنے اندر سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے انداز میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ وارفتگی، بےساختگی، تازگی اور شگفتگی ''حروف کی سوغات'' کی غزلوں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ اس طرح ہرغزل یا ہرغزل میں کوئی سا شعر زندگی کے بارے میں کیف وانبساط کی تصویریں بناتا چلا جاتا ہے۔

عزمیؔ یہ منصفوں کا کرم ہے کہ آج تک
ہونا تھا جن کو زینتِ زنداں، نہیں ہوئے

....

پہچان تو جائیں خود کو لیکن
حائل ہے فصیل آگہی کی

....

یہ جان کر بھی سرد مزاجی نہ ترک کی
ٹھنڈی ہوا ہے گرم ہوا کے دباؤ میں

انوارعزمی معاملہ بندی میں کھلتے ہیں۔ وہ معاملاتِ عشق کی فوٹوگرافی میں کامیاب ہیں۔

منظر کشی اور سراپا نگاری میں ابھرتے ہیں۔ جوانی کا نوحہ کرتے ہیں، بڑھاپے سے خائف ہیں۔ وصل اور ہجر دونوں سے مزا لیتے ہیں۔ وہ احساس کے نقاش ہیں۔ جوجذبہ ابھرتا ہے اسے من وعن پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بعض اوقات صوت کے عجیب وغریب تجربے ملتے ہیں۔ وہ اشعار میں الفاظ کے بعض ایسے جوڑے بناتے ہیں جن سے حُسن میں اضافہ ہوجاتا ہے ؎

بڑی دلچسپ ہے میری تمنا
بڑھاپے میں کھلونے چاہتا ہوں

....

پڑی ہیں بستیاں تاریک لیکن
چراغاں ہو رہا ہے مقبروں پر

....

ہم شکارِ غمِ دوراں ہیں تو شکایت کیسی
دھوپ کی زد میں تو ہر ایک شجر آتا ہے

....

نکہتِ گُل کی طرح عمرِ گذشتہ کی طرح
پھر یہاں لوٹ کے آنا نہ تجھے ہے نہ مجھے

انوار عزمی نے اپنی نظموں میں ذات کے رشتے سے پائے گئے دکھوں اور واقعات کی تلخ پرچھائیوں کو بڑے بھولپن سے اجاگر کیا ہے اور وہ اس صنف میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی بیشتر نظمیں بیانیہ ہیں، اسی لیے بعض مقام پر سپاٹ ہوجاتی ہیں، مگر طرزِ کلام کی رنگینی اس عیب کو ڈھانپے رکھتی ہے۔ ہر حال اور ہر واقعہ ایک کیفیت اپنے ساتھ لاتا ہے اور آئینہ اگر زنگ آلود نہیں تو عکس پذیر ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔

''چھوٹا سا کام''، ''تدبیر ووصال''، ''تجدیدِ عشق''، ''حق دار'' اور ''پروں کے رنگ'' اتنی عمدہ، اتنی بھرپور اور نہایت نازک لمحوں پر اتنی باکمال گرفت کی نظمیں ہیں کہ جو شخص اردو نظم سے مایوس ہونے لگا ہوا سے صرف یہ نظمیں پڑھوا دیجیے تو وہ اپنا خیال بدل دے گا۔ ان کی نظم ''چھوٹا سا کام''

ایک ایسی نظم ہے جیسے کسی نے تعویذ لکھ دیا ہو۔ ان کی نظموں میں نارسائی کا شدید احساس ہے۔ یہ نارسائی محبوبہ تک محدود نہیں بلکہ اپنے دور کی معاشرتی الجھنوں اور زر پرست معاشرے کے بے رحم رویوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ مجھے یقین ہے اگر انہوں نے نظموں کی بنیاد پر اپنے آئندہ شعری رویّے کو استوار کیا تو وہ بہت جلد اپنے لیے ایک منفرد مقام پیدا کرلیں گے۔ مثال کے طور پر ''تجدیدِ عشق'' کی لائنیں سنیے:

اور پھر یہ ہوا کہ قسمت نے
دوسرے کا بنا دیا اس کو
غم تو مجھ کو بہت ہوا لیکن
ٹوٹ پائی نہ آس کی ڈوری
اور پھر ایک دن بہ مجبوری
میں بھی تجدیدِ عشق کر بیٹھا
عہد و پیماں کیے تھے جو ہم نے
اب کہاں ان کی یاد تازہ ہے
جاں سے گزرا نہ عشق میں کوئی
میں بھی زندہ ہوں وہ بھی زندہ ہے

''حروف کی سوغات'' کا سرورق بلیغ اور خوبصورت ہے۔ اس کے سارے رنگ بولتے ہیں۔ ''ضمیر کے قدموں کی چاپ'' اگرچہ پیشِ حرف کے طور پر ہے لیکن یہ بھی کسی ایک خوبصورت انشائیے سے کم نہیں۔

ان کی شاعری کا کلیدی لفظ آدمی ہے جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، جو انہوں نے اپنی غزلوں میں 45 مرتبہ استعمال کیا ہے۔

اس کے بعد جن الفاظ کی تکرار ہے وہ ہیں: گھر، آئینہ اور عشق۔ گویا ان کی شاعری کا محور آدمی، گھر، آئینہ اور عشق ہیں۔

شاعر عموماً شراب کا ذکر اپنی شاعری میں بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں لیکن انوار عزمی

کی تمام غزلوں میں صرف ایک شعر میں شراب کا ذکر ہے۔ حتیٰ کہ پانی کا ذکر بھی انہوں نے صرف ایک بار ہی کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ موصوف پیے پلائے ہیں اور جنہیں پانی کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

میں نے ''حروف کی سوغات'' کی ساری غزلیں اور نظمیں پڑھی ہیں۔ اگر انتخاب اور کڑا ہوتا تو کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا۔ خصوصاً غزلوں کے انتخاب میں فراخ دلی سے کام لیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر انوار عزمی کے اشعار خواہ وہ حمد سے، نعت سے، غزل سے یا نظم سے تعلق رکھتے ہوں، اپنی فنی کیفیت میں سادگی، معصومیت، شستگی اور ایک گونہ جمالیاتی دلکشی سے معمور ہیں۔ وہ فن کارانہ چابک دستی اور کمالِ احتیاط سے شعر کو موزوں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ارتقاء پذیر ہے اور آنے والے دور کے لیے ہم ان سے بڑی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔

....

☆☆☆

(حروف کی سوغات کی افتتاحی تقریب میں پڑھا گیا۔ مقام: آرٹس کونسل کراچی)

آئینۂ حیرت کا شاعر ... مرتضیٰ صدیقی

شعر کی دنیا آ بگینے کی طرح بڑی نرم و نازک ہوتی ہے، لہٰذا اچھا شعر کہنے کے لیے دونوں جہان ہارنے پڑتے ہیں۔ اس وقت مرتضیٰ صدیقی حیرتؔ کا مجموعہ کلام ''آئینۂ حیرت'' موضوع گفتگو ہے۔ میں یہ بھی وضاحت کردوں کہ نہ یہ میرا منصب ہے اور نہ ہی میں اپنے آپ کو اس کی اہل سمجھتی ہوں کہ ان کی شاعری پر کوئی حکم لگا سکوں۔ یہ کام میں مستند نقادوں کے لیے چھوڑتی ہوں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ مرتضیٰ صدیقی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ایک حساس آدمی کی طرح وہ اپنے ماحول سے پوری طرح باخبر ہیں اور روز بروز ابتری کی طرف جاتے ہوئے حالات اور شہر میں بڑھتی ہوئی افراتفری اور دہشت وخوف کی فضا سے بھی وہ دکھی اور مایوس ہیں۔ کہتے ہیں کہ

وہ پوچھتے کیا ہو کیوں نالہ کناں ہے حیرتؔ
ہر طرف دورِ خزاں ہے اسے اب کیا کہیے
مرہم دل کے لیے زخمِ جگر کی خاطر
آپ لائیں گے طبیبوں سے نمکداں کب تک

جب آپ کسی شخصیت کے حصار میں ہوں تو حقائق کا ادراک اور مکمل معروضیت ایک غیر ممکن بات ہے۔ بالخصوص اگر وہ شخصیت مسحور کن ہو اور اُس سے آپ کی رشتے داری بھی ہو اور اسے آپ نے نہایت قریب سے ایک جیتے جاگتے انسان کے طور پر دیکھا ہو۔ آج ایسی ہی ایک آزمایش مجھے درپیش ہے، اتنی قربت ہو تو نظر دھندلا ہی جاتی ہے۔

مجھے ان کا یہ مجموعۂ کلام ان کی صلاحیت اور تخلیقی شعور کا سب سے سچا نقش معلوم ہوا۔ ان کا اسلوب بڑا سادہ ہے۔ انہوں نے جو کہنا چاہا سادہ اور سلیس انداز میں کہہ دیا۔ ان کی اس سادہ بیانی میں اپنا ایک حسن ہے، اپنا ایک انداز ہے، اپنی ایک جہت ہے جس نے شعر کو اندر سے نیا پن عطا

کیا ہے ؎

دیکھ کر یہ تلون مزاجی
ہم تو چُپ ہیں کہیں تم سے اب کیا

''کہیں تم سے اب کیا'' عام فہم اور روزمرہ ہے، لیکن کہیں تم سے اب کیا نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

سب مسافر ہیں راہِ عدم کے
ہارون کا یہ عیش و طرب کیا

یہ شعر بے ثباتی اور بے حاصلی کا ترجمان ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے ؎

فسانہ تم سے کہہ کر دل کو کیا آرام ہونا تھا
خموشی کی زباں سے گفتگو کا کام ہونا تھا

''آرام ہونا'' کی ترکیب بھی اپنی جگہ خوب ہے لیکن کیا خاموشی گفتگو سے زیادہ سنگین نہیں ہوتی؟

میرے نزدیک ان کا یہ شعر کامل ترین بلاغت کا نمونہ ہے، جہاں خموشی اور گویائی یک جا ہو رہی ہیں۔

ایک اور خاص خوبی جو آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے ایک ترکیب کو معکوس کر کے معنویت میں بلندی یا زور پیدا کر دیا ہے، جیسے

کہوں میں کچھ مگر تیرا سکوتِ ناز کیا کہنا
نہ کچھ سننے کا نہ کچھ کہنے کا یہ انداز کیا کہنا

تم نے اچھا کیا نہ پوچھا حال
ورنہ اور کچھ سر میں درد ہوتا

کیا لطیف طنز ہے۔ اس شعر میں لطفِ بیان بھی ہے اور لطفِ زبان بھی۔

انسان اس دنیا میں ایک بلبلے کی مانند ہے جس کے بننے اور بگڑنے میں جتنے سیکنڈ کا وقفہ لگتا ہے وہ اس کی عمر خیال کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ عمل کی فرد جو تھی کہیں مرے سوزِ غم سے جل گئی
ہے کرم کا اب ترے آسرا نہ حساب ہے، نہ کتاب ہے

....

سنا ہے حیرتؔ بھی بخشے گئے ہیں
سرِ حشر رحمت کی یہ بے حسابی

ان اشعار کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ پوری طرح محسوس کر کے کہا گیا ہے۔لفظ و معنی کی مکمل ہم آغوشی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ایک معصوم انسان کی زندگی کی تفسیر ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا تھا ؎

مت پوچھ کہ ہم ضبط کی کس راہ سے گزرے
یہ دیکھ کہ تجھ پر کوئی الزام نہ آیا

مرتضیٰ صدیقی کا کہنا ہے ؎

ہے نیازِ عاشقی میں یہی ضبطِ غم کا حاصل
کہ لگی ہو آگ دل میں نہ اٹھے مگر شرارا

......

ضبطِ غم کیجیے تو یہ حال ہے کہ دم گھٹتا ہے
حالِ دل کہیے تو اندیشۂ رسوائی ہے

خیال نیا نہیں ہے مگر اندازِ بیان نے اشعار میں لطف پیدا کر دیا ہے۔ان سیدھے سے اشعار میں زبان کی لطافت نے ضرب المثل بننے کی قوت پیدا کر دی ہے۔

لبوں پر مسکراہٹ کی ادا اک تیر بنتی ہے
یہ ابرو کی کھچاوٹ آنکھ میں شمشیر بنتی ہے

ابرو کی کھچاوٹ اور آنکھ میں شمشیر بالکل نئی تراکیب اردو تشبیہات ہیں۔یہ شعر محبوب کی ذات کا بولتا ہوا صحیفہ ہے۔

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

اس کے برعکس مرتضیٰ صدیقی کہتے ہیں ؎

یوں مہر بہ لب کیوں ہیں جب دونوں مقابل ہوں
اے عشق چہ می گوئی اے حُسن چہ فرمائی

وہ غالبؔ کی طرح نہ صرف زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں بلکہ انتہائی مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مثلاً

کٹ رہی ہے شبِ تاریک بہ امیدِ سحر
نہ ہوئے صبح کے آثار تو پھر کیا ہو گا
بس یہی ہو گا کہ ہو ابرِ کرم کی بارش
ہے جو حیرتؔ کے گنہگار تو پھر کیا ہو گا

''تو پھر کیا ہوگا'' کے الفاظ کی تکرار نے خوب رنگ جمایا ہے۔ آپ محسوس کیجیے ان اشعار میں کتنا درد اور کتنی سچائی ہے۔

ان کی شاعری میں حقیقت کی تلخی ہے، مثلاً ؎

لوگ اس فرصتِ دو روزہ کو سمجھے کیا ہیں
جس سے پوچھو اُسے کچھ کارِ جہاں باقی ہے
دردِ دل کم نہ ہوا تم نے کیا لاکھ علاج
وہ بھی کر دیکھو جو اے چارہ گراں باقی ہے

....

یہ چاکِ دل ہے جو تارِ نفس سے اُلجھا ہے
یہ پیرہن تو کبھی قابلِ رفو نہ ہوا

....

اے آتشِ عشق اب تو بس کر
شعلہ سا اٹھا دل و جگر سے

....

سمجھا نہ کسی نے کس کی ہوئی رسوائی
منصور تماشا تھے خلقت تھی تماشائی

کسی نے سچ ہی کہا ہے: تماشائی نہ بن، تماشا بن جا۔

مختصراً یہ چند پہلو تھے ان کی شاعری کے، جن کی طرف مطالعے کے دوران میری نظر گئی۔ میری رائے اردو ادب کے محض قاری کی حیثیت سے ہے۔ حرف حرف خوشبو لُٹاتا ہوا وہ شخص بساطِ ادب سے اٹھ گیا۔

ایسے لوگوں کو چھینتی ہے موت
کتنی مردم شناس ہوتی ہے

☆☆☆

وقت ختم ہو گیا... حسین امیر فرہاد

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نے ہجرت کی تھی اور مجھے نہ ہجرت کے معنی معلوم تھے نہ میں صحیح تلفظ کے ساتھ اس لفظ کو ادا کر پاتی تھی۔ ہمارا کنبہ بڑے بھائی جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ نئی نویلی بھابھی، اماں اور ہم چار بہن بھائیوں پر مشتمل تھا۔

ایک چھوٹا کمرہ بھائی اور بھابھی کا تھا۔ درمیان کے قدرے بڑے کمرے میں گھر بھر کے لوگوں کے مختصر سے سامان کے ساتھ کونے میں اماں کی چار پائی تھی۔ اور تیسرے کمرے میں ہم چار بہن بھائی تین چار پائیوں پر مل کر سوتے تھے۔ صبح ایک چار پائی کھڑی کر دی جاتی اور بستر لپیٹ کر کونے میں رکھی کرسی پر رکھ دیا جاتا یوں چلنے پھرنے کی جگہ بن جاتی۔

رات میں لالٹین جلانے کا پورا اہتمام ہوتا جب اس میں تیل ڈالا جاتا اور اور کے گول دونوں طرف سے کھلے شیشے چمکائے جاتے اور یہ کام گھر کے بڑے لوگ کرتے تب میں سوچتی اس مختصر سے گھر معمولی بستر اور ضروریات کی بیشتر چیزوں سے محروم ہو کر ہم یہاں کیوں رہ رہے ہیں؟ ہم اپنا پرانا گھر یاد کرتے۔ درجنوں کمروں والا گھر، جس کا بڑا سا پھاٹک تھا۔ جہاں کئی ملازم دن بھر بیٹھے حقہ پیتے، بازار سے سودا لاتے۔ گھر کے اندر کئی عورتیں اور بچے کام کرتے۔ ہمارے گدے تکیے بڑے آرام دہ ہوتے۔ بہت سارے کپڑے اور جوتے ہماری ملکیت تھے۔ اچانک پانی کے جہاز پر بیٹھ کر آٹھ دنوں کے سفر کے بعد ہم اس گھر میں کیوں آ گئے؟ دو تین بکس اور ایک بستے میں چند کتابیں پنسل اور غلط لکھے گئے حروف مٹانے کے لئے ربڑ ڈال کر۔ لوگ اسے ہجرت کہتے تھے۔ ہم نے بھی اسے ہجرت مان لیا تھا۔ مگر ہجرت کی ضرورت کیا تھی؟ اور اس میں ہمارا کیا فائدہ تھا؟ یہ سوال میرے ذہن میں ہر وقت گردش کرتا رہتا۔

اُن دنوں میں ایک ہندسے کی جمع تفریق کے سوال حل کرنے میں بھی غلطی کر جاتی۔ ضرب تقسیم کے سوالات میرا انتظار ہی کر رہے تھے۔ انگریزی کچھ کچھ اور اردو زیادہ اچھی پڑھ لیتی تھی

رسالہ کھلونا اور تعلیم وتربیت اٹک اٹک کر پڑھتی اور عزم یہ تھا کہ ایک دن اس میں میری بھی کہانیاں ضرور چھپیں گی۔

میری عمر کے بچے یقیناً نہ یہ رسالہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھنے کا ایسا عزم رکھتے تھے۔سو مجھ پر خاصی توجہ دی جاتی یہ جان کر کہ میں ایک دن ضرور ''قابل'' لڑکی ثابت ہونگی مجھے لوگوں کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت کرنے کی نہ جلدی تھی نہ ضرورت کہ ابھی تو میرے ذہن میں بہت سارے سوال تھے جو مجھے ہر وقت الجھائے رکھتے اور میں جلد از جلد اور ہر قیمت پر ان کے جواب جاننا چاہتی تھی۔ بھائی بھابھی اس کا جواب کیوں دیتے کہ وہ تو مجھے ہجرت کے خود ہی مجرم نظر آتے۔ بڑی بہن کے اپنے کچھ سوالات تھے وہ ان ہی میں الجھ کر رہ گئیں تھیں۔چھوٹے بھائیوں پر مجھے رشک آتا کہ وہ سوچنے سمجھنے اور کسی سوال کو ذہن میں پالنے کے ابھی قابل ہی نہیں ہوئے تھے۔رہ گئیں اماں اُن کی دو جلتی بجھتی آنکھوں میں بھرے آنسو وہ لاکھ چھپائیں مگر مجھے نظر آجاتے اور پھر میں ان سے اتنے کڑے سوال پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اُن ہی دنوں بھری دھوپ میں اچانک حسین (حسین امیر فرہاد) ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور یوں گھل مل گئے جیسے ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کون ہیں، اب تک کہاں تھے اور اب کیوں آگئے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ گھر کہ ٹھہرے ہوئے ماحول میں ہِل جُل پیدا ہو گئی۔ بڑے بھائی گھر کی بہت ساری ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔ بھابھی ضرورت کی چیزیں بازار سے ان ہی سے منگوانے لگیں۔ باجی اپنے کپڑوں پر استری بھی ان ہی سے کروالیتیں اور اپنی بکھری ہوئی کتابوں کی ترتیب بھی ان ہی سے کرانے لگیں۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے ان کے دونوں کندھوں کو اپنے لئے مخصوص کرلیا۔اور اُن کے ساتھ پوری کالونی کا چکر کاٹ کر گھر آجایا کرتے۔ ہاں میں نے جمع تفریق کے بڑے بڑے سوال بھی جلد ہی سیکھ لیے اور اب ضرب تقسیم پر آگئی تھی کیونکہ انہوں نے میرے ہر وقت کے لکھنے پڑھنے کی عادت کے سبب مجھ پر توجہ دینی شروع کردی تھی۔

اماں جب ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر بستر پر آجاتیں تب وہ ان کے پاس پلنگ پر بیٹھ جاتے۔ اماں جھوم جھوم کر نعتیں پڑھتیں اور وہ سبحان اللہ کے ورد کے ساتھ ان کے شریک بن

جاتے۔ پھر جب اماں کروٹ بدل لیتیں تب وہ سمجھ جاتے کہ اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی ہیں اور اب وہ انہیں چھپانا چاہتی ہیں۔ تب وہ پائینتی پر بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگتے۔ اماں سو جاتی یا سوتی بن جاتیں تب وہ ان پرزوں کو جمع کرتے جن میں نمک، ہلدی، مرچ اور دیگر چیزیں آتی تھیں۔ انہیں شیشی میں ڈال کر وہ ان پرزوں کو پڑھنے کے لیے جمع کر لیتے تھے کہ ان دنوں پرانی کتاب یا اخبار پھاڑ کر پڑیا میں چیزیں آیا کرتی تھیں۔ ان کی یہ حرکت ظاہر کرتی کہ وہ پڑھنے کے بے حد شوقین تھے وہ دل میں انہیں پڑھتے اپنے ذہن کی جلاء کے ساتھ ساتھ اپنی فرضی کہانیوں میں ڈھال کر رات میں مجھے سناتے۔ کہانی سننے کا مجھے بے حد شوق تھا اور جانے کیسے انہوں نے میرا یہ شوق جان بھی لیا تھا۔ غرض حسین ہم سب گھر والوں کی ضرورت بن چکے تھے جلد ہی انہوں نے گھر میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔

ہم تو یہ جانتے تھے کہ وہ دالان میں بچھی چارپائی پر سوتے ہیں لیکن کب سوتے اور کب اٹھتے؟ ہمیں اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ہم کہانی سنتے سنتے اور اکثر پڑھتے پڑھتے سو جاتے شاید تب وہ چپکے سے ہمارے کمرے سے باہر چلے جاتے اور ساتھ ہی لالٹین کی روشنی بھی دھیمی کر جاتے۔ صبح ہمارے اٹھنے سے پہلے لالٹین بجھی ہوتی اور دالان کے کونے میں رکھی جا چکی ہوتی اور حسین کا بستر تہہ ہو کر کھڑی کی گئی چارپائی کے پائے پر لٹکا ہوتا اور حسین نہا دھو کر آنے والے دن والے دن کے استقبال کے لیے تیار ملتے۔ بھائیوں کے منہ دھلانے میں مدد کرتے، بڑی بہن کے بستر کو تہہ کر دیتے۔ میری چیزیں انہیں چھونے کی اجازت نہیں تھی کہ میرا بستر دن بھر بچھا رہتا اور رسالے، کتابیں، ربڑ، پنسل، تکیے کے نیچے بہ حفاظت رکھی رہتیں۔

اماں اور بھابھی کے ساتھ ناشتہ کھانا بنانے اور سب کو کھلانے میں پیش پیش ہوتے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ان سے کبھی کوئی کام کہا گیا ہو۔ انہوں نے ازخود اپنے کاموں کا یقین کر لیا تھا۔ چائے بنا کر ہر ایک کو پلانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہم نے انہیں خود بھی شوق سے چائے پیتے دیکھا تھا لیکن کھانا وہ کب کھاتے اور کتنا کھاتے یہ ہم کبھی جان نہ پائے اور شاید ان دنوں ہم یہی سمجھتے کہ انہیں کھانا کھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ انہیں تو بس لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے ہر صفحے سے عشق تھا۔ وہ بڑی توجہ سے پڑھتے اماں کے دینی رسالے جس کا نام آستانہ تھا اور دہلی سے آتا تھا اس کا

ایک ایک صفحہ پڑھ جاتے ۔اماں سے مذہبی مسائل پر سیر حاصل گفتگو بھی کرتے ۔اماں بس اس دم تازہ ہو جاتیں اور بے تکان بولتیں ۔حسین باقاعدگی سے ان کا ساتھ دیتے اور پھر ان کی شرارت کی عادت زور پکڑتی ۔وہ کوئی نہ کوئی اختلافی بات کر جاتے اماں پہلے تو انہیں گھور کر دیکھتیں وہ آگے بڑھتے جاتے تب گناہ اور بے ادبی کا احساس اماں کو بدلہ لینے پر اکساتا ۔وہ ہاتھ سے جھلنے والا پنکھا سنبھال کر اس کی ڈنڈی ان کی طرف کر کے پیچھا کرتیں وہ کمرے سے دالان اور پھر صحن میں پھلانگ جاتے اماں تھک ہار کر پلنگ پر بیٹھ جاتیں تب وہ ان کے پائینتی بیٹھ کر پیٹھ حاضر کر دیتے اور پنکھے کی مار کے آرزومند ہو جاتے ۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوتی ۔ مجھے بس اس ایک لمحے حسین بہت اچھے بہت قیمتی اور گھر کے لیے بہت ضروری محسوس ہوتے کہ ان کی بدولت اماں میں زندگی کی توانائی آ جاتی ۔ان کے مرجھائے چہرے پر زندگی کی رمق نظر آ جاتی ۔حسین کی شرارت کے بدلے اماں کی آنکوں کی چمک اور چہرے پر پہلی سرزنش مجھے ہر چیز سے زیادہ اچھی لگتی اور بس اس ایک لمحے میں اپنی چھوڑی ہوئی گڑیا، ڈھیر سارے کھلونے ،وسیع وعریض آنگن ،اپنی پالتو بکری اور مرغی تک کو بھلا دیتی جسے میں دور کسی شہر میں بلاوجہ چھوڑ آئی تھی صرف پانی کے جہاز پر بیٹھ کر سفر کرنے کے مزے کی خاطر جس کی میں نے تمنا بھی نہیں کی تھی ۔

حسین مجھے اس لئے بھی اچھے لگتے کہ وہ علی الصباح دودھ والے سے جب پتیلی میں دودھ لیتے تب میری سفید بلی کے لئے اس کے لئے مخصوص برتن میں دودھ لینا نہیں بھولتے ۔بلی کا یہ حصہ اس طرح مفت ملتا جیسے گوشت کے ساتھ چھیچھڑے اور سبزی ترکاری لینے پر دھنیا، پودینہ اور مرچیں مفت تھیلی میں یا ٹوکری میں ڈال دی جاتیں ۔اب تو چھیچھڑے بھی پیسوں سے آتے ہیں ۔

حسین جب ہمارے گھر کی ضرورت بن گئے تب ایک رات کے بعد جو صبح طلوع ہوئی ہو وہ ہمیں انتہائی پریشان اور غمزدہ کر گئی ۔حسین کا بستر اسی طرح تہہ تھا اور چارپائی کے پائے پر رکھا ہوا تھا۔ہم سب اٹھ چکے تھے مگر حسین گھر میں موجود نہیں تھے ۔اماں کو سودا منگوانا تھا۔باجی کو اپنا بستر خود تہہ کرنا پڑا تھا۔دونوں بھائی حسین کے ساتھ کالونی گھومنے کے منتظر تھے ۔بڑے بھائی پریشان تھے اور دفتر جا چکے تھے اور سب کو ہدایت کر چلے تھے گھر کی تمام چیزوں کو دیکھا جائے کہ

کون سی چیز کم ہے۔ انہوں نے یہ جملہ اٹک اٹک کر ادا کیا تھا کہ یہ ان کا بھروسہ ٹوٹنے کا بھی تو سوال تھا۔ بھابھی ابھی تک چائے کی منتظر تھیں۔ اماں اپنا اکلوتا ہتھیار پنکھا ہاتھ میں لئے اسے بغور تک رہی تھیں کہ اب وہ کیسے دوڑا کر ماریں گی اور کون اپنا نام حضرت حسین بتا کر اماں کے غضب کے دائرے میں آئے گا۔ حضرت حسین تو اس گھر سے جا چکے تھے۔

دن گزرا اب تو دوسری رات بھی گزر گئی۔ حضرت حسین واپس نہیں آئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب نے اپنی چیزیں کھنگالیں۔ سب کچھ موجود تھا بلکہ میرے سرہانے رکھے ہوئے رسالوں میں ایک رسالے کا اضافہ بھی تھا۔ جس پر لکھا تھا 'منی باجی کے لئے حسین کی طرف سے' وہ گھر میں اپنے سے ہر چھوٹے کو بھائی اور باجی کہتے۔ اماں تو اماں ہی تھیں۔ بھابھی اور بھائی جان ان کے بھی ویسے ہی تھے جیسے کے ہمارے۔

معمہ تھا کہ حل ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ حسین کیوں چلے گئے اور کہاں چلے گئے میں کچھ یوں سوچ رہی تھی کہ وہ آئے ہی کیوں تھے؟ شاید اس لئے کے میرے جمع تفریق کے سوالوں کو مضبوط بنا دیں۔ ساتھ میں ضرب تقسیم بھی سکھا دیں کہ دنیا میں جینے کے لئے یہ چاروں سوال ضروری ہیں۔ یا شاید اس لئے آئے تھے کہ کہانیاں پڑھنے میں اصلاح کر دیں۔ بلی کے دودھ کی ذمہ داری نبھا لیں یا شاید اماں کے چہرے پر اپنے اختلافی نوٹ کے ذریعے زندہ رہنے کی رمق دوڑا دیں؟ سوال سوال ہی رہا۔

دن رات تو گزر ہی جاتے سو گزرنے لگے کہ ایک صبح ڈاکیہ ایک لفافہ لے کر آیا۔ یہ کسی دوسرے ملک کا لفافہ تھا اس میں رکھا خط حسین کا تھا۔ مضمون کچھ یوں تھا۔ میں آپ سب سے معافی کا خواستگار ہوں کہ بغیر بتائے گھر چھوڑ آیا۔ بتانے کی ہمت کی مگر ہار گیا۔ مجھے یہاں ایک اچھی ملازمت مل گئی ہے شاید زندگی گزارنے کا سامان ہو جائے۔ آپ سب نے مجھے اپنا پن دیا میں آپ لوگوں کو زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گا۔ ہر ایک کے لئے ایک ایک جملہ تھا۔ اماں آپ کا پنکھا یاد آئے گا، میرے دونوں کاندھوں پر دونوں منے بھائیوں کا وجود محسوس ہوتا ہے۔ بڑی باجی کی کتابیں درست کرتے ہوئے اور کپڑوں پر استری کرتے وقت بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی، بھابھی کو ستانے اور چائے پلانے کا لطف ہی کچھ اور تھا، بھائی جان سے پہلے بھی ڈرتا تھا آج بھی

ڈرتا ہوں۔ ڈرنے سے زیادہ ان کی عزت کرتا ہوں اور مشکور بھی ہوں کہ انہوں نے اپنا گھر اور اپنے رشتے مجھ سے بانٹ لئے تھے۔ اور کتابوں کے شیلف تک پہنچنے سے مجھے منع نہیں کیا۔ مُنّی باجی سے بھی ڈر لگتا ہے وہ میرے چلے جانے سے بہت ناراض ہوں گی۔ اب بلی کا دودھ کون لے گا اور انہیں کہانیاں کون سنائے گا؟

آخر میں ایک جملہ چونکا دینے والا تھا۔ میں آپ کے گھر سے آتے ہوئے ایک چیز چرا کر لے آیا ہوں۔ اس چوری پر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ منی باجی کے البم سے ایک گروپ فوٹو نکال لی ہے جس میں گھر کے سب ہی لوگ ہیں کہ مجھے ان کے چہرے کے نقش و نگار بہت یاد آئیں گے۔

سب لوگ خط پڑھ کر خوب روئے۔ پھر سب نے حسین کو اس کی اس جذباتی چوری پر معاف بھی کر دیا جو چوری ہم پکڑ بھی نہیں پائے تھے۔

آج اس بات کو آدھی صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ حسین اب حسین امیر فرہاد بن کر اپنے وطن واپس آ گئے ہیں۔ اپنا رسالہ جاری کئے ہوئے ہیں۔ لکھنے لکھانے میں بہت آگے جا چکے ہیں۔ مذہبی بحث چھیڑا کرتے ہیں۔ بات ہمیشہ اختلافی کرتے ہیں۔ اماں کا پنکھا گم ہو چکا ہے اور وہ اپنی چارپائی پر بھی موجود نہیں ہیں۔ حسین کو اب اماں کی مار کا بھی ڈر نہیں ہم سب سے انہوں نے رشتہ بحال کر لیا ہے۔ سب نے انہیں معاف کر دیا لیکن میں آج تک انہیں معاف نہیں کر پائی۔ ۔ اپنے البم سے ایک تصویر کی چوری پر نہیں بلکہ اس رات ذہن میں شدت سے ابھرتے ہوئے اس سوال کے باعث کہ جب میں آدھی رات کو بے چینی سے بیدار ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی حسین نے مدھم کر دی تھی اور وہ دالان میں اپنے بستر پر اطمینان سے سو بھی رہے تھے۔ میں نے ذہن میں کلبلاتے اس سوال سے وعدہ کیا تھا کہ صبح ہوتے ہی میں اس سوال کا جواب حسین سے حل کرالوں گی اور ہمیشہ کے اس سوال کے جبر سے آزاد ہو جاؤں گی۔ مگر اس صبح حسین غائب تھے اور وہ سوال جسے میں نے حل کرانے کا وعدہ کیا تھا آج تک اسی طرح موجود ہے۔ میں نے کسی حسین سے اس کا جواب نہیں مانگا۔

وہ صبح میری زندگی کی بہت کڑوی صبح تھی جسے حسین نے اور بھی کڑوا بنا دیا تھا۔ اسی لئے میں

نے حسین کو آج تک معاف نہیں کیا ہے۔ میں اس کا بھیجا رسالہ پڑھ لیتی ہوں اس سے فون پر بات بھی کر لیتی ہوں اب اس کا مسودہ میرے پاس آیا ہے میں اس پر انتقاماً کچھ نہیں لکھوں گی۔ وہ جائے کہیں اور جا کر اپنی تحریر پر کسی سے بھی کچھ لکھوا لے اس کے لئے یہی سزا ہے۔ ہے بھی یا نہیں مجھے اس سے غرض نہیں کہ میرا وہ سوال جو اس صبح اس سے کرنا تھا آج بھی حل طلب ہے۔

کیا ہجرت ہم پر فرض تھی؟

مجھے غلط نہ سمجھا جائے کہ ہجرت کے عوض اپنا گھر، عیش و آسائش چھوڑنے کا مجھے دکھ نہیں۔ مجھے تو ابا کا وہ دو گز کا کچا مکان چھوڑ آنے کا دکھ ہے جس پر ان کا سالِ پیدائش اور سالِ وفات درج ہے اور جہاں کھڑے ہو کر آج تک میں نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی ہے۔ ہجرت کے عوض مجھے یہ کرب قبول نہیں تھا۔ نہیں ہے۔ اگر حسین برسوں پہلے مجھے ہجرت کا اور آسان سا اپنی عادت کے مطابق کوئی شگفتہ سا جواب دے دیتے تب میرے بچپن کا کچا ذہن اسے قبول کر چکا ہوتا اور وہی ذہن آج تک میرے ساتھ ساتھ ہوتا اور کرب کب کا میرا پیچھا چھوڑ چکا ہوتا۔ وہ کرب تو آج بھی موجود ہے۔ شکایت آج بھی اپنی جگہ ہے۔ میں حسین کو کیسے معاف کر سکتی ہوں؟

☆☆☆

صلیب کے زخم اور مجنوں صاحب

یہ 1973ء کی بات ہے۔ میں نے ایک ناول لکھا۔ دل چاہا کہ وہ لاہور سے شائع ہو مجھے کسی ایسے ناشر کے بارے میں معلومات نہیں تھی کہ جسے میں مسودہ بھیجتی میں ایک بک اسٹال پر گئی۔ کئی ایک ناول کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک کتاب اچھی چھپی ہوئی تھی- مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور۔ میں نے ناشر کا انتخاب کرلیا تھا۔ گھر آئی دو لائن کا ایک خط لکھا۔

''جناب والا مجھ سے ایک حماقت ناول کی صورت میں سرزد ہوگئی ہے کیا آپ اسے چھاپ سکیں گے۔''

محترم کلیم نشتر کا جواب مکتبہ عالیہ سے جلد ہی موصول ہوا۔

''محترمہ! ہم ایسی ہی حماقتوں کو چھاپنے کیلئے یہاں بیٹھے ہیں مسودہ بھیج دیجیے دیکھ کر مزید کچھ عرض کر سکیں گے۔''

میں نے جھٹ مسودہ بھیج دیا۔ چند روز بعد اطلاع ملی۔

''آپ کی حماقت چھپ جائے گی۔'' شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مجھے کم از کم تین عدد اور حماقتوں کو ان کے یہاں سے چھپوانا ہوگا۔ یہ کون سی بڑی یا کڑی شرط تھی ہم نے فوراً مان لی۔ ہم بھلا تین اور ناول کیا لکھ بھی پائیں گے۔؟ نہ لکھیں گے نہ کہیں سے چھپے گا۔

ہمیں اپنی صلاحیت کا پہلے ہی سے علم تھا۔ آخر ہوا بھی تو یہی وہ آج تک اگلی حماقت کا انتظار کررہے ہیں اور ہم اب عقلمند ہو گئے ہیں۔ اب جو مرحلہ درپیش تھا وہ دیباچے کا تھا۔

کلیم صاحب برابر مانگ رہے تھے اور ہم اس سوچ میں تھے کہ لاہور اور پبلشر تو اچھے مل گئے۔ مجنوں صاحب مجھے کیسے دستیاب ہوں گے۔ اور یہ کہ ذہن میں مجنوں صاحب کے علاوہ کوئی جگہ نہیں لے پا رہا تھا۔ مجنوں گورکھپوری اور بس مجنوں گورکھپوری۔ دو ملکوں کا فاصلہ۔ پھر مجنوں صاحب کی لیاقت اور میری حماقت کے درمیان کا بھی فاصلہ۔ معاملہ نمٹے کیسے۔ کئی مہینے گزر گئے

اور ہمارے تعلقات پبلشر سے خراب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مجھے بار بار سمجھا رہے تھے۔ ایک سے ایک بڑے لوگ کراچی میں موجود ہیں کسی کی بھی خوشامد کر لیں۔ مجھے اختیار دیں۔ لاہور میں بڑی بڑی شخصیات موجود ہیں میں لکھوا دوں۔ مگر نوجوانی کی ضد اور خواہش اس کے آگے بھلا کون ٹھہرا ہے یا ٹھہر سکتا ہیں نہیں بس مجنوں صاحب!

واہ رے خواہش کی شدت کہ ایک انہونی ہوگئی۔ مجنوں صاحب نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ پاکستان آ گئے۔ بلکہ کراچی آ گئے۔ بلکہ ناظم آباد آ گئے میں آج تک کہتی ہوں حالانکہ حماقتوں کا زمانہ بھی گزر گیا ہے کہ مجنوں صاحب صرف میرے لئے کراچی آئے تھے۔

میں کسی کو علیگ نہیں مانتی جب تک کہ وہ کسی ایک امتحان میں پاس نہ ہو۔ امتحان کا واحد سوال یہ ہوتا کہ آپ اگر میرے والد یا دادا کو نہیں جانتے تو آپ علیگ ہرگز نہیں۔ یہ امتحان میں ہر علیگ کا لیا کرتی اور نسخہ سو فیصد درست اترتا۔ میں نے حسب عادت پہلی ہی ملاقات میں مجنوں صاحب کو سو فیصد علیگ مانتے ہوئے اپنے دادا اور والد کا نام لیا۔ مجنوں صاحب کی مسکراہٹ اور پھر شفقت نے مجھے ان سے پل بھر میں بہت قریب کر دیا۔ اب مرحلہ تھا اپنے شوق کے اظہار کا۔ میں اپنے بارے میں کسی بھی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی پھر یہ اظہار کیونکر کرتی کہ وہ میرے ناول پر مقدمہ لکھ دیں لیکن مجھے یہ بات ان سے کہنی تو تھی ہی۔ میرے شوق میں کتنا وزن اور میرے اٹکتے ہوئے لہجے میں کتنی لجاجت تھی کہ مجنوں صاحب نے نہ مجھے ڈانٹا نہ شرم دلائی، نہ غصہ ہوئے نہ منع کیا، نہ حامی بھری بس اتنا کہا "ناول دیکھ کر بتاؤں گا۔"

ان کے اس ایک جملے نے شریانوں میں خون کی رفتار تیز کر دی۔ سارے آنسو آنکھوں سے ایک ساتھ ٹپک پڑے۔ لرزتے ہونٹ تھم گئے۔ اپنے لکھے کی شرمندگی البتہ بڑھ گئی۔ "اب کیا ہوگا"

یہ خوف ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اور بڑھ گیا۔

دوسرا دن طے ہوا ان شرائط کے ساتھ:

انہیں ان کے گھر سے اپنے گھر لانا میری ذمہ داری تھی۔ یہ ان کے مطابق وہ فرض تھا جو انہیں میرے خاندان سے واقفیت کی بناء پر اتارنا ہی تھا۔ تھرماس چائے سے بھرا ہوگا، کمرے

میں کوئی تیسرا نہیں ہوگا، چائے کی پیالی خالی نہیں رہے گی اور میں مقابل کی کرسی پر بیٹھ کر درست لہجے اور تلفظ میں انہیں روانی سے سناتی جاؤں گی۔ جہاں چاہوں گا چپ کرادوں گا۔ اُٹھ کر گھر چلا جاؤں گا۔ پھر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ سفارش ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔

شروع کی شرائط نرم مگر آخری بہت گرم اور سخت تھیں۔ لہجہ، تلفظ روانی سب پر ناز تھا خواہ بیجا ہی سہی، مگر پھر بھی یہ ناز ان کے مقابل آنے سے گھبرا اور کترا رہا تھا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور شوق بہرحال اپنی قوت منوا رہا تھا۔

کام شروع ہوا۔ کوئی بھی پڑھا لکھا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک نامی گرامی نقاد، افسانہ نگار، شاعر، استاد، ادیب مقابل ہو ایک ایسے نالائق کے جسے قلم بھی پکڑنا نہ آتا ہو تب صورتِ حال کیا ہوتی ہے۔ نوجوانی کا دور ہو تو یہ نغمہ زبان پر آ ہی جاتا ہے۔

میں بچہ پاکستانی ہوں اور کام کروں گا بڑے بڑے

میری سوچوں میں یہ سب کچھ تھا کہ مجنوں صاحب کی چائے کی ایک پیالی ختم ہوگئی۔

"لڑکی شروع کرو۔"

لڑکی شروع ہوگئی۔ شروع میں آواز کانپی۔ جہالت پر شرمائی پھر ڈھیٹ بن گئی، لہجہ روانی، تلفظ سب کچھ ٹھیک بلکہ مجنوں صاحب کو قابلِ قبول پڑھتے ہوئے کن انکھیوں سے ان کی جانب دیکھتی جاتی اور سوچ لیا تھا کہ چہرے پر برہمی اور اکتاہٹ کے ذرا سے بھی آثار دیکھے تو صفحے سمیٹ لوں گی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ چائے کی پیالی ایک باب میں دو مرتبہ خالی ہو چکی تھی لیکن ابھی تک ناگواری کے سائے ان کے چہرے پر رنگ نہیں لائے تھے۔ پھر بھی میں تکلفاً تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہوگئی۔ اور یہ محسوس کرنے لگی۔ کہ بس اب وہ خود بھی خوشی خوشی مجھے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جانے کیلئے کہیں گے۔ مگر واہ رے مجنوں صاحب کا ضبط بولے۔ "آگے پڑھو"

شوق کا کیا کہنا وہ تو اور بڑھا۔

دوسرا باب شروع ہوا کن انکھیوں سے دیکھنے کا عمل بھی جاری رہا۔ مجنوں صاحب کا ضبط بھی اپنی جگہ قائم، میری شرمندگی میں کمی کے بجائے پھر بھی اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

مگر "آگے پڑھو" کے حکم نے کتاب آدھی ختم کرادی۔

جب میں یہ سمجھی کہ وہ تھک گئے ہوں گے۔ میں نے کتاب سے ہٹ کر بات کی "مجنوں صاحب باقی آیندہ"

"نہیں۔آگے پڑھو" اب مجنوں صاحب نے سچ مچ کہانی میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ میرا حوصلہ تو کیا بڑھتا۔اپنی اوقات سے میں بالکل غافل نہیں تھی۔

میں پڑھتی جاتی اور مجنوں صاحب کی جانب چوری چوری دیکھتی جاتی۔اب ان کی آنکھیں بند تھیں۔ان کا ذرا سا جسم سمٹ کر صوفے میں دھنس چکا تھا۔ چائے کی پیالی خالی تھی۔ میں نے تھرماس سے مزید چائے نہیں انڈیلی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ شاید سو گئے ہیں۔تھک گئے ہیں یا بور ہو رہے ہیں۔لحاظ میں یا میری دل شکنی کے باعث شاید پڑھنے سے منع نہیں کر رہے ہیں۔لیکن یہ ضرور ہے کہ مزید سننا شاید اب ان کے بس میں رہا بھی نہیں۔

میں نے یکا یک پڑھنا بند کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ اسی حالت میں رہے میرا یقین پختہ ہو گیا کہ وہ سو رہے ہیں۔میں آہستگی سے اٹھی۔ارادہ تھا کہ جا کر پانی پیوں گی اور مجنوں صاحب کو اپنی کسی آہٹ سے چونکنے نہیں دوں گی۔ قالین پر کرسی کھسکانے سے تو کوئی آواز ہوتی نہیں لیکن غیر محسوس طور پر ایسی ضرور کوئی آہٹ ہوئی کہ مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں ڈھلکا ہوا سر اپنی سیدھ میں آ گیا۔ میں ڈر کر فوراً کرسی میں دھنس گئی ان کی آنکھیں سرخ اور کسی گہری سوچ میں تھیں۔

"مجنوں صاحب چائے اور دوں" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چائے کا گھونٹ لیکر بولے۔

"کیا پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہو؟"

جی جی نہیں میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر رک کیوں گئیں؟" مجنوں صاحب نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔

ان کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔لیکن میں پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر تھی ساری ہمت جمع کی۔اور ایک بار سلسلہ پھر شروع کیا۔ اب میں کتاب کے اس حصے پر پہنچ چکی تھی جہاں سلینا کراس جو میرے ناول کی ہیروئن تھی وہ اس کشمکش میں تھی کہ وہ جس ماحول میں قدرتی طور پر اچانک پہنچ گئی تھی اس ماحول میں رچ بس جائے۔ یا چھوڑ دے۔اٹھ جائے۔ بھاگ جائے اور

بالکل مڑ کر نہ دیکھے۔

میرے لئے بھی ناول کا یہ موڑ مشکل تھا کہ میں سلینا کر اس کو کدھر لے کر جاؤں۔ وہ رہنا ایک طرف چاہتی تھی۔ چل دوسری طرف رہی تھی۔ اور جانا اسے کسی تیسری سمت تھا۔ یہ ایک ایسا موڑ تھا کہ میرا قلم خود بھی سلینا کو کوئی راستہ دکھانے سے قاصر تھا۔ سلینا دراصل مغربی معاشرے کی پیداوار تھی۔ وہیں پلی بڑھی لیکن سوچ میں اپنی ماں کے برعکس تھی۔ وہ معاشرے اور طرز زندگی سے مطمئن نہیں تھی کیونکہ اس کا باپ مشرقی تھا اور اپنا دل دماغ اس میں ڈال گیا تھا۔ مگر وہ تو پھر بھی سلینا کر اس تھی۔ انور اختر اور گھر کے مختلف کردار اسے سلینا کر اس سے کچھ اور بنا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ کہہ کچھ بھی نہیں رہے تھے لیکن ان کی تہذیب اور وہ ماحول جس میں سلینا کچھ دنوں کے لیے آ گئی تھی اس کی آوازیں سلینا کا بری طرح پیچھا کرتیں۔ وہ انور کے ساتھ دن بھر رہتی اور رات کو اُسے سُلا کر جب اپنے کمرے میں آتی تب وہ یسوع مسیح کی اس تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھی اور کمرے میں آنے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا کہ ایک خالی کیل تلاش کر کے تصویر اس پر آویزاں کر دی تھی۔ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ پوری بندگی کے ساتھ دعا مانگتی۔ "یسوع مسیح مجھے یقین دے۔ استقامت دے کہ میں اپنے فرائض بہتر طور پر انجام دے کر واپس اپنے اسپتال لوٹ جاؤں اور دوسرے تمام مریضوں کی اسی طرح نرس بن جاؤں کہ جیسے یہاں آنے سے پہلے اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔'' لیکن اس دعا میں اب وہ زور رہ نہیں گیا تھا۔ وہ دعا مانگنے میں ہچکچانے لگی تھی۔ واپسی کے تصور سے اس کا جسم ٹوٹنے لگتا۔ وہ کمزور پڑ جاتی یسوع مسیح سے نظریں چراتی اور دھیرے دھیرے کمرے سے نکل جاتی۔

وہ ڈیوڈ کو بھولنا چاہتی تھی۔ وہ جو اس کی زندگی کا سب سے مضبوط رشتہ تھا ڈیوڈ جو اس کا مستقبل تھا۔ وہ تو انور کے گھر بس جانا چاہتی تھی۔ لیکن چاہنے کا فعل آسان اور غیر اختیاری تھا جبکہ نہ چاہنے اور چلے جانے کا تصور جبری تھا اور اسے یہی راستہ چننا تھا۔ الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی انور سے گھر کو اپنانے کے تصور میں حائل تھی۔ اور غضب تو یہ ہوا کہ ایک دن اس نے اس انگوٹھی کو بیدردی سے اتار کر اپنے سوٹ کیس کے کسی ایک کونے میں رومال سے لپیٹ کر

رکھ دیا۔ پھر کئی دن تک وہ یسوع مسیح کا سامنا کرنے سے کتراتی رہی انگوٹھی تو اس نے پھر نہیں پہنی لیکن وہ اپنے باپ کی بڑی طرفدار بھی نہیں تھی۔ کچھ دن بعد وہ پھر عقیدت کے ساتھ سینے پر صلیب بنا کر آنکھیں موند کے کھڑی ہونے لگی۔ یقین، اعتماد اور ثابت قدم رہنے کی دعا اب بھی اس کے لبوں پر ہوتیں۔ ایسی گھڑی ہر تھوڑی دیر کے بعد اس کی زندگی میں تواتر کے ساتھ آتی جاتی رہتی۔ وہ معافی مانگ لیتی اور پھر صلیب بنا کر یسوع مسیح کو راضی کر لیتی۔

اور یہاں سے میرے لئے بھی گزرنا آسان کام نہ تھا کہ میں نے یہ کہانی سلینا کیلئے ضرور لکھی تھی لیکن سلینا اب میری زندگی کی پرچھائیں بن چکی تھی۔ دائیں بائیں اپنے اردگرد اسے چلتے پھرتے دیکھتی۔

مجنوں صاحب بھی یہاں اس مقام پر آ کر بہت سنجیدہ ہو چکے تھے چائے کی پیالی جو پہلے منٹوں میں خالی ہو جاتی اب اسی طرح پڑی ٹھنڈی ہوتی رہتی۔ میں خاموش ہو جاتی تب وہ بھی چونک جاتے اور پیالی منہ سے لگا کر یکدم خالی کر دیتے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ ٹھنڈی چائے پئیں۔ پیالی اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھاتی۔ تب وہ دھیمے سے کہتے" آگے پڑھو"

وہ کہتے کچھ اس طرح کہ جیسے اس میں یہ بات چھپی ہو کہ آگے نہ پڑھو۔۔۔ وہ آگے کے واقعات سے خوفزدہ تھے۔ کبھی وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیتے۔ کبھی اپنی آنکھیں بند کر کے بے سکت ہو جاتے میں کن انکھیوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی یہ نہیں جان پا رہی تھی کہ مجنوں صاحب کی بے چینی کیوں ہے؟ اور کس لئے ہے۔

صبح سے دوپہر ہو چکی تھی۔ میں اب ایسے مقام پر تھی کہ نہ پڑھے باز آ سکتی تھی نہ آسانی سے جاری رکھ سکتی تھی۔ بس ان کی خواہش کی پابند تھی۔ میں سامنے کی لائین منہ سے دہرا رہی تھی اور ذہن اس سوچ میں تھا کہ مجنوں صاحب کیا سوچ رہے ہیں۔ انہیں میری تحریر میں اس قدر دلچسپی کیوں ہے۔ یہ سوال با آوازِ بلند کرنا کچھ ایسا آسان نہ تھا کہ میرا قد بہت چھوٹا اور وہ بڑے ہی دراز قامت تھے۔

صبح سے اب شام ہو چکی تھی۔ صفحے تمام ہو گئے۔ اب ایک آخری صفحہ میرے ہاتھوں میں بچا تھا۔ مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں خوف، بے بسی، مجبوری، محرومی

یادیں۔احساس اور آگے جاننے کی تمام تر خواہش رچی بسی تھی۔ میں مجنوں صاحب کی اس کیفیت سے گھبرا رہی تھی۔ میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ ایسا کچھ کیوں کر رہے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ یہ سوال بھی بڑا اہم تھا مجنوں صاحب کا میرے ناول سے کیا رشتہ ہے۔ وہ کس کردار سے قریب اور کس کردار سے دور ہونا چاہتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ کیسے جان سکتی تھی اور یہ سب کچھ جاننا بھی ضروری تھا۔ شاید اس پر ہی اس بات کا انحصار بھی تھا کہ مجنوں صاحب کیا میرے ناول کا مقدمہ لکھنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟

آخری صفحہ میرے لئے لکھنا مشکل بھی تھا اور سنانا بھی کہ ہر بار جب جب میں نے اپنی تحریر دہرائی آنسو میری آنکھوں سے چھلک جاتے۔ میں خود بھی افسردہ ہو جاتی اور میں سوچتی کہ بہت آسان ہے میں سلینا کی ٹرین آگے جانے سے روک دوں۔ اسے اتارلوں، مخالف سمت لے جاؤں اس سمت سے کہ جدھر وہ روانہ ہو چکی ہے۔ لیکن ہر بار میں یہ نہ کر پاتی۔ حالانکہ سلینا بھی مجھے منت کرتی ملتی۔ وہ اپنی صلیب گلے سے اتار دینا چاہتی تھی اور اس کے لئے وہ میری مدد کی طالب تھی۔ مگر میں نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ وہ دور ہو گئی۔ ٹرین کی دو متوازی پٹریاں جو دور بہت دور جا کر آپس میں مل جاتی ہیں سلینا وہاں تک پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ ٹرین کی دو متوازی پٹریاں کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل پاتیں۔ یہی تو سراب ہے اور سراب میں سلینا گم ہو چکی تھی۔ وہ ایک انجانے مقام کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کا کوئی اتا پتا اس نے اپنے میزبانوں کے پاس نہیں چھوڑا تھا۔

اس بار میں نے گلوگیر آواز کے ساتھ باب ختم کیا اور خاموش ہو گئی۔

مجنوں صاحب پسینے میں شرابور تھے۔ ان کا نحیف سا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھیں بند اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ان کی گود میں تھے۔ انگلیاں ہل رہی تھیں اور وہ سکتے میں تھے یہ کیفیت دیکھ کر ڈر گئی۔

اگر مجنوں صاحب کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔آگے میں سوچ بھی نہیں پاتی۔ پنکھا تیز کر دیا پیالی میں گرم گرم چائے انڈیلی۔ انہیں قدرے زور سے آواز دی۔

مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں سرخ اور ذہن کی ہلچل محسوس کی جا سکتی

تھی۔ میں نے جگ سے پانی نکال کر گلاس ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا اور سارا پانی ایک بار ہی میں پی گئے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نظریں چرا رہی تھی۔ امتحان گزر چکا تھا۔ نتیجے کی صبر آزما گھڑیاں تھیں۔

نہیں۔ ہاں۔ مجھے بار بار یہ دونوں فیصلے خاموش آواز میں سنائی دے رہے تھے کہ یکا یک مجنوں صاحب بولے۔

سلینا کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا وہ منطقی تھا۔ اگر چہ یہ مشکل کام تھا۔

پھر انہوں نے نتیجہ سنایا۔ "قلم پکڑو اور لکھنا شروع کرو۔"

یہ وہ جملہ تھا جو میری زندگی میں اس وقت بھی اہم تھا اور آج بھی ہے۔ مجنوں صاحب نے بولنا شروع کیا اور میں لکھتی گئی۔

ناول کیا ہوتا ہے؟ دنیا کے بڑے ناول کون کون سے ہیں؟ اور ان ناول کے نسوانی کرداروں کا تذکرہ کیا۔ اور پھر جب اپنے احساسات کا اظہار کیا کہ اس ناول کو سننے کے بعد میں اپنے ماضی میں چلا گیا تھا کہ آج اس عمر میں اس کی بازیافت میرے لئے بڑی خطرناک تھی۔ میں نے اپنی پوری توانائی کو استعمال کیا۔ "مجھے فوراً پھر اسے بھلا دینا چاہیئے"

یہ کہتے کہتے وہ بڑے دکھی لگ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی انسان اپنے ماضی میں جا کر بعض اوقات کتنا کمزور ہو جاتا ہے۔ وہ کیسا پل ہوتا ہے۔ وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے۔ وہ کون سی کمزوری ہوتی ہے جو برسوں سالوں گزرنے کے بعد بھی آنسوؤں آہوں میں گندھی ملتی ہے۔ جو دل کے کسی کونے دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ ہوتی ہے۔ جسے نہ یاد کیا جا سکتا ہے نہ بھلانے کی سکت ہوتی ہے۔ وہ کرب وہ دکھ وہ احساس انسان کی شریانوں میں سیال مادہ بن کر گردش کر رہا ہوتا ہے زندگی آگے بڑھ رہی ہوتی ہے لیکن اس کی گردن پیچھے مڑی اس نشانِ راہ کو تک رہی ہوتی ہے جو معدوم بھی ہو چکا ہے لیکن پوری طاقت اور توانائی بن کر زندہ بھی ہے۔ مجنوں صاحب ماضی کی کسی ایسی ہی یاد میں جکڑے جا چکے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ کاش میں اس وقت ان کی ہم عمر اور ان کی دوست ہوتی تو ضرور پوچھتی کیا کوئی سلینا ان کی یاد کا مرکز ہے۔ کیا وہ اتنی اہم تھی جو آج بھی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔

میں آج بھی مجنوں صاحب کی وہ کیفیت وہ لمحے وہ دن اور انکا فیصلہ یاد کرتی ہوں تو مجھ پر وہی ساری کیفیت طاری ہوجاتی ہے جو آج سے تقریباً 33 برس پہلے ایک دوپہر مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ میں اپنی یادوں میں مجنوں صاحب کو تازہ رکھتی ہوں۔ اپنے دل میں انہیں عزیز تر مانتی ہوں اور اپنی دعاؤں میں انہیں سرفہرست رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل رکھے۔ (آمین)

☆☆☆

(10 جون 2005ء، پروگرام بیادِ مجنوں، آرٹس کونسل آف پاکستان)

انجمن باقی ہے شمعِ انجمن باقی نہیں

(باباکی یاد میں بزمِ امروز کی کہانی)

اگر آج مجھ سے پوچھا جائے کہ اپنے بچپن کے دنوں میں کن دو شخصیتوں کو دیکھنے کا موقع نہ ملتا تو کس قدر ملال ہوتا، تب میں بغیر سوچے فوراً جن دو شخصیات کا نام لوں گی، ان میں ایک مولانا حسن ریاض اور دوسرے مولوی عبدالحق یعنی بابائے اردو ہیں۔

مولانا حسن ریاض نے ''پاکستان ناگزیر تھا'' کتاب لکھی، اور وہ مجھے بچپن میں تو نہیں نوجوانی میں بحیثیت استاد ملے جب میں شعبۂ صحافت، جامعہ کراچی میں پڑھ رہی تھی۔ مولانا حسن ریاض پستہ قد، دبلے پتلے، سفید بالوں والی نام کی داڑھی، شیروانی، تنگ پائجامہ، سر پر دوپلی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی تھامے ٹک ٹک کرتے آرٹس فیکلٹی کی سیڑھیوں پر بس سے اتر کر بغیر دائیں بائیں دیکھے سیدھے شعبہ صحافت میں جا کر گم ہو جاتے۔ لاٹھی اُن کے ہاتھ میں سہارے کے طور پر ہوتی جسے لیے وہ ہمارے کلاس روم میں داخل ہوتے اور روسٹرم سے ٹکا کر لیکچر شروع کر دیتے۔ ان ہی دنوں وہ ''پاکستان ناگزیر تھا'' جیسی کتاب تحریر کر رہے تھے۔ ہمیں اُن دنوں بھی اور اب بھی اس بات پر ناز رہا کہ اس کتاب کی پروف ریڈنگ کی ذمہ داری ہماری تھی جسے شعبہ تصنیف و تالیف سے چھپنے کے بعد گھر کے پتے پر انہوں نے میرے لیے بھیجی۔ یہ اعزاز بھی مجھے آج تک خوش رکھتا ہے۔ ہفتے میں دو دن Remedial Urdu کی کلاس سے ان کا تعارف ہم سے ہوا اور وہیں ختم بھی ہو گیا۔

دوسری شخصیت مولوی عبدالحق کی ہے جنہیں پہلی بار کب دیکھا، یاد نہیں۔ مگر ہاں میں اسکول میں کسی چھوٹی کلاس کی طالبہ تھی۔ ان ہی دنوں میرے دادا ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان آئے تھے۔ ہم ان کے اکلوتے بیٹے کی اولاد تھے جو چالیس سال کی عمر میں علی گڑھ کے قبرستان میں اپنا گھر بنا کر ہم سے منہ موڑ چکے تھے اور جن پر رشید احمد صدیقی نے خاکہ لکھ کر انہیں

امر کر دیا ہے۔ دادا ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ وہ صرف ہمارے دادا نہیں بلکہ انڈین ایجوکیشن سروس کے نامی گرامی فرد تھے۔ کشمیر اسٹیٹ میں ڈائریکٹر ایجوکیشن کے عہدے پر فائز رہے تھے، اور جنہیں محسن الملک نے علی گڑھ بلا کر ایم اے او کالج میں سائنس کا پہلا پروفیسر بنا دیا تھا۔ وہاں سے نکالا، اپنا سیکریٹری منتخب کیا۔ پھر 1920ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آنے لگا، تب وہ اس کمیٹی کے ایک رکن تھے جس میں علامہ اقبال، آغا خان اور دیگر شخصیات بھی شامل تھیں۔ یقینا یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو اُن کے حصے میں آیا۔ یوں وہ یونی ورسٹی کورٹ ممبر بھی بنائے گئے تھے، ڈیوٹی سوسائٹی کے رکن بھی رہے اور مسلم یونی ورسٹی کی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ وہیں کہیں مولوی عبدالحق سے اُن کی دوستی ہوئی۔

پاکستان آنے کے بعد تین لوگ اُن سے اور وہ اُن لوگوں سے برابر ملتے رہے۔ ایک اُن کے شاگرد محمد شعیب جو پاکستان کے وزیرِ خزانہ تھے...... گھر آتے، ہاتھ باندھ کر باادب کھڑے رہتے اور کھڑے کھڑے چلے جاتے۔ ایک دوست اختر عادل، جن کی کوٹھی آج بھی کشمیر روڈ پر عادل ہاؤس کے نام سے موجود ہے۔ دوسرے بابائے اردو مولوی عبدالحق جن سے ملنے جب وہ جاتے تب اُن کے ایک ہاتھ میں چھڑی ہوتی اور دوسرا ہاتھ میری انگلی تھامے ہوتا۔

اردو کالج کی عمارت میں داخل ہوتے ہی میں وہ مصرع ضرور پڑھتی جو اُن کے کمرے کے نیچے لکھا ہوا تھا اور شاید آج تک لکھا ہو

''گیسوے اردو ابھی منّت پذیر شانہ ہے''

اردو کالج کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں بے شمار کتابوں اور کاغذات کے بنڈل کے درمیان بابائے اردو بیٹھے ملتے۔ میں 'بابائے اردو' سے یہی سمجھتی کہ وہ سفید بالوں اور سفید داڑھی کے سبب بابا ہیں اور انہیں اردو آتی ہے اور شاید سب سے اچھی آتی ہے۔

''دادا اور بابا'' دھیمے لہجے میں بہت سی باتیں کر رہے ہوتے جو مجھے سنائی بھی نہیں دیتی تھیں۔ میں یہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ وہ کتنی تاریخی ہستی ہیں۔ میں تو انہیں بس دادا کا دوست ہی سمجھتی تھی۔

کئی بار میری ان سے ایسی ہی خاموش ملاقات ہوئی مگر افسوس میری کم علمی اور کم عمری نے

اُن سے کوئی فیض حاصل نہیں کیا، سوائے اس کے کہ اُن کی شخصیت کا عکس میری آنکھوں میں آج بھی موجود ہے۔

مولانا حسن ریاض اور بابائے اردو کی زندگیوں میں بڑی یکسانی ہے۔ مولانا صحافت کے بادشاہ تھے اور بابا ادبِ اردو کے شہنشاہ۔ دونوں نے اپنے اپنے شعبے سے عشق کیا اور پھر دونوں نے شادی نہیں کی۔ روکھی پھیکی زندگی دونوں نے گزاری۔ دونوں نے اپنی خدمات کا صلہ نہیں پایا۔ دونوں کو محرومیاں ملیں، دھوکے بھی کھائے، نظرانداز بھی ہوئے اور اکیلے ایک دن دنیا سے چلے گئے۔ کوئی وراثت نہیں چھوڑی، کوئی نسل ان کے شجرے میں نام نہ لکھا سکی۔ بابا کا مزار بن گیا مگر مولانا کی قبر کا کسی کو پتا بھی نہیں۔ عشق انسان کو اپنے اندر بڑا بنا دیتا ہے، کیوں کہ عشق، شوق و آرزو کی آخری منزل کہلاتا ہے۔

مجھے بابائے اردو سے اپنے تعلق کو آج واضح کرنا ہے اور یہی میرا موضوع بھی ہے۔ میں جب تھوڑی بڑی ہوئی تب مضامین لکھنے کا شوق ہوا۔ میرے گھر روزنامہ ''امروز'' آتا تھا جو اُن دنوں کراچی، لاہور اور ملتان سے بیک وقت نکلتا تھا۔ پہلا مضمون چھپا تو اس کی خوشی اور دل کی دھڑکن کی دل خوش کن آواز آج بھی میرے سینے میں محفوظ ہے۔ یہ اخبار 1961ء تک نکلتا رہا اور اس وقت تک بچوں کے صفحے پر ہم ہر اتوار کو ایک مضمون لے کر آتے اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے۔ صفحے کے نگراں افضل صدیقی تھے جو ریڈیو پاکستان کے مشہور پروگرام ''حامد میاں کے یہاں'' کے انجم ماموں تھے جن کی آواز ہر اتوار کو ہمیں سننے کے لیے ملتی۔ افضل صدیقی ''اچھے بھیا'' کہلاتے تھے اور ہمیں ہر مہینے کے پہلے جمعے کو آرٹس کونسل بلاتے جہاں ہم اپنی تحریریں تنقید کے لیے پیش کرتے۔ ان دنوں ہم اپنے خیال میں بہت بڑے ادیب اور شاعر بن چکے تھے۔

ان ہی دنوں افضل صدیقی اچھے بھیا کا ایک خط ہمیں موصول ہوا جس میں ہدایت تھی کہ ہمیں اردو کالج پہنچنا ہے جہاں بزمِ امروز کا قیام عمل میں آئے گا۔ یہ 16 اگست 1959ء کا دن تھا، جو ہماری زندگی کا قیمتی دن تھا جب ہم نے ساتھ لکھنے والے تمام ساتھیوں کو دیکھا اور اپنی پسند کے دوست بھی بنائے۔ ہارون رشید، انور شعور، ایم الیاس، بدرالدجیٰ، عارفہ شمسہ، عرفان عابدی، بدر شکیب، طاہر نقوی، یونس ہمدم، فصیح چغتائی، عالیہ حیات، شاہنواز پروین، سلیمان ہاشمی، شاہد

حسین بخاری، فرحت صدیقی، اقبال حیدر، نیر بن سوز، اور بھی کئی۔ یہ دوست آج بھی ہماری زندگیوں میں شامل ہیں۔ ہاں چند اس دنیا سے چلے بھی گئے لیکن ہمارے دلوں سے نہیں گئے ہیں۔

اُس دن ہم نے اپنے دادا کے دوست کو اپنی بزم کے سرپرست کے طور پر دیکھا۔ اسی دن بزم امروز کی بنیاد رکھی گئی۔ ہم نے انہیں اپنے درمیان دیکھ کر جو تالیاں بجائی تھیں، اس کی کھنک کو ہم آج تک نہیں بھلا پائے ہیں۔ چند بچوں نے تقریریں بھی کیں جس میں ایک تقریر میری بھی تھی جس کی تیاری میرے دادا نے کروائی تھی، اس لیے وہ قابلِ توجہ بن گئی اور مجھے مولوی صاحب کے منہ سے تعریف سن کر جو خوشی ملی، وہ نایاب ہے۔ میرے سر پر اُن کا ہاتھ تھا۔ یہ فخر آج تک میں اپنے سر پر سجائے ہوئے ہوں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم تمام ساتھیوں نے جانا کہ ہم ایک ایسی ہستی سے ملے ہیں جو تاریخ میں اہم ترین مقام رکھتی ہے۔ ہمیں ''اچھے بھیا'' کے لکھے گئے خط کی یہ لائن سچی لگی کہ ''بچو! تم لوگ ضرور شرکت کرنا کہ تم ایک ایسی ہستی سے ملو گے کہ جن سے نہ ملنے کا دکھ تمہیں ہمیشہ رہے گا۔'' ہم آج بھی جب چند دوست اکٹھا ہوتے ہیں، تب اُن دنوں کو ضرور دہراتے ہیں۔

16 اگست 1959ء بزم کے قیام کی تاریخ ہے، اور اُس دن ہم نے 270 روپے کی ایک خوب صورت تھیلی اُن کے حضور پیش کی تھی جو ہم بچوں نے چند مہینوں میں اپنے جیب خرچ سے جمع کی تھی۔ دو روپے، آٹھ آنے، پانچ روپے، ایک بچے نے دس روپے تک دیے تھے۔ یہ سب سے بڑی رقم تھی۔ اردو کالج کے قیام کے لیے پیش کی گئی یہ رقم سب سے پہلی رقم تھی جو بابائے اردو کے کانپتے ہاتھوں میں بزم امروز کی جانب سے تھمائی گئی۔ شاید مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھی ہوں جو ہم نے نہیں دیکھے، لیکن اُن کے لہجے کا ارتعاش یہی یقین دلا رہا ہے کہ بابائے اردو بچوں کے سامنے رونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

16 اگست 1961ء بابائے اردو نے رحلت کی بزمِ امروز کے قیام کے ٹھیک دو سال بعد۔ ہم بچے ان کی قبر پر جانے والے پہلے بچے تھے۔ آج ہمارے ہاتھوں میں رقم نہیں پھول تھے۔ آج ہم سب رو رہے تھے، مگر ''بابا'' اپنے تمام دکھ، خواہشیں اور خدمات سمیٹ کر روپوش ہو چکے

تھے اور آج تک روپوش ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تاریخ کے کچھ انمول صفحات پڑھے بغیر ضائع ہو جاتے ہیں، کبھی قصداً، کبھی حادثتاً۔ ساٹھ برس بعد وہ صفحات جو ہمارے پاس بغیر پڑھے رکھے ہیں، سوچا کیوں نا انہیں تاریخ کا حصہ بنادوں۔ مجھے یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ ایک بار فاطمہ حسن نے فرمایش کی تھی کہ ہمیں اردو باغ میں ایک گوشہ ''بزمِ امروز'' کی یادوں کا بنانا چاہیے۔ ہمارے سب سے فعال ساتھی ہارون رشید میرا ہاتھ بٹائے بغیر دنیا سے چلے گئے، میں سست پڑ گئی۔ اب یاسمین فاروقی نے خواہش کا اظہار کیا۔ خواہش ہی نہیں، خواہش کی تکرار بھی کی، خوشامد بھی کی اور اب تو وہ خفگی تک برتنے لگی ہیں۔ سوچا تنہا ہی جتنی بھی یادیں اور اثاثہ میرے پاس ہے، اسے اردو باغ کو دے دوں۔ شاید ''بابا'' کا ہاتھ ایک بار پھر میرے سر پر شفقت بن کر مجھے سرشار کردے۔ میں نے خواب دیکھنا شاید بابا سے ہی سیکھا ہے۔

یہ تحریر تین راتوں پر مشتمل ہے۔ بابا کے ساتھ گم شدہ ساتھی بھی آنکھوں میں ہلچل مچائے ہوئے شریک ہیں۔

بزمِ امروز کے قیام کے دن ہم نے اپنا منشور ان الفاظ میں پیش کیا:

''ہم پاکستان کے نوعمر ادیب خود کو اپنے ملک کی ترقی وخوش حالی، عزت وعظمت، بقا وتحفظ کے لیے وقف کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملّت کی تنظیم اور وحدتِ فکر کے لیے مذہب کے بعد دوسرا سب سے بڑا وسیلہ قومی زبان ہے۔ اور اردو ہی ایسی زبان ہے جو قومی اتحاد و یگانگت کو مستحکم کرسکتی ہے۔ اس کے ذریعے ہماری تہذیبی روایات کی ترقی بھی ہوسکتی ہے اور تحفظ بھی۔ اور اسی کے ذریعے ہماری ثقافت واضح خدوخال کے ساتھ پنپ بھی سکتی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اردو کو قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے ترقی دینے کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کا بھی احترام کیا جائے۔ اردو کو ہر شعبہ زندگی میں رائج کیا جائے اور اسی زبان کو ذریعۂ تعلیم اور وسیلۂ روزگار بھی بنایا جائے۔

پاکستان کے شہری، ادیب اور معاشرے کے فرد کی حیثیت سے ہم پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، ہم انہیں قبول کرتے ہیں۔ ماضی کی عظیم روایات کا احترام، حال کے مفید تجربات سے

استفادہ اور مستقبل کی تعمیر کے لیے جدو جہد ہمارا نصب العین ہے۔''

اس منشور کے تحت بزم اردو کے قیام کے بعد بابائے اردو کا پیغام بزم امروز کے نام یوں آیا:

''میں آپ کی بزم کو بہت پسند کرتا ہوں اور اس لیے کرتا ہوں کہ آپ بچوں کو صرف لکھنا پڑھنا نہیں سکھاتے بلکہ ان کی تربیت اس ڈھنگ سے کررہے ہیں کہ ان میں قومیت کا احساس اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ ایک اچھا اور قابلِ قدر کام ہے کیوں کہ بچپن میں جو بات سکھائی جاتی ہے وہ آخر عمر تک قائم رہتی ہے۔ یہ آپ کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ بزم امروز کے اراکین نے اردو یونی ورسٹی کے لیے مزید چندہ جمع کرنا شروع کردیا ہے۔ مجھے کراچی کے کالجوں اور اسکولوں کے اساتذہ اور طلبہ سے بڑی شکایت یہ ہے کہ انہوں نے اردو یونی ورسٹی کے معاملے میں کچھ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ میرے لیے بے حد مسرت کا اور آپ کے لیے بڑے فخر کا مقام ہے کہ ان بچوں نے اس عمر میں اپنے شوق سے قومی خدمت کا وہ کام کیا ہے جو بڑوں سے نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے فرق تربیت اور معمولی تعلیم کا۔

میں آپ کو تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ ایک ایسی قومی خدمت انجام دے رہے ہیں جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ آپ میری طرف سے بزم کے اراکین کو یہ پیغام پہنچا دیجیے کہ تمہاری کوششیں ضرور بارآور ہوں گی اور اردو یونی ورسٹی کے قیام میں تمہاری یہ خدمت بڑی قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ یہ یونی ورسٹی ان شاء اللہ بن کے رہے گی اور سب سے زیادہ فائدہ تم ہی اس سے اُٹھاؤ گے۔

23مارچ 1960ء

دستخط

عبدالحق''

16 جون 1960ء کو بابائے اردو کی صدارت میں بزم امروز کا پہلا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، یہ وہ تاریخی جلسہ تھا جس میں بزمِ امروز کے چند بچوں نے تقریریں کیں اور بابائے اردو کو یقین دلایا کہ وہ اردو زبان کی جتنی بھی خدمت ممکن ہوئی، کریں گے۔

ہماری تقریروں کے جواب میں بابائے اردو کا خطاب یوں تھا:

"تقریروں میں میرے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا میں مستحق نہیں ہوں۔ یہ سن کر مجھے محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

آپ نے بار بار مجھے بابائے اردو کے نام سے یاد کیا، مگر کیا کہوں، میں تو طفلِ اردو بن کر رہ گیا ہوں۔ بچوں سے مجھے انسیت اور اُن ہی سے توقع بھی ہے جس کام کو میں تکمیل تک نہ پہنچا سکا اسے یہی پورا کریں گے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے مسرت کی بات اور کیا ہوگی کہ "بزم امروز" کے بچوں نے سب سے پہلے اردو یونی ورسٹی کے لیے رقم دی۔ اس رقم کا ایک ایک روپیہ میرے لیے ایک ایک ہزار روپے کے برابر ہے۔ ان بچوں نے جس ایثار سے کام کیا ہے، بڑوں کو اس پر شرم آنی چاہیے کہ جو کام وہ نہ کر سکے، اس میں بچوں نے پہل کر دی۔ اردو یونی ورسٹی پاکستان میں اردو کا وقار بڑھائے گی، اسے وسعت دے گی اور پھر اس زبان کا شمار دنیا کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ زبانوں میں ہونے لگے گا۔ اردو یونی ورسٹی اردو کا بلاشبہ بہت بڑا قلعہ ہوگی۔ اور پھر ایک دن یہ یونی ورسٹی بین الاقوامی یونی ورسٹی بن جائے گی۔"

16 جون 1960ء کو بزم امروز کراچی کے سالانہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا:

اردو صرف ایک زبان نہیں ہے بلکہ پوری قوم کی تاریخ ہے، اگر تاریخ مٹ جائے تو زبان گناہ گار سمجھی جائے گی۔ کوئی شخص غیر زبان کو کتنا ہی سیکھ لے پھر بھی وہ غیر زبان ہوتی ہے۔ اپنی زبان سے محبت کرنا دراصل اپنی قوم اور ملک سے محبت کرنا ہے۔ جو لوگ اپنی زبان استعمال نہیں کرتے یا استعمال کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں، وہ بے غیرت ہیں۔"

اس جلسے کا سب سے قیمتی لمحہ وہ تھا جب ہم چند بچے اپنے نگراں افضل صدیقی کی سربراہی میں اردو کالج کے اسٹیج پر سیڑھیاں طے کرتے ہوئے پہنچے اور کالی شیروانی، سفید پاجامے میں ملبوس بابا کے سامنے باادب کھڑے ہو گئے۔ افضل صدیقی عرف اچھے بھیا نے بابا کو مخاطب کر کے کہا: "بزمِ امروز کی جانب سے بچوں کے جیب خرچ کی مختصر سی تھیلی اردو یونی ورسٹی کے لیے قبول کیجیے۔"

ہاں یہ موقع تھا جب ہم بچوں نے بغور ان کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک سمندر اُبلنے کے لیے بے قرار تھا اور دونوں بوڑھے کپکپاتے ہاتھ پیالہ بنے ہوئے تھے جس میں ان کا خواب 270 روپے کی حقیر رقم تاریخ بنا رہا تھا۔ ہم سب اسٹیج سے اُتر آئے تھے بس صرف بابا اسٹیج پر بیٹھے، نہیں بلکہ کھڑے رہے۔ ہم سب منتظر تھے کہ اب وہ اپنی صدارتی تقریر سے نوازیں گے۔ مگر نہیں، وہ بس صرف یہی کہہ پائے:

''بچو! اردو یونی ورسٹی میں تمہارا نام نمایاں مقام پر درج کیا جائے گا۔''

یہ ایک جملہ انہوں نے بدقت ادا کیا تھا اور پھر وہ بیٹھ گئے۔ ''گر تُو برا نہ مانے'' کالم لکھنے والے طفیل احمد جمالی ''امروز'' اخبار کی جانب سے نمائندگی کے لیے موجود تھے، بابا سے مخاطب ہوئے ''آپ خطاب فرمائیں''۔ مگر انہوں نے خطاب سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر افضل صدیقی شرمسار کھڑے تھے کہ شاید اس تقریب کی ترتیب میں ان سے کوئی غلطی ہوگئی ہے، یا یہ کہ رقم بہت کم ہے۔ جمالی صاحب نے پھر اصرار کیا:

''مولوی صاحب! اس جلسے میں اندرونِ سندھ کے بہت سے بچے شریک ہیں جنہیں شاید آیندہ کبھی آپ کے منہ سے چند الفاظ سننے کا موقع نہ ملے، اس لیے تقریر کرنا ضروری ہے۔ آپ کے چند الفاظ ان بچوں کو عمر بھر انسپائر کرتے رہیں گے۔''

یہ سن کر مولوی صاحب چونک پڑے۔

''میری تقریر سے انسپائر ہوں گے۔ کیا مذاق کر رہے ہیں آپ۔''

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں ایک بار پھر پُرنم ہوگئیں اور وہ زیادہ بوڑھے نظر آنے لگے۔

''مولوی صاحب!'' جمالی صاحب نے ایک بار پھر اُن کو نہ صرف مخاطب کیا بلکہ اسٹیج پر جا کر انہیں کھڑا ہونے میں مدد دی۔ بہ ہزار دقت وہ تقریر کرنے کھڑے ہوگئے۔

یہ ایک تاریخی لمحہ تھا اور یہ آواز مستقبل قریب میں خاموش ہو جانے والی آواز تھی اور اُن تمام شریک بچوں کے لیے پہلی اور آخری، ایک تاریخی شخصیت کی تاریخ ساز آواز تھی:

''لوگ مجھے بابائے اردو کہتے ہیں تو میں شرماتا ہوں۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ میں آپ ہی جیسا بچہ ہوتا۔ کیوں کہ بچپن تحقیق و جستجو کا زمانہ ہوتا ہے، ذہانت اور فراست کی عمر ہوتی ہے۔ یہ بچے

بغیر کسی کے سکھائے بیک وقت کئی کئی زبانیں سیکھ لیتے ہیں لیکن بڑے مدتوں میں ایک زبان بھی نہیں سیکھ پاتے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ''طفلِ اردو'' بن جاؤں۔''

اس کے بعد مولوی صاحب نے قومی زبان کی اہمیت اور موجودہ تعلیمی نظام پر بہت ساری باتیں کیں۔ ہماری سمجھ میں بس کچھ کچھ آئیں۔

ہم نے طفیل احمد جمالی سے بعد میں کئی بار مولوی صاحب کی باتیں دُہرا کر سمجھنے کی کوشش کی مگر جمالی صاحب نے کہا ''میں وہاں موجود ہی نہیں تھا، میں تو اس خیال میں کھویا ہوا تھا کہ جس قوم کے رہنما نوّے سال تک جدوجہد کرنے کے بعد آخر کار اس نتیجے پر پہنچیں کہ کاش انہیں یہ نوّے سال دوبارہ مل جائیں، اُس کا مستقبل کیا ہوسکتا ہے! کیوں کہ میرے نزدیک دوبارہ طفلِ اردو بن جانے کی تمنا کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ ایک ضیاعِ عمر کا بے پایاں احساس۔ اس احسانِ ناسزا کی تلخ یاد اور ایک قبرستان میں زندگی کی شمع جلانے کی ایک سعیِ رائیگاں ہے۔''

یوں ''امروز'' اخبار کے کالم ''گرتو برا نہ مانے'' کے کالم نگار طفیل احمد جمالی نے ہمارے اصرار پر اُن کی تقریر سمجھانے کی کوشش تو کی لیکن اُن دنوں نہیں، بہت بعد میں جب ہم طفل سے نوجوان بنے، تب یہ باتیں سمجھ میں آئیں۔

بزمِ امروز کے اس جلسے میں نازش حیدری نے بزمِ امروز سے مخاطب ہوکر یوں کہا:

منزلِ نو کا ہے پیغام یہ تحریکِ جدید
نوجواں ہیں اُدبا اور نئے رستے ہیں
''بزمِ امروز'' ہو یا انجمنِ مستقبل
حکمت و علم کے پھولوں کے یہ گل دستے ہیں

رئیس امروہوی نے کہا:

یہ نئے اہلِ قلم دانش و حکمت کے رسول
ہیں جو آئینہ فردا و نشانِ امروز
ان کے امروز میں فردا کی تجلی ہے رئیسؔ
ان کے فردا میں ہے تصویرِ جہانِ امروز

محشر بدایونی نے کہا:

وہ معمر دل جوانوں کے جواں جس نے کیے
وہ مربی فیض کے چشمے رواں جس نے کیے
وہ مفکر فکر کے جوہر عیاں جس نے کیے
وہ محقق کام کے نکتے بیاں جس نے کیے
اک نگاہِ مہر سے، ہر سو اُجالا کر دیا
ملک میں اردو زباں کا بول بالا کر دیا

ایک ''امروز'' بچے انور شعور نے کہا:

محاسبہ

تم اپنے آپ کو آزاد قوم کہتے ہو
تمہارے پاس تمدن کا کوئی خاص نظام؟
جو اژدہام میں ممتاز کر سکے تم کو
جو محورِ نگہِ ناز کر سکے تم کو
تمھارے پاس کوئی قدر مشترک بھی ہے؟
کوئی پیام؟ کوئی رابطہ؟ کوئی تقریب
کوئی زبان؟ کوئی ضابطہ؟ کوئی تہذیب
روایتیں جو تخیل سے پائی ہیں تم نے
جدید عہد سے ان کا نباہ ممکن ہے
حقیقتوں سے کوئی رسم وراہ ممکن ہے
تم اپنے آپ کو آزاد قوم کہتے ہو؟

تقریب تو ختم ہوگئی مگر یہ تقریب تاریخ بن گئی۔ بزمِ امروز کے بچوں نے اور ذوق وشوق سے لکھنا شروع کیا۔ تقریری مقابلے ہوئے، مضمون نویسی کے مقابلے ہوئے، بیت بازی ہوئی۔ انجمن ترقی اردو کی لائبریری میں بزم امروز کے ہم چند بچوں نے کچھ رقم انعامی بونڈ اور چیک کی شکل میں

پیش کی اور وعدہ کیا کہ یہ تحریک جاری رہے گی۔

مشاعرہ اور ادبی مقدمہ بھی ترتیب دیا گیا۔ جسٹس مہدی علی صدیقی کی ادبی عدالت میں یہ مقدمہ پرانی نسل کے خلاف نئی نسل نے دائر کیا تھا۔ دونوں جانب وکیلوں کا پینل تھا جن کے تمام نام ہمارے ذہن میں اس وقت نہیں، مگر ہاں سید محمد تقی ایڈیٹر ''جنگ'' پرانی نسل کی طرف سے مقدمہ لڑ رہے تھے، ساتھ میں رئیس امروہوی تھے۔ اور نئی نسل کی جانب سے میں اور جوہر حسین پیش ہوئے تھے۔ وکیل استغاثہ کے طور پر بزم کے قیام کے بعد سے کئی اکابرینِ ادب کے ساتھ گفتگو کی نشستیں بھی منعقد کی گئیں۔ ایک نشست میں پراگ یونی ورسٹی چیکوسلواکیہ کے پروفیسر ہارن مارک شریک ہوئے جس میں شہر کراچی کی اہم علمی و ادبی شخصیتوں نے شرکت کی تھی۔ عید ملن پارٹی بھی ہوتی جس میں کراچی کے علاوہ اندرون سندھ کے اراکین بھی بطور خاص شرکت کرتے۔ دو کمیٹیاں بھی بنائی گئیں، ایک سوونئر کمیٹی تھی جس میں شاہد بخاری، فرحت صدیقی، خلیل عارف، ایم الیاس، بدر امروہوی، نعیم ارشاد اور شاہنواز پروین تھیں۔ دوسری استقبالیہ کمیٹی جس کے صدر عبدالرحمن چودھری تھے۔ اراکین میں فصیح چغتائی، رشید شکیب، سلیمان ہاشمی، انور شعور، عرفان علی، ہارون رشید، طاہر نقوی، سکندر خٹک اور ثمر شاہ تھیں۔

مضمون نویسی کا ایک مقابلہ بھی اہم تھا جس کا عنوان تھا ''قومی ترقی میں اردو کی اہمیت اور ضرورت''۔ اس مقابلے کے لیے مشرقی پاکستان، سندھ، کراچی اور پنجاب سے کُل 44 مضامین موصول ہوئے۔ یہ سارے مضامین انجمن ترقی اردو کے سپرد کر دیے گئے۔ منصفین کے فرائض جناب جمیل الدین عالی، جناب جلیل قدوائی اور جناب مشفق خواجہ نے انجام دیے۔ اوّل، دوم، سوم آنے والے بچوں میں بالترتیب سو روپے، ساٹھ روپے اور چالیس روپے کی تقسیم کرنی تھی لیکن اتفاق سے کسی مضمون کو اوّل انعام کا مستحق نہیں جانا گیا، لہٰذا ساٹھ روپے کا دوسرا انعام سلطان جہاں ابراہیم (کراچی)، اور ڈھاکہ سے نثار احمد اسرار نے تیسرا انعام چالیس روپے کا حاصل کیا۔ مقابلے کی رقم جناب عبدالرحمن چودھری نے فراہم کی تھی۔

16 اگست کی تاریخ بزم امروز کے لیے خوشی کی بھی تاریخ تھی اور غم کی بھی، کہ 16 اگست 1959ء کو بزم قائم ہوئی۔ پہلا سالانہ جلسہ 16 اگست 1960ء کو ہوا۔ دوسرے سالانہ جلسے کی

تاریخ 16 اگست 1961ء تھی کہ جس دن انجمن ترقی اردو کے صدر اور بزم امروز کے سرپرستِ اعلیٰ بابائے اردو نے آنکھوں میں اردو یونی ورسٹی کے قیام کا خواب سجائے ایک اور ہجرت اپنائی۔

16 اگست 1963ء مولوی صاحب کی دوسری برسی پر ایک مجلہ بنام ''بابائے اردو'' شائع کیا گیا جس کے ٹائٹل پر اُن کی تصویر، ہاتھ میں قلم لیے کچھ لکھتے رہے، لگائی۔ ایک شعر بھی تحریر تھا:

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

اس موقعے پر مقتدر ہستیوں نے اپنے پیغامات بھیجے۔ گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان نے لکھا:

''مجھے یہ سن کر انتہائی خوشی ہوئی ہے کہ بزم امروز، کراچی بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی دوسری برسی منا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو ادب کو فروغ دینے کے لیے جو خدمات انجام دیں، وہ ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اُن کا شمار پاکستانی ادیبوں میں سرفہرست ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تقاریر اور تحریروں کے ذریعے ملک میں حب الوطنی اور قومی خدمت کے جذبے کو فروغ دیا۔ مرحوم ایک ہر دل عزیز انسان تھے اور پاکستان کے شان دار مستقبل کی تعمیر کے لیے جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہے۔

برگزیدہ ہستیوں کی وفات کے بعد اس قسم کے جلسے کرنے سے اُن کی یاد تازہ ہوتی ہے اور حاضرینِ جلسہ کو ان کی خدماتِ جلیل کی قدر کرنے کا موقع ملتا ہے۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ بزمِ اردو کا یہ جلسہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہے گا۔''

دستخط

گورنر مغربی پاکستان

ملک امیر محمد خان

صوبائی وزیر تعلیم کا پیغام تھا:

''مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ''بزم امروز'' اردو ادب کے ایک بلند پایہ ادیب اور مصنف کی دوسری برسی کی تقریب پر ایک یادگاری مجلہ شائع کر رہی ہے جو مولوی عبدالحق مرحوم کی

تحریروں اور اُن پر لکھے گئے مشاہیر کے مضامین و پیغامات پر مشتمل ہوگا۔
میری دلی تمنا ہے کہ آپ کا یہ مجلہ ایک نادر نمونہ اور اس تقریب کی بے مثال یادگار ثابت ہو۔"

محمودہ سلیم
5 اگست 1963ء

بزمِ امروز کے نام شہزادہ کریم آغا خان نے لکھا:
"مجھے توقع ہے کہ اردو یونی ورسٹی بنے گی اور ترقی کر کے جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کا درجہ حاصل کر لے گی، اور جو خدمتِ عظیم جامعہ عثمانیہ نے متحدہ ہندوستان میں انجام دی تھی، وہ اردو یونی ورسٹی پاکستان میں انجام دینے لگے گی۔"

قدرت اللہ شہاب کا طویل پیغام "اے نوجوان ہم قلمو!" سے چند سطریں تحریر کر رہے ہیں:

"بزمِ اردو کے ہم قلمو! ہم ایک ہی برادری کے رکن ہیں۔ ہمیں اپنے ادب کی تعمیر بھی کرنی ہے اور اس وطن کی بھی جو ہماری خاکِ پاک اور ہماری آرزوؤں کا مظہر ہے۔ یاد رکھیے کہ کوئی نہال اپنی جڑوں سے الگ ہوکر برومند نہیں ہوسکتا اور کوئی قومی ادب اپنی خاکِ پاک کے تقاضوں سے جدا ہوکر ترقی نہیں کرسکتا۔ یہ پیغام بابائے اردو کا ہے۔ میں فقط اسے دہرا رہا ہوں۔
پاکستان رائٹرز گلڈ اب ایک رفیع الشان عمارت ہے لیکن اس کی تعمیر میں پہلی اینٹ بابائے اردو ہی نے رکھی تھی۔ اس کی ترقی میں اُن کے نام نامی کی برکت کو بھی دخل ہے۔
بزمِ امروز کے لیے بھی ہم اسی طرح ترقی کے دعا گو ہیں۔"

قدرت اللہ شہاب
4 اگست 1963ء

زندۂ جاوید مولوی عبدالحق کی برسی منائی جائے یا نہ منائی جائے، وہ ہمیشہ زندۂ جاوید ہستی ہی

تسلیم کیے جائیں گے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

نیاز فتح پوری، کراچی

2اگست 1963ء

سید محمد تقی، مدیر روزنامہ ''جنگ'' کا پیغام:

''بزمِ امروز، پاکستان میں اُبھرتے ہوئے نوجوان شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس بزم نے باشعور نوجوانوں کو صحیح سمت میں سوچنے اور جدید ادبی وتہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ کراچی کی ثقافتی سرگرمیوں میں بزمِ امروز ہمیشہ نمایاں رہی۔ بزمِ امروز کے فکرنواز اور ادب دوست کارکن اپنی قابلِ قدر سرگرمیاں جاری رکھیں۔''

ابراہیم جلیس کے پیغام سے اقتباس:

''بابائے اردو جب تک زندہ تھے، اردو زبان وادب کی ایک صدی تھے، ایک عہد تھے، لیکن ظالم موت نے بابائے اردو کو اب صرف ایک ''یوم'' بنا رکھا ہے۔

یہ یوم بابائے اردو کی حیاتِ جاوداں کی سال گرہ ہے۔ بابائے اردو کی زندگی کا مقصد، اردو یونی ورسٹی کا قیام تھا اور مجھے اب بابائے اردو کا مزار اسی اردو یونی ورسٹی کا سنگِ بنیاد نظر آرہا ہے۔''

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ''اردو کا محسن اعظم''۔ اقتباس پیش ہے:

''بابائے اردو نے جتنی مدت تک جس پامردی، خلوص اور قابلیت سے اردو کی نوع بہ نوع خدمات انجام دی ہیں، میں سمجھتا ہوں، دنیا کی تمام زبانوں کے جتنے خدمت کرنے والے گزرے ہیں، ان میں شاید ہی کوئی دوسرا مولوی صاحب کی ہم سری کا دعویٰ کر سکے۔ انیسؔ نے اپنے بارے میں جو کہا ہے، وہ مولوی صاحب پر جتنا صادق آتا ہے، کم سے کم اس صدی کے آخر تک شاید ہی کسی اور کو نصیب ہو:

مری قدر کر اے زمینِ سخن
مجھے بات میں آسماں کردیا

میں خدا کی درگاہ سے ایک دوسرے بابائے اردو کا متمنی، منتظر اور ملتجی ہوں۔''

''عظیم لوگ کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں اور عظیم لوگوں کے چھوڑے ہوئے نقوشِ قدم پر جادہ

پیا ہونا زندہ اقوام کا شعار ہے۔''بزمِ امروز'' اس ضمن میں مبارک باد کے قابل ہے کہ وہ اپنے بانی کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھے ہوئے ہے۔ اور اردو کے نفاذ کے لیے سرگرم عمل ہے۔'' (عبدالرحمن چودھری، رکن مجلس منتظمہ، فیڈریشن چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری)

''بابائے اردو مولوی عبدالحق اُن چند باہمت لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کردی تھی اور اب بزم امروز نے بابائے اردو کے مشن کو اپنانے کا عزم کیا ہے۔ یہ صرف آج کی بات نہیں رہے گی بلکہ مستقبل میں بھی بزم امروز معمارانِ اردو کی صف میں شامل رہے گی۔'' (افتخار چودھری، ایڈیٹر روزنامہ ''نئی روشنی'')

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صدر شعبہ اردو فارسی لکھنؤ یونی ورسٹی نے 25 جولائی 1963ء کو پیغام بھیجا، اقتباس پیش ہے:

''خدا بزم امروز کو سلامت رکھے اور آپ سب کو صلاحیت اور ہمت دے کہ بابائے اردو کی سعی مسلسل کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ وہ مقاصد حاصل ہوجائیں۔''

ممتاز حسن نے اپنے پیغام میں جو کہا، اس کی چند لائنیں پیش کررہے ہیں:

''مولوی عبدالحق مرحوم ایک خوش قسمت انسان تھے۔ خوش قسمت اس لیے کہ انہیں اپنی زندگی کا مقصد متعین کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وہ اردو کے لیے پیدا ہوئے اور جیے۔ یہ بات کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کی ساری عمر زندگی کی مختلف وادیوں اور سیرگاہوں میں گھومتے پھرتے بسر ہوجاتی ہے۔

انجمن ترقی اردو کی طرح ''بزم امروز'' کی داغ بیل بھی بابائے اردو نے ہی ڈالی تھی اور بزمِ امروز ہی نے اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لیے سب سے پہلے 270 روپے کی حقیر رقم جمع کرکے انہیں پیش کی تھی۔''

''انجمن باقی ہے، شمع انجمن باقی نہیں ہے'' کے عنوان سے لکھے گئے مجلّے کے ابتدائیے سے یہ چند لائنیں مستعار ہیں۔ نگراں بزم امروز افضل صدیقی اب اس دنیا میں نہیں جنھوں نے بچوں کو جمع کیا، ایک پلیٹ فارم مہیا کیا، انہیں لکھنا پڑھنا ہی نہیں بامقصد جینا بھی سکھایا، بڑے بڑے لوگوں سے ملایا، زندگی میں اپنی پسند کے دوست بنانے کا موقع دیا اور کیا عجب ہے کہ نہ باغ بزم

ہے، نہ نگراں بزم ہے مگر چند اراکین آج بھی موجود ہیں، ملتے رہتے اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے بابا کو دیکھا، ہم نے بابا کو سنا۔ بابا نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھا۔ بابا نے ہماری ترقی کے لیے دعائیں دیں۔ کچھ امیدیں بھی باندھیں۔ اس بزم سے ہم نے انور شعور جیسا شاعر اردو شاعری کو دیا۔ کئی ایک ادیب، کئی ایک شاعر ڈھالے۔ وعدہ تو ہم نے پورا کیا مگر بابا کا وعدہ کیا ہوا ''اردو یونی ورسٹی کے کسی ستون پر تم بچوں کے نام ضرور لکھے جائیں گے۔'' پہلے بھی بابا کی کب سنی تھی، جو اَب سنی جاتی!

☆☆☆

ماہنامہ قومی زبان کراچی میں چھپا۔

حُزنِ شام... شمس الغنی

والٹیئر نے لکھا ہے" آپ کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ جب سے دنیا بنی ہے، وحشی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتابوں کی حکمرانی ہے" تو آیئے آج اس حکمران خاندان کی ایک شہزادی حزنِ شام کا استقبال کرتے ہیں جو شمس الغنی کی تحریر کردہ ہے۔ شاعری کی اس کتاب میں ایک حمد۔ ایک نعت۔ دوعدد سلام اور 78 غزلوں پر مشتمل 519 اشعار ہیں۔

ان کی شاعری میں زبان و بیان کا حسن ہے جو فنی و عروضی اعتبار سے بھی درست ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کی اہم ترین سرگرمی شاعری ہی ہے جس میں یُو پی کی تہذیب اور تمدنی روایات ان کی ہم سفر ہیں۔ یہ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان کا شعری سفر مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ ان کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی میں شامِ غم۔ دشتِ غم۔ شامِ شکست۔ شامِ حزیں۔ شامِ ملال۔ شامِ کوفہ۔ شبِ فغاں۔ شبِ ویراں۔ شہرِ کرب اور اشکِ خون سب سے نمایاں ہیں۔

میری مشکل یہ ہے کہ کسی کتاب پر رائے دینے سے پہلے مجھے اس کو بار بار پڑھنا پڑتا ہے ۔اور اگر کتاب شاعری کی ہو تو مشکل کچھ اور سوا ہو جاتی ہے کیوں کہ شاعر اپنی بات کہنے میں استعارے رمز و کنایہ اور تلمیحات کا استعمال کرتا ہے جو یقیناً شعر کی ایمائیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ شمس الغنی صاحب نے بھی شاعری کی مروجہ صنعتوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے مثلاً صنعتِ تجنیس یعنی کلام میں ایسے الفاظ لانا جو صورت میں یکساں اور معنی کے لحاظ سے مختلف ہوں جیسے

تمہارے دستِ نازک کے لیے بھیجی تھی اک پہنچی
خبر پہنچی تو یہ پہنچی کہ وہ پہنچی ابھی تک نہیں پہنچی

(پہنچی عورتوں کا ایک زیور ہے جسے بازو بند یا پری بند بھی کہتے ہیں)

آیئے ان کی شاعری کو علمِ بیان و بدیع کے آئینے میں دیکھتے ہیں

ذرا مزاحیہ انداز میں اس صنعت کا استعمال دیکھیے۔ شمس الغنی کے اس ضمن میں شعر سنیے:

بس بس کے نگر دل کا اجڑتا بھی بہت تھا
مل مل کے مرا یار بچھڑتا بھی بہت تھا

بنامِ عشق جو ہم نے حیات لکھ دی تھی
کسی پہ اتنا نہ مرتے تو خود ہی مر جاتے

صنعتِ مراۃ النظیر کی مثال میں ایک لفظ کی مناسبت سے دیگر الفاظ کا لانا ہوتا ہے مثلاً باغ کی مناسبت سے پھول، باغبان، پتے، خار، پودے وغیرہ۔

اس صنعت کے سلسلے میں ذرا شمس الغنی صاحب کے تیور دیکھیے

نہ تو رغبتِ خم و شیشہ ہے، نہ ہی حسرتِ رُخِ مینا ہے
مگر ایک آخری بزمِ مے کبھی آؤ گے تو سجائیں گے

میں خُم ہوں مرا کام فقط مے کی رسد ہے
میں ظرفِ قدح خوار کا پیمانہ نہیں ہوں

کبھی ایک سجدہ شب فغاں کبھی لطف شام کو لے بتاں
یہ رہ خدا وہ رہِ صنم کبھی بجھ گئے کبھی جل اُٹھے

صنعت تضاد میں معنی ایک دوسرے کے اُلٹ ہوں گے۔
شمس الغنی صاحب کے چند دل کش اشعار ملاحظہ ہوں جن میں تضاد اپنے عروج پر ہے۔

کبھی دلبری کبھی بے رُخی کبھی جاں فدا کبھی جاں کُشی
یہ منافقت کے پڑاو ہیں ترے شہرِ کُوفہ و شام تک

....

چبھنے لگی نگاہ میں جب شمس زرد روشنی
اُٹھ کر دیا بجھا دیا شعلۂ جاں جلا دیا

....

شانِ عروج وہ کہ بعید از حروف و لفظ
وہ شوکتِ زوال کہ بس دیکھتے رہو

....

ترکِ جاں، ترکِ ہنر ایک ہی مفہوم کے دُکھ
اور یہ مفہوم مرے ترکِ ہُنر سے نکلا

دیکھی آپ نے لفظوں کی ترکیب اوران کے تضاد کی خوبصورتی!

صنعتِ تکرار میں ایک لفظ کا بار بار دہرانا ہے۔ ذرا ان اشعار میں صنعتِ تکرار کا اہتمام دیکھیے۔

دل تھا حصارِ درد میں اور کوئی سانحہ نہ تھا
کیا شام واقعہ تھی وہ ،جب کوئی واقعہ نہ تھا
ہے سانحہ نگارِ من دشتِ زوال کے بڑوں
آئینہ رُو برو جو تھے اب وقت کے ہیں رُو برُو

صنعتِ تلمیح یعنی کسی شعر میں لفظ یا ترکیب کے ذریعے کسی مسئلے یا تاریخی روایت کی طرف اشارہ کرنا۔ مثلاً آتشِ نمرود-ابنِ مریم-آبِ حیات-جامِ جم-جوئے شیریں وغیرہ

شمس الغنی صاحب کے ہاں اس کا استعمال یوں ہوا ہے

نہ فرہاد جنوں پیشہ نہ کوئی قیس صحرائی
پڑھی ہم نے نمازِ عشق دل برداشتہ تنہا

....

اس دل کا رفو اور کسی سے نہیں ممکن
یہ زخم تو اعجاز مسیحا کے لیے ہیں

....

ہم نے کبھی جھٹلائی نہیں کوئی حقیقت
اے سُورۃ رحمٰن ہمی تیرا بھرم ہیں

....

اے وقت ملے وقت تو ہم کو بھی کبھی پڑھ
ہم تین کی زیتون کی شاخوں پہ رقم ہیں

....

یہ کس نے پھونکا ہے سحر صدائے کُن فیکوں
دکھا رہا ہے یہ کارِ فسوں نہ جانے کون !

....

صدائے کُن فیکوں اور التین و زیتون کے استعارے ہمیں پوری انسانی تاریخ اور تخلیق کائنات کی طرف لے جاتے ہیں جیسے جوش صاحب کا شعر ہے۔

ہم اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

انہوں نے کتاب کے عنوان کو کس سلیقے سے اپنے اس شعر میں سمویا ہے جو حمد و حرم میں ان پر القا ہوئے تھے۔

میں نے صُبح حرم سے بدلی شمس
وہ جو رہتی تھی شامِ غم مُجھ میں

یہ شامِ غم اور حُزنِ شام ایک دوسرے کا پَرتو ہی تو ہے۔

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شمس الغنی صاحب کے ہاں مختلف ضائع و بدائع کا استعمال بہت دل کش فطری پیرائے میں ہوا ہے۔ بے ساختہ اور برجستہ فنی سطح پر وہ ایک ہنر منداور پختہ کار سخن گو ہیں۔

شمس الغنی صاحب کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار اس انتخاب کا وہ حصہ ہے جو غزلیات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ غزل کے لیے بنے ہیں۔ ان کی زیادہ تر توجہ غزل ہی کی طرف رہی ہے۔ زندگی میں غم اور خوشی ریلوے کی دو متوازی پٹریوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کی "حزنِ شام" سے یہ اخذ کرنا وہ میر کی طرح غم کے شاعر ہیں قطعی مناسب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ معتقدِ میر ضرور ہیں۔ اسی طرح وہ حافظ شیرازی اور

ریاض خیرآبادی کے مسلک کے شاعر ہیں۔ ریاض خیرآبادی نے سب سے زیادہ شاعری شراب کے بارے میں کی ہے لیکن زندگی بھر انہوں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

جام مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

اس شعر سے لگتا ہے کہ وہ غالب کے اس شعر کے مکمل ترجمان ہیں۔

گو ہاتھ میں جُنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر"آدھا گلاس بھرا ہے یا آدھا خالی ہے"۔ یہ محض آپ کا زاویہ نگاہ ہے کہ آپ اسے کیسا لیتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی لفظ EVIL پر غور کیا ہے۔ اسے الٹ کر پڑھیں تو یہ LIVE بن جاتا ہے گویا ذرا سی الٹ پلٹ نے EVIL کو LIVE بنا دیا۔ لہٰذا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ شاعر کو کس زاویۂ فکر سے دیکھتے ہیں۔

غزل کا شعر کہتے ہیں کہ ایک طرح سے جذبات واحساسات کا شارٹ ہینڈ ہوتا ہے۔ بات کو کسی حد تک کہہ کر چھوڑ دینا کمالِ ابلاغ ہے۔ ذرا دیکھئے تو:

خوشی کے رنگ نہ ڈھونڈ ہماری آنکھوں میں
اداس لوگوں کی آنکھیں اُداس رہتی ہیں

یارا میں شریک ان میں تجھے کر نہیں سکتا
یہ غم تو مری ہستیِ تنہا کے لیے ہیں

لفظ "یارا" کا باسلیقہ برتاؤ ایک عجب معنویت دے گیا ہے۔ ان کا یہ ہُنر قابل داد ہے۔ انہوں نے لفظ "یارا" کو اپنی زبان میں بولنے کا موقع دیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ پانی اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ اسی طرح غم کا حصّہ بھی ہماری ہستی میں خوشی کی طرح بہتا رہتا ہے۔ شاعر کی محبت اس کی ذات کا حصہ ہوتی ہے جب وہ محبت کی کہانی

سنانے لگتا ہے تو ہم بھی اس کی ذات کی دریافت نئے انداز میں کر رہے ہوتے ہیں۔محبوب کی بے رُخی اسے ہجر کے جزیرے کی طرف لے جاتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے۔

یہ شبِ ازل کا جلا ہوا جو بھڑک رہا ہے چراغِ جاں
یہ رسمِ پُرسش حالِ دل کبھی آؤ گے تو بجھائیں گے

....

تھا عذابِ عرصۂ زندگی تو شکستِ شیشۂ جسم و جاں
گل خشک تھے سرِ شام ہم، جو چلی ہوا تو بکھر گئے

....

یہ اپنے زعم میں رہتا ہے بے نیاز جاں
یہ شمس کون ہے مل کر تو اس سے آئیں، چلو

....

یہ شمس کون ہے؟ آپ محسوس کیجیے ان اشعار میں کتنا درد اور کتنی سچائی ہے نغمہ بھی ہے اور نوحہ بھی!

شاعری حساس لوگوں کی زبان اور وارداتِ قلبی کا اظہار ہے جسے ہم عرف عام میں محبت بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔اسی ایک مرحلے پر شمس الغنی صاحب کہتے ہیں کہ عاشقی خالہ جی کا گھر نہیں لہٰذا

ذرا ہمت کرو دو قدم پر موڑ فُرقت کا
چلو اس دو قدم کے فاصلے کو ختم کرتے ہیں

ان کی یہ بے ساختگی اور معصومیت دل کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ان کا تجاہلِ عارفانہ دیکھیے کہ لفظ ختم کو استعمال کر کے اسے دو آتشہ بنا دیا ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں

اول و آخر فنا ، باطن و ظاہر فنا
نقش کُہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

شمس الغنی صاحب اپنے بچھڑنے والوں کے لیےنوحہ کناں ہیں۔

کئی لوگ تھے جونہیں ہیں اب، کئی جام تھے جوشکست ہیں
میرے روز وشب کے یہ راز داں مرے غم گسار کدھر گئے

....

چار لمحوں کی حیات اس میں یہ شور و غوغا
لوگ اتنا کہیں دورانِ سفر بولتے ہیں ؟

....

یہ بھی تو رفتگاں میں ہے وہ بھی تو زندگاں میں تھا
اس کا خیال کس لیے اُس کا ملال کس لیے

خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے لیکن سب سرخ رنگ کے خون ایک جیسے نہیں ہوتے۔سکندر اعظم کے نام سے کون واقف نہیں۔ یہ وہی سکندر ہے جو ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن موت کے بعد خالی ہاتھ اسے صرف دو گز زمین پر قناعت کرنا پڑی۔ یہ وہ عظیم المیہ ہے جس سے ہر سکندر اعظم کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔موت کے بعد ہر آدمی سکندر اعظم بن جاتا ہے۔مزے کی نیند سوتا ہے اور اٹھنے کا نام تک نہیں لیتا۔

علامہ اقبال مسجد قرطبہ میں لکھتے ہیں

کونسی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

شمس الغنی صاحب کا انداز دیکھیے،

اے حسن بلاخیز کبھی عشق نہ کیجیو
یہ غم ترے قامت پہ سجا ہے نہ سجے گا

"حسنِ بلاخیز" کی ترکیب کوایک عاشق خستہ کے سوا کون سمجھ سکتا ہے۔

اسی طرح کرب کی انتہا کو پہنچ کر بے قابو ہوکر کہتے ہیں

پیوستۂ جاں تھا جو مری روح کے مانند
اُس شخص سے اب ہو کے جدا ٹوٹ رہا ہوں

کہتے ہیں محبت میں جدائی سب سے بڑا سچ ہے اور یہ انسان کا اولین اور آخری دکھ ہے۔ رشید قیصرانی نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کر اُسے رشیدؔ
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہو گیا وہ شخص

شمس الغنی صاحب کا فلسفۂ عجز و انکسار منفرد انداز کا حامل ہے۔ ذرا طرزِ دلربائی تو دیکھیے۔ کہتے ہیں

تا دیر رہے بزم طرب تیری سلامت
مل جائے بس ایک جام کہ درماندۂ شب ہیں

طالبِ مے کو تو غالب کی طرح بس یک گونہ بے خودی چاہیئے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ محفلِ ہاو ہُو یونہی آباد رہے۔ قائم چاند پوری کا کہنا ہے۔

مجلسِ واعظ تو تا دیر رہے گی قائمؔ
یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

قابل اجمیری نے کہا تھا۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

شمس الغنی صاحب کی سوچ کا زاویہ ملاحظہ ہو۔

ہر حادثہ عبارتِ لوحِ ازل نہ تھا
کچھ سانحے تو بس یونہی ناگاہ ہو گئے

دورِ حاضر کے ایک شاعر سلیم بے تاب کا اندازِ فکر بھی سُنیے

میں نے تو یونہی راکھ میں پھیری تھی انگلیاں
دیکھا جو غور سے تری تصویر بن گئی

زندگی بھی کتنی عجیب ہے۔ کوئی پل اتنی خوشی دے جاتا ہے کہ پھر ساری زندگی اس کھوئے ہوئے پل کی آرزو میں گزر جاتی ہے۔ مگر وہ لمحے جو گزر جاتے ہیں پھر واپس نہیں آتے۔ ہاں یاد کا حصہ بن کر ہمیشہ پاس رہتے ہیں اور ان یادوں کا ٹیپ ریکارڈر خاموشی سے چلتا رہتا ہے۔

ایسی ہی یادوں کی کرید میں شمس الغنی بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں

بہت لمبی تھی فہرستِ رفیقاں
نہ جانے کون کیسا ہے، کدھر ہے

احمد مشتاق نے اس آرزو کو یوں غزل کیا ہے۔

مل ہی جائیگا کبھی دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے
اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے
دل فسردہ تو ہُوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون حسیں کون جواں رہتا ہے

انسان جب اندر سے چٹختا ہے تو شمس الغنی بن کے سامنے آتا ہے۔ اپنے آپ کو خود سے کبھی چھپاتا ہے۔ کبھی ناظر ہوتا ہے تو کبھی منظر۔ یہ محبت بھی عجیب چیز ہے کبھی زندگی کا جذبہ بن جاتی ہے تو کبھی مرگِ آرزو کا پیغام، یعنی

اے کوئے غزالاں ابھی ہاتھوں میں سُبو ہے
یہ زہر بھی سینے میں اتر جائے تو سوچیں!

....

جامِ آخر سے کریں آؤ پذیرائی مرگ
چند لمحوں کی یہ مہلت جو ملی ہے یارو!

غالب جیسے عظیم شاعر کو بھی کہنا پڑا تھا

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

دورِ حاضر کی شاعرہ دُردانہ جلیل کا شعر بھی اس کے مماثل ہے۔

عمر بھر زہر اس امید پہ ہم پیتے رہے
آخری گھونٹ میں تریاق چھپا ہو شاید

(ان کا یہ شعر ان کی قبر پر کتبہ کی صورت میں کندہ ہے۔)

اے زر تو خدا نیست لیکن بخدا
ستار العیوب و قاضی الحاجات

(اے زر تو خدا نہیں ہے لیکن خدا کی قسم تو عیبوں کو چھپانے والا اور ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے)

اس ہوس زر نے کیا کیا بگاڑ پیدا نہیں کیئے۔ اپنوں کو اپنوں سے چھین لیا۔ اخلاقی اقدار کا جنازہ نکال دیا۔ معاشرتی ڈھانچہ زمین بوس ہو کے رہ گیا۔ ہمیں انسان سے وحشی بنا دیا لیکن پھر بھی والدین دین وایمان کے بعد سب سے زیادہ محبت اپنی اولاد سے کرتے ہیں لیکن یہی اولاد جب والدین کے مقابل آجائے تو شمس الغنی صاحب کو سنیے:

پھر کہیں ترکۂ اجداد ہوا ہے تقسیم
پھر کوئی بیچ میں دیوار اٹھی ہے یارو!

ایک دوسرا شاعر بھی کہے بغیر نہ رہ سکا

آنگن تو ایک تھا مگر اولاد کے لیے
کرنی پڑی ہے بیچ میں دیوار بھی!

میر کا شعر ہے،

دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

میر تو عالمِ مدہوشی میں پتہ نہ چلا سکے کہ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے مگر شمس الغنی صاحب

نے پتہ چلالیااور بتادیا کہ

کسی نے چھیڑا جو باراں میں نغمۂ صحرا
اٹھا وہ گوشۂ دل سے دھواں کہ کیا کہیے ؟

مزاروں پر دھوئیں محورِ رقص ہیں اور مساجد میں ویرانی سر بسجود دیکھتے ہوئے شمس الغنی صاحب اپنے آپ سے مخاطب ہیں:

مسجد میں ہوں جہاں آتا نہیں کوئی نمازی
مدت سے جو ویراں ہو وہ مرقد ہوں ،کوئی ہے؟
اُس پار مرے وادئ ایمن کی فضائیں
میں دشتِ بلاخیز کی سرحد ہوں ، کوئی ہے؟

یہ اشعار ہمیں علامہ اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ کی جانب لے جاتے ہیں جہاں ایسا ہی منظر نامہ موجود ہے۔ شمس الغنی صاحب دشتِ بلاخیز کی سرحد پر کھڑے ہو کر پکارتے ہیں۔کوئی ہے؟ جیسے کوئی ویران سرائے میں داخل ہوتے ہوئے حیرانی وسراسمگی میں کہے" کوئی ہے؟'' کوئی ہے کی تکرار نے اشعار میں ایک حُسن پیدا کر دیا ہے۔کوئی ہے؟ بڑا معنی پوش ہے اور یہی اس کا کمال ہے۔انہوں نے اپنی بات ،اپنے لہجے میں جرات مندی سے کہی ہے۔

چھوٹی بحر میں شعر کہنا خاصی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔شمس الغنی صاحب کے ان اشعار میں سہل ممتنع کا سحر دیکھیے۔

آپ کی بے وفائی سے دل میں
پھانس سے چُبھ کے رہ گئی صاحب
آپ نے غیر کہہ دیا ہم کو
بات ہی ختم ہو گئی صاحب

کس سادگی اور بھولپن سے انہوں نے شکوہ کیا ہے۔اس بارے میں دوسرے شعرا کا انداز دیکھیے۔

تم سے امید پرسشِ غم تھی
مسکرا کر گزر گئے تم بھی

....

آ گے نکل گئے وہ مجھے دیکھتے ہوئے
جیسے میں آدمی نہ ہوا، نقشِ پا ہوا

یادوں میں کھو جانا بنیادی طور پر ایک رومانوی طرزِ عمل ہے۔ شمس الغنی حُسن کا سچا پرستار ہے لہٰذا وہ ہجر و وصل کے درمیان ایک راستہ نکالتا ہے۔ وہ اپنی ایک بزم خیال سجا تا ہے اور اپنے حسین و جمیل محبوب کی یاد کے طلسم میں گم ہو جاتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔

کسی چشم و لب کے خیال کا کسی یاد کا
مرے گرد ہے یہ حصار کیوں کبھی سوچنا!

دوسری جانب ساقی کی طاقت اور اس کے غرور کا مقابلہ یوں کرتے ہیں۔

پیش آ تمکنتِ ساقی ذرا الفت سے
ہم تو وہ ہیں کہ ابھی چھوڑ کے کوثر آئے

اسی ٹکر کا کسی دوسرے شاعر کا شعر ہے۔

میں سمندر سے پلٹ آیا ہوں لے کر خشک ہونٹ
کوئی رکھے تو وقارِ تشنگی مری طرح

وہ کہتے ہیں گونگا گڑ کھا کر لطف اٹھاتا ہے لیکن بیان نہیں کر سکتا۔ شمس الغنی صاحب کے ہاں معاملہ مختلف ہے ہے وہ گڑ کا لطف اٹھا کر اس کے ذائقے کو بھی بیان کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بعض الفاظ کے استعمال سے اپنے کلام میں معنی خیزی اور لطافت پیدا کر دی ہے مثلاً

آواز نہ دینا تمہیں سوچ رہا ہوں
تسبیحِ توجہ ہے بکھر جائیگی صاحب

یہ تسبیح توجہ کی ترکیب نے اپنے اندر ایک ندرت اور جدت پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح اس غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

یہ شب کہ فروزاں تھی مرے خوں سے مگر اب
پُوچھو تو ذرا اس سے کدھر جائیگی صاحب

پوچھوتو ذرااس سے کی بے ساختگی اور معصومیت بھی دل کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ کیا خوب مکالماتی شعر ہے۔

ایک بڑی دلچسپ صورت حال مشاہدے میں آئی ہے کہ علم الاعداد کے حساب کی رُو سے شمس الغنی اور ان کی کتاب حُزنِ شام کا مفرد عدد علی الترتیب ٦ کا بنتا ہے۔ کیا خوب صورت اتفاق ہے۔ عدد 6 کے حامل افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ افراد کم گو، عمل پسند اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کا ہر قدم بڑا سوچ سمجھ کر اٹھاتے ہیں۔ یہ خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں مگر اس بات کا ذکر اور احساس دوسرے کونہیں ہونے دیتے۔ دوسروں پر زیادہ اور اپنے آپ پر کم اعتبار کرتے ہیں۔ لین دین کے معاملے میں یہ افراد کوڑی کوڑی کا حساب رکھتے ہیں اور اس مسئلے میں ان کو بے وقوف بنانا بہت مشکل ہے۔

انہوں نے ایک انگریزی نظم بعنوان" NR '' کہی ہے۔ NR یقیناً ان کی کسی محبوب ہستی کے نام کا اختصار ہے جن سے انہیں خاص لگاؤ تھا یا ہے۔ شمس الغنی جذبوں کے شاعر ہیں ان کے جذبے سچے ہیں جنہیں انہوں نے ادبی دیانتداری کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ نظم ان کی سچائی کا جھروکہ ہے۔

اعتبار ساجد نے ان کے NR کو یوں رقم کیا ہے۔

ابھی ریل کے سفر میں ہیں بہت نہال دونوں
لیکن روگ نہ بن جائے یہی ساتھ دو گھڑی کا

یعنی

Had I known the pangs of love, I would have declared from door to door , Love not, Love not, Love not!

اور جلیل عالی کہتے ہیں

دل آباد کہاں رہ پائے اس کی یاد بھلا دینے سے
کمرہ ویراں ہو جاتا ہے اک تصویر ہٹا دینے سے

NR نظم کا متبادل عنوان" یادیں پاگل کر دیتی ہیں" بھی ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

ادب کے ایک بڑے نگہباں... جمیل جالبی

میری یادوں میں 14 اگست 2016ء کا دن ایک ایسا دن بن کر محفوظ ہے جس دن چند گاڑیوں اور ایک ایمبولینس کا کارواں یونیورسٹی روڈ سے گزرتا ہوا جامعہ کراچی میں داخل ہوا، جہاں ایک شیخ الجامعہ اپنے نام سے منسوب لائبریری میں ایک دوسرے شیخ الجامعہ کے انتظار میں تھے کہ اب وہ ان کے پڑوسی بننے والے تھے۔ جامعہ کراچی نے اگرچہ ان کے نام سے کوئی ادارہ نہیں بنایا تھا بلکہ خود وہ اپنی چار سالہ تقرری کے جواب میں اس کے احاطے میں اپنی تحریر کردہ ڈھیروں کتابوں، مضامین، خطوط، مسودے، مخطوطات، اعزازات اور جمع شدہ ہزاروں قیمتی کتابوں کا تحفہ ایک سفید عمارت کی صورت میں پیش کرنے آرہے تھے۔

وہ اپنی ٹانگوں سے چلنا بھول گئے تھے، بول بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کی انگلیاں حروف لکھنے سے قاصر تھیں۔ جسمانی ضعیفی انہیں قدرت کی طرف سے ملی تھیں مگر آنکھیں اب بھی روشن تھیں۔ دو آنکھوں کی دو پتلیوں میں ڈھیر ساری خوشیوں اور امنگوں کی موج ہی موج تھی۔ پتانہیں ذہن کام کررہا تھا یا نہیں، مگر ہاں جب میں نے ان کے سامنے جھک کر سلام کرنے کے بعد پوچھا ''جالبی صاحب! مجھے پہچانتے ہیں؟'' تب پتلے پتلے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ نے میرے سوال کا جواب کیا دیا کہ میں خوشی سے نہال ہوگئی۔ گذشتہ پچاس سال کی قربت اس ایک مسکراہٹ کی طلب گار تھی۔

اس دن جامعہ کے یہ سابق شیخ الجامعہ ہاتھ میں قلم کے بجائے ایک ایسا پتھر اٹھائے ہوئے تھے کہ جس سے انہوں نے زمین کے اس خوش قسمت گوشے کو جگمگا کر رکھ دیا۔ پھر وہ ہر ذی روح کی طرح دنیا سے چلے گئے۔

دنیا سے تو سب کو ہی جانا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ جانے والا اپنے پیچھے چھوڑ کیا گیا ہے؟ اولاد، خاندان، جائیداد...... یہ تو ہر ایک کی یادگار ہوتی ہے، پھر یہ تینوں چیزیں بھی وقت گزرنے

کے ساتھ روپوش ہوجاتی ہیں۔ بس رہ کیا جاتا ہے اس کا کیا ہوا کام اور نام۔ میر جعفر بھی اپنے کام اور نام سے زندہ رہتا ہے اور ٹیپو سلطان کا نام بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ ایک تاریخ میں سیاہ ورق اور دوسرا سنہرے حروف میں ہمیشہ کے لیے زندگی پا جاتا ہے۔ بس یہی دو قبیلے ہیں، باقی سب ان ہی دو قبیلوں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ جنہوں نے سنہرے کام کیے ہوتے ہیں کام ہوتے ہیں۔ پل بنا' چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔ اس میں ایک چمکنے والا کام قلم اور کاغذ ہے' استعمال ہونے والا قلم بھی ہوتا ہے جو کتابوں اور مضامین کی صورت میں بہتوں کے ذہن میں چراغ بن کر روشنی پھیلانے کے کام آتا ہے۔

جمیل جالبی اپنے نام کی طرح جمیل اور خوب صورت تھے۔ لمبے تڑنگے، خوش رو، خوش لباس۔ ان کے ہاتھوں کی گرفت میں آئے ہوئے قلم نے تو ایسا کمال کیا کہ جوش صاحب بھی بے ساختہ کہہ اٹھے''اب اور کیا چاہتے ہو پیمبری مل جائے۔''

جالبی صاحب شہرت و مقبولیت کی ایسی منزل بنے جو آفتاب آمد دلیل آفتاب کی منزل ہے۔ جب ہی تو جوش صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ جالبی چشم بددور نکیلے جوان اور طباع انسان ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور لہجے میں شرافت کی کمک پائی جاتی ہے۔ قدرت نے ان کو سخن فہمی اور بذلہ سنجی کا جوہر بھی عطا کیا اور برمحل صحیح بات کہنے کی صلاحیت بھی دی۔ ان کی شخصیت میں جاذبیت اور ان کی عقل میں تابانی کا امتزاج ہے۔

جالبی صاحب کی سیرت اور شخصیت کے لیے الفاظ کی فہرست طویل ہے۔ بس اتنا بھی کہہ دیا جائے تو کافی ہے کہ وہ جمیل بھی ہیں اور خوش جمال بھی۔ خوش صورت اور خوش سیرت ہیں۔ ادیب ہیں اور ادب نواز بھی۔ ان کے کاموں کی ایک تاریخی نوعیت ہے۔ دانشور کی حیثیت سے قبیلہ ادیباں کے چشم و چراغ ہیں وہ۔

جالبی صاحب کے دوست کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے زیادہ ناآسودہ انسان نہیں دیکھا۔ انہیں اپنے کام سے کبھی مطمئن نہیں پایا، ان کی نظر ہمیشہ اپنی کمزوریوں پر رہتی ہے اور ہر وقت اس ادھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح اپنی تحریر و فکر کو خوب سے خوب تر بنائیں۔

جالبی صاحب نے ایک بار کہا تھا''میں تو ہر وقت حالتِ سفر میں رہتا ہوں۔ لوگ مجھ سے

پوچھتے ہیں کہ میرے ذہن پر سب سے زیادہ اثر کس کا ہے؟ میں ان کا جواب نہیں دے پاتا۔ سفر میں تو انسان ہر روز نئی چیزیں دیکھتا ہے۔ نئے نئے مناظر اس کے سامنے آتے ہیں۔ کسی ایک سے متاثر ہوکر اس لکیر کو پیٹنے کے معنی تو یہ ہیں کہ سفر حضر میں بدل گیا ہے۔ مسافر نے قیام کرلیا ہے اور پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ مگر چلتے رہنا ہی تو زندگی ہے اور زندگی بہت مختصر ہے۔''

مجھے یاد ہے، میں نے ایک بار جالبی صاحب سے شکوہ کیا تھا کہ جالبی صاحب آپ تقاریب میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ ہم آپ کا نام دیکھ کر اس تقریب میں جاتے ہیں کہ آپ کو سنیں گے، کچھ سیکھیں گے مگر آپ کو وہاں نہیں پاتے۔ انہوں نے کچھ دیر خاموشی کے بعد مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا ''سننے اور سیکھنے کے لیے گھر آجایا کرونا۔ آتی تو ہو ہی۔ جب تم بیمار ہوئی تھیں، اسپتال میں تھیں میں نے تمہاری کمی محسوس کی تھی، صحت یابی کی دعا بھی کی تھی۔'' مجھے ان کی یہ محبت بہت اچھی لگی تھی۔ مگر میرا سوال پھر بھی اپنی جگہ پر تھا، وہ جواب دینا چاہتے تھے مگر پہلے انہوں نے میرا دل رکھا۔ پھر کہا ''تقاریب کا میں مخالف نہیں، مگر تقاریب میں بہت وقت صرف ہوجاتا ہے۔ تقاریب ختم ہوتی ہیں تب تاریخ کا وہ صفحہ پھٹ جاتا ہے۔ زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ میں نے جو کام اپنے ذمے لے لیا ہے، اس میں ایک نہیں دو زندگی چاہیے اور جو کسی کو نہیں ملتی۔ بس میں وہ وقت بچا لیتا ہوں۔ کچھ پڑھ لیتا ہوں، تحقیق میں جُٹ جاتا ہوں اور پھر کچھ لکھ لیتا ہوں۔ اصل میں مَیں نے اپنے کو کھنگالا، میں تقاریب کا آدمی ہی نہیں ہوں۔''

جالبی صاحب نے طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنی مٹھی میں وقت کو قید کرلیا تھا، وقت کی اہمیت بھی جان لی تھی، جب ہی تو اپنے روز وشب ''وقت'' کو پیش کردیے۔ ڈھیروں ایسی کتابیں لکھیں جن کے ایک ایک حرف کو تحریر کرتے وقت نوک پلک سے سنوارا، وہ باتیں لکھیں جو ہمیشہ رہ جائیں، مٹانے سے بھی نہ مٹیں۔ وہ تاریخ مرتب کی جو تاریخ بن جائیں، وہ تحقیق کیں جو تحقیق کی مستحق تھیں، ایسی ادارت کی کہ آنے والا مدیر اس سے سبق سیکھے، وہ صحافت کی جو بامعنی اور بے غرض کہلائے، مترجم ایسے کہ آنے والوں نے ترجمے کے اصول ان سے پوچھے، وہ لغت مرتب کی کہ لغت نگاروں کی ترتیب میں اپنا نام سرفہرست رکھ دیا۔

یہ بھی ہوا کہ وقت نے ان کی قدر کی، انہیں اپنے ہر ہر کام پر داد بھی ملی اور اس لیے ملی کہ انہوں

نے وقت سے کام لیا اور کام سے ہمیشہ قائم رہنے والا وقت لیا۔ کہتے رہے" اصل چیز کام ہے۔ اس کی خوشبو ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اگر میرا کچھ کام ہے تو اس کی خوشبو آج نہیں تو کل پھیلے گی ضرور۔"

کسی نے ان کے کام سے متاثر ہو کر کہا" جالبی صاحب! آپ نے دس سال میں کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اتنا لکھا کہ شاید ہی برِ اعظم پاک و ہند میں کسی نے اتنا لکھا ہو۔" یہ سن کر ان کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی، آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ وہ اپنی تعریف سن کر ایسے ہی ہو جاتے، شرما سے جاتے۔

کسی نے جب ان کے سامنے ان کے انعامات و اعزازات کی فہرست دہرائی تو وہ یوں سن رہے تھے جیسے کسی دوسرے کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہو۔

آج کل 23 مارچ کے عطا کردہ اعزازات کا ذکر عام ہے۔ یقیناً یہ اعزازات کام کرنے پر ہی ملتے ہیں اور ملنے بھی چاہئیں کہ انسان اپنے کام کا صلہ تو چاہتا ہی ہے۔ مگر عجیب سا یوں لگتا ہے کہ اس اعزاز کو اپنے نام کے ساتھ ایسے جوڑ لیتا ہے کہ جیسے ولدیت ہو۔ ڈرتا ہے ایسا نہ کیا تو کہیں اس سے چھن نہ جائے۔

پتا نہیں کیوں مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ خود پسندی ہے۔ کام نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اعزاز ہوا میں جھولتا محسوس ہوتا ہے۔ جالبی صاحب کو ملنے والے اعزاز درجنوں کی تعداد میں ہیں، حتیٰ کہ دنیا سے جانے کے بعد بھی ادب کا سب سے بڑا نشان اُن کے حصے میں آیا، مگر انہوں نے وصول ہونے کے بعد دوسرا بڑا کام کرنے پر اپنے آپ کو تیار کیا، نام کا حصہ نہیں بنایا۔

جالبی صاحب دل کے صاف، زبان کے کھرے، صاف گو انسان تھے۔ نہ دھوکہ دیتے تھے نہ کسی سے دشمنی نکالتے۔ بدلہ یا انتقام کے معنی بھی وہ نہیں جانتے۔ معاف کرنا ان کا مسلک تھا، وہ تو دشمنوں سے بھی دشمنی نہیں کرتے۔ کہتے" یہ سب فرصت کی باتیں ہیں اور میرے پاس تو فرصت کی کمی ہے۔" ادب میں پارٹی بازی، گروہ بندی عام رہی ہے۔ جالبی صاحب نے اپنے آپ کو اس سے دور رکھا۔ وہ متوازن انسان تھے۔ فرشتہ نہیں تھے، بس انتہا پسندی سے گریزاں رہے۔ خاموش یوں رہتے کہ بولنے سے سوچنا بہتر خیال کرتے۔

لکھنا ان کا مشغلہ بھی تھا، ضرورت بھی اور شوق بھی۔ دراصل انہیں ہر لمحے شام ہونے کا کھٹکا لگا

رہتا۔ سمجھتے کہ دونوں وقت مل رہے ہیں، کبھی بھی بلاوے کی گھنٹی بج جائے گی، قلم رکھ دینا پڑے گا، اوراق اڑنے لگیں گے، انہیں سمیٹ کر رکھ لیں، بس ایسا کچھ کر کے تیار رہیں کہ زمانے کو بہت یاد رہیں۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ جالبی صاحب اپنی خواہش کے مطابق ہماری ادبی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے باوقار نمائندہ بن کر آج بھی جی رہے ہیں، جبکہ اجل نے اپنے اٹل وجود اور سفا کی سے ان کا جسمانی وجود چھین لیا ہے، تب بھی وہ اپنے کام کا جھنڈا لہرا کر، مسکرا کر اطمینان کے ساتھ موت سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں:

''جی جان سے کیا ہوا کام کبھی مرتا نہیں۔ کام کرنے والا بھی امر ہو جاتا ہے۔ ہمت ہے تو کام اور کام کرنے والے کا نام مٹا کر دکھاؤ۔''

پانچ سال گزر گئے، اجل ان کا جسم اپنے ساتھ لے گئی، یہ حقیقت ہے مگر میری یادیں آج بھی تازہ ہیں۔

میں انہیں جمیل جالبی ریسرچ لائبریری کی عمارت کا پہلا پتھر نصب کرتے دیکھ رہی ہوں اور ان کے ساکت جسم کو بھی۔ جب انہوں نے اپنا آخری سفید لباس پہنا تھا اور سکون سے سو رہے تھے، میں نے جھک کر اپنی آنکھوں سے دو قطرے بہاتے ہوئے ان سے پوچھا تھا ''آپ مجھے پہچانتے ہیں؟'' وہ جواب میں کیا کہتے۔ مگر شاید ہدایت دے رہے تھے اس عمارت کی حفاظت اور کارکردگی میں مَیں ایک نام تمہارا بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ میری خوش فہمی سہی مگر میں اس خوش فہمی کو اُس وقت تک قائم رکھوں گی جب تک میرے جسم میں حرکت موجود ہے کہ مجھے اُن کے نام، اُن کے کام کی خوشبو جینے میں مزا دے رہی ہے۔ میں اُن سے مخاطب ہوں:

''جالبی صاحب! آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس خوشبو میں شامل رکھا ہوا ہے۔''

☆☆☆

وادیٔ جمیل... ڈاکٹر جالبی ریسرچ لائبریری

میں برف جیسی سفید عمارت کے ایک خوب صورت کمرے میں اونچی سی کرسی پر بیٹھی ہوں۔ دروازے پر میرے نام کی تختی لگی ہے۔ دائیں بائیں کتابیں ہیں۔ دیوار پر سامنے کیلنڈر اور قائداعظم کی خوب صورت تصویر آویزاں ہے۔ چھت سے فرش تک شیشے کی کھڑکیاں ہیں جن سے باہر دیکھا جاسکتا ہے، لیکن باہر سے اندر کچھ نظر نہیں آتا۔

میرے ہاتھ میں قلم اور ذہن میں یادوں کی پانچ دہائیوں پر مشتمل تصویری، تحریری اور بصری کہانیاں ہیں جن میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ کبھی پہلے کی تصویریں بعد میں، اور کبھی بعد کی تحریریں پہلے سامنے آ رہی ہیں۔ میں ایک یاد میں تھوڑی دیر گم ہونے کے بعد ترتیب بدل لیتی ہوں۔

پچاس سال پہلے اچانک میں نے جالبی صاحب کو اپنے سے بہت قریب پالیا تھا، اس سے قبل ان کی تحریروں کو پڑھا اور انہیں مجلسوں میں محض دیکھا تھا۔ اتنی قدآور شخصیت سے بس اتنا ہی واسطہ ممکن بھی تھا، مگر کبھی کبھی بہت چھوٹے لوگوں کو بہت بڑے لوگوں کی صحبت کسی ایک نیکی کے سبب مل جاتی ہے۔ یہ نیکی میرے حصے میں بھی آ گئی تھی۔ نیکی کا نام خاور تھا جو بڑی شخصیت کا بیٹا تھا۔ عمر میں وہ مجھ سے ڈیڑھ دہائی چھوٹا تھا اور میں اُس سے آدھی صدی بڑی تھی۔ اس رشتے کو کیا نام دیا جائے، آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا لیکن جالبی صاحب نے ان دونوں چھوٹے بڑوں کے درمیان اپنے آپ کو''ڈاکیا'' کا خطاب دے دیا تھا۔ جب ہر ایک کے ہاتھ میں موبائل فون نہیں بلکہ کسی کسی گھر میں ایک لینڈ لائن فون ہوا کرتا تھا جسے گھر کا کوئی ایک مہربان اٹھاتا اور مطلوبہ شخص کو پکڑا دیا کرتا تھا۔ یوں میرا فون مطلوبہ شخص تک پہنچانے کی ذمہ داری جالبی صاحب نے لی ہوئی تھی۔ اُن دنوں مجھے جالبی صاحب کو بار بار، جلدی جلدی اور قریب سے دیکھنے کا بارہا موقع ملا۔ یہ موقع میری زندگی میں خوشگوار جھونکے کی طرح سرایت کرتا رہا۔ خوش شکل، خوش لباس، دھیمے مزاج، آہستہ گفتگو، آواز میں نرمی، رویّے میں مروت، شخصیت میں شرافت اور علمیت کی با آوازِ

بلند بولتی حقیقت نے اوروں کی طرح مجھے بھی ان کی الفت، محبت، عزت اور عقیدت میں قید کرلیا تھا۔

میں نے ان کے ذریعے بڑے اعزاز پائے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی چھوٹی موٹی کہانیوں میں مجھے شریک کیا۔ واقعات بتائے جو کہیں تحریر نہیں ہوئے تھے۔ وہ باتیں بھی کیں جو اُن کے محض اردو کی محبت میں جکڑے جانے کا سبب بنیں۔ انہوں نے کب یہ سوچا کہ زندگی مختصر ہے اور جو راستہ انہوں نے ادب کی خدمت کا سوچا ہے وہ زیادہ مدّت چاہتا ہے۔ مگر عجب بے بسی ہے کہ زندگی دوبارہ نہیں ملتی اور چاہ کر عمر بڑی نہیں ہوتی۔ ملازمت اسی لیے چھوڑی، مجلسوں سے اسی لیے معذرت کی، وقت کی گرفت اپنی انگلیوں میں کس کر کی، قلم پکڑا اور جُٹ گئے وقت اور زندگی کو شکست دینے کے لیے۔

یہ بھی بتایا کہ ہر انسان کی ذہنی تربیت میں اس کے اساتذہ کا رول اہم ہوتا ہے، خوش قسمت ہوتا ہے تو اسے میرے اساتذہ جیسے استاد میسر آ جاتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ کسی کام کو شروع کرنے اور اختتام تک پہنچانے کے لیے اس کام سے عشق اور جنون کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ دونوں جذبے نہ ہوں تو کام تو تکمیل پا جاتا ہے مگر اس کام میں خامیاں زیادہ اور خوبیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

انہوں نے یہ بھی کہا: آج کی شہرت، عزت، خطاب، اونچی کرسی اور تالیاں ہمیشہ ساتھ نہیں دیتیں۔ ضروری نہیں کہ یہ تمام باتیں کتابوں میں تحریر ہو کر تاریخ بن جائیں۔ یہ دھندلکوں میں گم ہوجاتی ہیں، لہٰذا سوچ سمجھ کر تالیوں کو اپنی زندگی میں لازمی حصہ دینا چاہیے۔

نعرے کبھی شخصیتوں کو لافانی نہیں بناتے، اس کے لیے انہیں محنت اور عرق ریزی سے کام کرنا چاہیے۔

انہوں نے ہر وہ بات کی جس پر وہ خود عمل کرتے تھے۔ میں اس سفید عمارت کے خوب صورت کمرے میں بیٹھی اس تمام گزری گفتگو کو ذہن میں آنے کی دوبارہ دعوت دے رہی تھی کہ ایک دم سے 14 اگست 2016ء کا وہ دن یاد آ گیا جب وطنِ عزیز میں وطن کی آزادی کے سبب چھٹی تھی۔ دن کے دو بجے ایک موبائل میں جالبی صاحب اور بیگم جالبی وہیل چیئر میں بیٹھے بیٹھے جامعہ

کراچی کی زمین پر اترے۔ وہی جامعہ کراچی جس میں وہ چار سال کی وہ مدت گزار چکے تھے جو ان کی تمام تر ملازمتوں سے بڑھ کر خوش گوار ملازمت تھی۔ جسے انہوں نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا تھا اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹوں کی مسلسل محنت اور کام سے جامعہ کے وقار کو چار چاند لگانے میں گزارا تھا۔ ہر ٹیڑھی لکیر کو سیدھا کرنے کا عزم کیا تھا۔ سواری کا نظام ہو، اساتذہ کی مشکلات ہوں، سڑکوں کی مرمت ہو، تنخواہوں کی بے قاعدگی ہو، امتحانوں کی تاریخ کا ہر آن بدلتا کیلنڈر رہو، طلبہ تنظیموں کے نعرے اور دھمکیاں ہوں، کس کس کو انہوں نے قابو نہیں کیا۔

اس دن جالبی صاحب کے چہرے پر وہ سرخی نہیں تھی کہ جو اُن کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے دوران ہوا کرتی تھی۔ نہ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی، نہ آنکھوں کی وہ روشنی تھی جو دور تک جاتی تھی، نہ پان منہ میں تھا، نہ ہاتھ میں کوئی کتاب یا قلم۔ ہاں سر پر پشاوری گول ٹوپی تھی جو ایسے میں ان پر پوری طرح سج رہی تھی اور دھوپ کی تمازت سے انہیں بچا بھی رہی تھی۔ وہ خاموش تھے کہ وہ بولنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ میں نے اپنی یاد کو شدت سے یاد کیا۔ ''جالبی صاحب! مجھے پہچانا؟'' میں نے ان کے سرد اور کمزور ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کوشش کر کے مسکراہٹ کو ہونٹوں پر لانے کا عزم کیا، کہ ان کا جی اب بھی مروت اور محبت سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ ایسی آواز آئی ''ہاں ہاں، تم نوشابہ ہو'' یہ آخری کلام تھا جو میرے ان کے درمیان ہوا۔ وہ لمحہ میری گرفت میں کیا آیا کہ آنسو ٹپک کر صاف شفاف میز پر چھلک پڑے۔ میں ان قطروں کو اُس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ غائب نہیں ہو گئے۔

کمزور سے ہاتھوں سے انہوں نے اس پتھر کو نصب کیا جو ان کی کتابوں کی حفاظت کی قسم کھانے کو تیار بیٹھا تھا۔

مجھے یاد آئی ان کی وہ لائبریری جہاں انہوں نے قیمتی کتابوں کا میلہ لگایا ہوا تھا۔ وہ بڑے منظم اور سلیقہ مند آدمی تھے۔ ادبی کاغذات اور اپنی ذات سے متعلق تمام تحریروں کو بڑے سلیقے اور ترتیب سے رکھتے۔ مختلف فائلیں، اخبارات کے تراشے، دوسرے ضروری کاغذات اور اپنے نام آئے اہم لوگوں کے خطوط جو بڑے بڑے ڈبوں میں بند تھے، ان ڈبوں پر نمبر درج اور ہر ڈبے کا نمبروار اشاریہ۔ کیا کمال کا نظم وضبط تھا جیسے کہ وہ ایک ماہر لائبریرین ہوں۔ شاید انہوں

نے زندگی میں اپنی ان تمام قیمتی تحریروں، کتابوں، اعزازات کے لیے کسی نئی عمارت کا نقشہ ذہن میں نہ بنایا ہو مگر تاریخ اپنے طور پر یہ کام کرنے کا کام انجام دے رہی تھی۔ یوں بجھی بجھی سی زندگی کے آخری ایام نے ان کا نہ دیکھا خواب بھی شرمندۂ تعبیر کر دیا تھا۔ میں اس دن اسی کمرے کی خالی زمین پر کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ کیا ایک ایسی لائبریری کی عمارت جالبی صاحب کی زندگی میں تعمیر ہو پائے گی، کیا اللہ تعالیٰ انہیں اتنی مہلت دے پائیں گے۔ میرے ذہن نے نفی کی گھنٹی بجادی۔ اس دن بھی ایسے موقع پر میری آنکھوں سے آنسوؤں کے کئی قطرے گر کر زمین میں کھو گئے تھے۔

وہی ہوا، پانچ سال بعد جب اس سفید صاف ستھری عمارت کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی، جالبی صاحب چلتے چلتے دور دیس جا چکے تھے اور میں اسی عمارت کے ایک کونے میں اسٹیج پر کھڑی روسٹرم پر رکھے مائیک پر اعلان کر رہی تھی ''آج 14 اگست 2021ء ہے اور آج جمیل جالبی ریسرچ لائبریری کا افتتاح ہے''۔ اس اعلان کے دوران بھی میری آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو بیج زمین میں بوتا ہے، اس کی چھاؤں اس کے کام آئے۔ یہ ہمیشہ دوسروں کے کام آتی ہے اور یہ صدقۂ جاریہ ہوتا ہے، اور کسی کسی کو اس صدقۂ جاریہ کا اعزاز ملتا ہے۔ بعد از مرگ یہ اعزاز بھی جمیل جالبی کے نام ہوا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس لائبریری کا یہ خوب صورت سا کمرہ جس کے دروازے پر میرے نام کا بورڈ لگا ہے، مجھے ملے گا؟ جو مل گیا ہے۔ مجھے جالبی صاحب کی وہ تاکید یاد آ گئی ''تم اور خاور ساتھ ہوتے ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے۔'' وہ اب بھی ہمارے درمیان ڈاکیا بنے اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ میں اپنے گھر سے بہت دور، اپنی مادرِ علمی کی اس عمارت میں جو جالبی صاحب سے منسوب ہے، روز ہی بیٹھتی ہوں۔ گویا روز ان کو دیکھے بغیر یاد کرتی ہوں اور یقین دلاتی ہوں کہ ہم میں آج بھی محبت اور عزت کا رشتہ قائم ہے۔ اگرچہ نہ مجھ میں علمیت ہے، نہ ادبی صلاحیتیں کہ میں اتنے خوب صورت کمرے میں بیٹھوں، مگر قدرت نے اور آپ نے مجھے اس کا پابند رکھا ہوا ہے۔

میں نے قلم اپنی انگلیوں میں دبایا ہوا ہے اور خالی صفحے پر اپنی یادیں اور محسوسات قلم بند کر رہی ہوں۔

آپ سے یوں مخاطب ہوں:

اے وادیٔ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں

میں اس کمرے سے باہر نکل آئی ہوں۔ دن کے دو بجے ہیں، دھوپ کی شدت ہے، میں نے چاروں طرف چکر کاٹے ہیں اور پھر اس کے مرکزی دروازے پر آ کر رک گئی ہوں۔ صاف شفاف سفید عمارت، اس میں سجی سجائی قیمتی کتابیں میری نظروں میں گھوم رہی ہیں۔ مجھے اس میں علم کے شائق طالب علم جوق در جوق آتے نظر آ رہے ہیں، جو ابھی آئے نہیں آنے والے ہیں۔ پتا نہیں میری زندگی ان کے آنے تک اس عمارت میں یوں ہی رہے گی یا نہیں۔

پیڑ لگانے والے سائے سے محروم رہتے ہیں اور دعائیں دے کر چلے جاتے ہیں۔ میرے لبوں پر بھی دعائیں ہیں ؎

دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسین فضائیں بسی رہیں

☆☆☆

ناقابلِ فراموش شخصیت ... نواب بہادر یار جنگ

مرزا غالب نے کہا تھا ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

نواب بہادر یار جنگ کے آباواجداد کا پیشہ بھی سپہ گری ہی تھا لیکن ذریعۂ عزت بننے کے لیے آباواجداد کے ہی پیشے سے عزت ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو تاریخ کے اوراق ہمیں بتائیں گے کہ ابتدائے آفرینش سے مسلمانوں کا سپہ گری سے ہی تعلق تھا۔

برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کے کئی اسباب تھے جن میں سب سے اہم سبب عسکریت سے غفلت تھی۔ نوسو سال کی حکومت کے زوال کے بعد بھی مسلمانوں کو یہ ہرگز نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ سپہ گری سے غفلت کے باعث کمزور ہو چکے ہیں جبکہ ان کے مقابل ہندوؤں نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کے بعد مسلم ریاستوں میں اکھاڑوں، ورزش گاہوں اور دنگل کے نام پر عسکری تربیت شروع کر رکھی تھی کہ یوں طاقت کے ذریعے مسلم اقتدار کی تمام تر نشانیوں کو ختم کر دیا جائے۔

اس حقیقت نے نواب بہادر یار جنگ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے ہم وطن مسلمانوں کو متحد کر کے ان میں جرأت، ہمت اور عسکری طاقت پیدا کر دیں۔

یہاں سے جاگیردار نواب بہادر یار جنگ ''خاکسار'' بن گئے۔ یہاں سے جاگیردار محمد بہادر خان نے نواب بہادر یار جنگ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ عام رضا کار کے طور پر خاکی وردی پہن کر بیلچہ اٹھا لیا۔ ننگے پیر ہو گئے۔ پھر ضلع ضلع، گاؤں گاؤں پہنچے۔ مجلس اتحاد المسلمین کے منشور سے متاثر ہوئے تو اس کے بھی رکن بن گئے۔

بعدازاں ریاست حیدرآباد کے رکن ہونے کے سبب مسلم لیگ کے رکن نہیں بن سکتے تھے تو بغیر رکن بنے، بغیر کوئی عہدہ سنبھالے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آ گئے اور قائداعظم کے رفیق کار

بنے۔

یوں دھیرے دھیرے قدم بہ قدم چلتے ہوئے انہوں نے انتہائی سمجھ داری سے اپنا مقام بنایا، ساتھ ہی یہ ذہن بھی بنالیا کہ پارٹ کوئی بھی ہو، کام مسلمانوں کے لیے کرنا ہے، ان کے مفاد پر نظر رکھنی ہے اور انہیں ایک باعزت مستقبل دینا ہے۔

قوموں کی تاریخ دھیرے دھیرے تحریر ہوتی ہے۔ برصغیر کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ٹیپو سلطان کا لہو نہ گرتا، سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں درس گاہ کی بنیاد نہ ڈالی ہوتی، بی اماں نے محمد علی اور شوکت علی نہ پیدا کیے ہوتے، علامہ اقبال اپنا پُرتاثیر نغمہ لے کر میدان میں نہ اترے ہوتے، تب محمد علی جناح کا لندن سے واپس آنا ممکن نہ ہوتا۔ اور اگر یہ بے مثال لیڈر اپنی کڑک دار آواز میں ایک الگ وطن کی جنگ نہ لڑتا تب محمد بہادر خان جاگیر دار کا جاگیر دار ہی رہتا۔

اور اس کی گرج دار آواز سے سرزمین ہندوستان نہ لرزتی۔ پھر تو پاکستان بھی نہ بن پاتا۔

محمد بہادر خان تحریکِ پاکستان کے وہ درخشندہ ستارہ ہیں جن کے لبوں پر ملّتِ اسلامیہ کا پرچم لہراتا رہا ہے۔ جو پاکستان کی بنیادوں میں ایمان، ایقان، عہد، قربانی، سچائی اور جدوجہد کا بیج بوتے رہے ہیں۔ جن میں اتنا دم خم تھا کہ اپنی گرج دار آواز میں قائداعظم کو مخاطب کر کے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ''محترم جناح صاحب! اگر پاکستان اسلامی اصولوں سے عاری ہوا تو ہمیں ایسا پاکستان ہرگز نہیں چاہیے۔''

یہ محمد بہادر خان دکن کے ایک بڑے جاگیر دار تھے جہاں غرور، ظلم، انا، عیش و عشرت زندگی کی بنیادوں میں شامل ہوتے ہیں۔ بلاشبہ جاگیر دار دیگر ڈھیروں اچھائیاں بھی رکھتے ہیں، لیکن محمد بہادر خان نے جاگیر دار کی تعریف سرے سے بدل کر رکھ دی۔ فروتنی، عاجزی، خاکساری، رحم دلی کو بھی ایک جاگیر دار کی سیرت کا حصہ بنا ڈالا۔

ان کا کہنا تھا ''ملّتِ محمدی کے راستے میں جس دن ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں اور جسم زخموں سے چور چور ہوگا وہ دن میرے لیے عید کا دن ہوگا۔''

ایک جاگیر دار ٹولے نے حیرت سے اس نوجوان کو دیکھا۔ اسے تو نواب بہادر یار جنگ کا

خطاب بھی ملا ہے، اسے تو تختِ شاہی پر بیٹھ کر زندگی گزارنی چاہیے۔ تب اُس نے اس ٹولے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''میں اس خطاب کو ماتھے کا جھومر تو بنا سکتا ہوں لیکن اگر یہ میرے اپنے اصولوں سے ٹکرایا تب اسے ٹھکرا بھی سکتا ہوں۔''

قول کے سچے اور پکے بہادر نے ایک شعر پڑھ کر اسے واقعی ٹھکرا بھی دیا:

آ گئے تھے برق کی زد میں تمام اہلِ چمن
ہم نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

پھر امتِ مسلمہ کے ممالک کے سفر پر چل پڑے۔ کہتے ہیں سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ سفر کی فضیلت تو قرآن پاک میں موجود ہے جہاں چین تک جانے کا حکم دیا گیا ہے اور سفر کو علم سے جوڑ دیا گیا ہے۔

وہ آسمانی سفر جو زمین سے شروع ہوا اور سات آسمانوں کو جس نے چیر کر رکھ دیا۔ اس سفر نے اسلام کو جو حکمت، ہدایت اور قوت بخشی وہ کسی مسلمان سے کب چھپی ہوئی ہے!

ماں باپ کے رکھے ہوئے نام 'بہادر' نے محمد بہادر خان میں وہ حوصلہ دیا کہ اس زمانے کی سفر کی صعوبتوں کو خاطر میں نہ لائے۔ 23 اپریل 1931ء سے سفر شروع کیا۔ جدہ پہنچے۔ پھر رکے ہی نہیں۔ بیروت، بیت المقدس، مصر، شام، دمشق، استنبول، بغداد، ایران، افغانستان اور پھر 6 ماہ کے طویل بامعنی سفر کے بعد وطن واپس آئے۔ جہاں گئے علماء اور مفتی صاحبان سے ملاقاتیں کیں۔ صحابہ کرامؓ کے مزارات کی زیارت کی۔ اس سفر کے نتیجے میں موتمر عالمِ اسلامی کے لیے زمین ہموار کی۔ انہیں ایران میں یورپی یلغار اور افغانستان میں اسلامی حمیت نظر آئی جس کی بنا پر انہوں نے انقلاب کی پیش گوئی کی جوان کی سیاسی بصیرت کی نشاندہی کرتی ہے۔

اسی سفرنامے کے طفیل خواجہ حسن نظامی نے انہیں ابن بطوطہ کا خطاب عطا کیا۔

وہ جہاں بھی گئے، جس سے بھی ملے اپنا نام اور کام چھوڑ آئے۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ملنے والے کے دل میں گھر، اور اس کے ذہن میں اپنی خطابت کی چاشنی اور فکر کی روشنی نہ چھوڑی ہو۔ شستہ گفتگو، بذلہ سنجی، حاضر دماغی، الفاظ کا چناؤ، لہجے کا ٹھہراؤ ایسا کہ ملنے والا کم از کم ایک بار تو اور ملنے

کی تمنا کر بیٹھے۔

مصر کے دورے کے دوران جامعہ ازہر کے پرنسپل سے بھی ملے۔ تعارف پر انہوں نے طنزیہ لہجے میں ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں تنقید کی کہ آپ کے یہاں کے مسلمان تو قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں۔

حاضر دماغ نواب صاحب اس طنز کو بھانپ گئے۔ بغیر برا مانے نہایت شگفتگی سے بولے:

''قبلہ ترجمہ تو نہیں البتہ ترجمانی ضرور کرتے ہیں، اور ترجمانی میں یقینا کوئی قباحت نہیں۔''

یہ جواب صرف اُس وقت کے لیے نہ تھا۔ تاقیامت ہندوستان کے مسلمانوں کی ترجمانی کی وضاحت اس بہادر نے کردی۔ بذلہ سنجی کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ ایران کے سفر کے دوران تہران میں انہیں کسی مقام پر جانا تھا۔ سڑک پر ایک ٹیکسی روکی، ڈرائیور سے پوچھا ''فلاں مقام تک کا کیا لو گے؟''

ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا ''آپ کتنے آدمی جائیں گے؟''

بہادر یار جنگ کو اکیلے ہی جانا تھا لیکن جواب دیا ''دو عدد''۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فی کس کرایہ بتا دیا۔ تب بولے ''کرایہ تو ایک ہی شخص کا دوں گا لیکن چلیں گے دو۔''

ڈرائیور نے خفگی سے انکار کر دیا ''میں تو نہیں لے جاؤں گا۔''

نواب صاحب نے اصرار کیا ''میں اور میرا ساتھی دونوں جائیں گے ایک ہی کرائے میں۔''

ڈرائیور کو غصہ آ گیا۔

نواب صاحب ہنس کر بولے ''خفا نہ ہو بھیا، میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ کیا اللہ کا بھی کرایہ لو گے!''

مارچ 1940ء کے لاہور کے جلسے کا ذکر ہم ہر سال دھوم سے کرتے ہیں، لیکن آج تک ہمارے نوجوانوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس جلسے کا انعقاد تقریباً ناممکن تھا۔ قائداعظم ہر صورت میں یہ جلسہ کرنا چاہتے تھے مگر سیاسی حالات سے بے بس تھے۔ کیوں؟ تفصیل یہاں ممکن نہیں، بس یہ جان لیں کہ دو صوبوں کے حکمران سر سکندر حیات اور مولوی فضل الحق اپنے اپنے صوبوں کے اندر جس سیاسی ماحول میں جکڑے ہوئے تھے اُس میں ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں حضرات شرکت

کریں، اوران کی شرکت کے بغیر مسلمانوں کی تقسیم واضح نظر آ رہی تھی جو سیاسی طور پر انگریزوں اور ہندوؤں کے لیے تنقید کا باعث بن جاتی۔

قائداعظم جیسا زیرک شخص بہادر یار جنگ سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا۔

میری استدعا ہے کہ نوجوان اُن دنوں کی سیاست اور تحریک کے دنوں کی مشکلات کو ضرور پڑھیں تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ پاکستان کا حصول کوئی آسان کام نہیں تھا اور بغیر ان صاحبان کے ممکن نہ تھا۔

لاہور جلسہ اپنے وقت اور مقام پر ہوا اور نواب بہادر یار جنگ نے نہ صرف سر سکندر حیات اور مولوی فضل الحق کو یہاں آنے پر آمادہ کر لیا بلکہ قراردادِ پاکستان مولوی فضل الحق سے پیش کرائی اور تائید چودھری خلیق الزماں نے کی۔ دیگر صوبوں کے قائدین نے بھی تقریریں کیں مدلل بھی، پُر جوش بھی، طویل بھی اور مختصر بھی۔ مگر بہادر یار جنگ نے قراردادِ پاکستان پر اس اجلاس میں جو تقریر کی اُس کا نقش زمانہ اپنے سینے میں آج تک محفوظ کیے ہوئے ہے اور تحریکِ پاکستان اور قیام پاکستان ناگزیر تھا' کا سارا خلاصہ اس میں زریں حروف میں تحریر ہے۔

حاضرین مقرر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ دل میں ان کا کلام اتار رہے تھے۔ ایک ایک لفظ اور جملے پر صدقے واری جا رہے تھے۔

سننے والے سمجھ رہے تھے، سمجھنے والے عمل کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے اور یقین کی طرف گامزن تھے کہ آغازِ اسلام کے زمانے کی کوئی محبوب ہستی زندہ ہو کر دوبارہ آ گئی ہے۔ قوتِ گویائی کے ساتھ مل کر محبت اپنا کام کر رہی تھی۔ ہر شخص اس حیرت انگیز مقرر کی تقریر کو دل کے کانوں سے بغور سن رہا تھا۔ پنڈال میں مکمل خاموشی تھی۔ ہر ایک دل سے چاہ رہا تھا کہ یہ شخص بولتا رہے، بولتا رہے اور زندگی یوں ہی بیٹھے بیٹھے، سنتے سنتے تمام ہو جائے۔ لیکن اس مقرر کو ابھی ایک اور شعلہ نوا مقرر کو وقت دینا تھا جو اس بزم کا صدر بھی تھا، اور جب وہ انگریزی میں تقریر کرتا تو سامعین سے پوچھا جاتا تم لوگ اتنے غور سے سن رہے تھے، تمہیں تو انگریزی آتی ہی نہیں۔ تب معصوم بھولے بھالے لوگ کہتے: تقریر کی زبان سمجھ میں تو نہیں آتی مگر شگفتہ لہجہ، قوتِ ایمانی، کڑکتی آواز، جوشِ خطابت سمجھا رہا ہوتا ہے کہ یہ شخص جو کچھ بھی کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا، سچ کہہ رہا

ہوگا، مسلمانوں کے حق میں ہی کہہ رہا ہوگا۔ یہ دوسرا مقرر، صدرِ محفل کوئی اور نہیں قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ جب باری آئی اور قائد اپنی سیٹ سے نہیں اٹھے، تب قائداعظم قائداعظم کے نعروں نے شدت اختیار کر لی۔

پھر قائد کو کرسیٔ صدارت سے اٹھنا پڑا۔ وہ جو مانا ہوا مقرر تھا، جسے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا فن آتا تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے لگے، تالیاں بجیں اور قائد کی آواز گونجی: ''خواتین و حضرات! بہادر یار جنگ کے بعد کسی اور کا بولنا غلطی ہے''۔ اور جلسے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ قائد کا ادا کردہ یہ جملہ بڑا معنی خیز تھا۔

چلتے وقت جب قائد نے نواب سے مصافحہ کیا تو فرمایا ''اس مرتبہ اجلاس میں آپ کی تقریر کے لیے بہت دلچسپ موضوع تیار ہو رہا ہے۔'' اس سے مراد تجویزِ پاکستان تھی۔

نواب صاحب نے برجستہ جواب دیا ''قائداعظم میں امتحان سے پہلے پرچہ معلوم نہیں کرتا''۔ یہ جرأت، یہ حاضر دماغی، یہ شستگی یہ شائستگی، یہ ہمت، یہ جرأت، یہ یقین اور اعتماد اللہ تعالیٰ نے کچھ زیادہ مقدار میں بہادر یار جنگ کی شخصیت میں سمو دیا تھا۔

انسان خواہ کتنا ہی بہادر ہو، اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں پوچھتا کہ صرف 39 سال کی عمر دے کر واپس کیوں بلا رہے ہیں۔

بغیر احتجاج وہ اللہ کی طرف لوٹ گئے مگر اپنا وہ نقش ہندوستانی مسلمانوں پر چھوڑ گئے جسے ہم مٹانے اور بھلانے کی تمام تر کوشش کر رہے ہیں مگر اب بھی کچھ لوگ اور کچھ ادارے اس کا نام اور کام تھامے موجود ہیں۔ لیکن ہم پر ان کی یاد فرض بھی ہے اور قرض بھی۔

☆☆☆

(یہ بہادر یار جنگ اکیڈمی میں ۳ ستمبر ۲۰۲۱ برسی کے موقع پر تقریب میں پڑھا گیا۔)

صلۂ شہید کیا ہے... لیاقت علی خان

صدرِ محترم! حاضرین کرام!

ہر شخص کی زندگی میں ماضی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ حال کو قرار نہیں، اور مستقبل نامعلوم ہوتا ہے۔ اس آڈیٹوریم میں میرا ماضی بستا ہے اور اس اسٹیج پر میں نے درجنوں تقاریب منعقد کی ہیں جو آج بھی میرے خیالوں میں احتیاط کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔ اس مختصر سے وقفے میں بیٹھے ہوئے میں نے اپنے ماضی کے خزانے سے وہ یادیں چن لی ہیں جن کا ذکر میں آپ سے یوں کروں گی کہ آج شہید ملت کی یاد میں تقریب سجائی گئی ہے اور میری یادیں سے ایک یاد اسی شہید ملت سے متعلق ہے۔

شعبۂ معاشیات میں میں بزمِ معاشیات کی جنرل سیکریٹری تھی اور ہم نے پنج سالہ منصوبے پر ایک پروگرام ترتیب دیا تھا جس کے کئی حصے تھے ''بیرونی امداد کے معاشی فوائد اور نقصانات...... بلاسود بینکاری اور سالانہ معاشی بجٹ''۔ مہمان تھے اسٹیٹ بینک کے شجاعت علی حسنی، ڈاکٹر ضیاء الدین، ایس اے مینائی، شعبہ اسلامیات کے استاد ابن حسن جارچوی اور شعبے کے سربراہ قاضی محمد فرید، جو کیو ایم فرید کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

موضوع ''غریبوں کا بجٹ'' تھا۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گی کہ آپ سب یقیناً اس بجٹ کے مندرجات سے واقف ہیں۔ بس مجھے علی گڑھ کے مایہ ناز طالب علم لیاقت علی خان کے اس جواب کی طرف اشارہ کرنا ہے جو انہیں وہاں کی تعلیم سے ملا تھا۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اس بجٹ کو متعصبانہ بجٹ قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ہم ہاؤس کے اندر اور باہر اس کے خلاف احتجاج کریں گے۔ لیاقت علی خان نے کہا ''قانون کی حدود سے کوئی تجاوز نہیں کرسکتا''۔ اس پر کانگریس بینچ سے آواز آئی "Is it a threat?" لیاقت نے برجستہ جواب دیا "No, it is a reciprocal Compliment" ہال کشتِ زعفران بن گیا۔

تب شجاعت علی حسنی نے کہا: معاشی صورتِ حال کی سنگینی کے دوران ایسے خوب صورت

جملے کی توقع بس سیّدی درس گاہ کے ایک طالب علم سے ہی کی جا سکتی تھی۔

جناح نے کہا تھا کہ اسی بجٹ نے اسلامی ریاست پاکستان بنانے میں مدد فراہم کی۔ اور پھر تو لیاقت علی پاکستان کی سیاست میں ایک چمکتے ہوئے ہیرے کے مانند ہمارے لیے ہیرو بن گئے۔ اس آڈیٹوریم میں پاکستان کی سیاست سے متعلق اس ہستی سے ہمارا پہلا عشق تھا، پھر ہم وہ سب جملے اور موقع سمیٹنے لگے جو ان سے منسوب تھے۔

☆ 1945ء میں جناح نے کہا'' گاندھی جی کے پاس بہت سے لوگ ہیں جن پر وہ تکیہ کر سکتے ہیں اور بھروسہ بھی، لیکن میرے پاس صرف ایک آدمی ہے اور وہ ہے لیاقت۔''

☆ اور جب جناح نے اتحاد، تنظیم، یقینِ محکم کا درس دیا تو وہ بھی لیاقت کی رفاقت کا درس تھا۔

☆ اور جب 3 جون کے اعلان کے بعد جناح نے کہا کہ اب ہمیں اپنے ملک کے لیے ایک جھنڈے کی ضرورت ہوگی، تب 11 اگست 1947ء کو لیاقت علی نے جھنڈا اسمبلی کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیا۔ ان کی آنکھوں میں چمک بھی تھی اور آنسو بھی، اور الفاظ تھے'' یہ جھنڈا پاکستان کے ہر شہری کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔'' حاضرین نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیا۔ یہ موقع وہ تھا کہ جناح کے چہرے پر مسرت اور خوشی کی ایسی لہر دوڑی جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

☆ پھر آئین کی باری آئی۔ کہا: قرآن اور اسلام کی اساس ہوگا۔ وہی 'قراردادِ مقاصد' کے طور پر قبول ہوئی۔ بعد میں پاکستان کے آئین کا دیباچہ اور اب آئین کا اہم حصہ ہے۔

☆ پھر ایسا موقع آیا کہ غصہ، جوش، ہمت اور بہادری سے ایک مُکا لہرا دیا۔ کہا: ہندوستان نے اگر پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچایا تو ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔

☆ اور جب کسی نے کہا: آپ نے اپنی ساری دولت کے لیے ایک بھی کلیم کا فارم نہیں بھرا تو جواب دیا: مجھے خوشی ہے کہ اب میرے پاس کچھ نہیں کہ آسائشات آدمی کے یقین کو متزلزل کر دیتی ہیں۔

☆ برادرانِ ملت کو آواز دی، مخاطب کیا، اپنے اس عہد کو دہرایا کہ ملک کی سالمیت کے لیے اگر خون دینا پڑا تو پہلے میرا خون اس میں شامل ہوگا۔ وعدہ نبھایا۔ گولی لگتے ہی کلمہ ادا کیا۔

وعدہ وفا کیا اور اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے۔

☆ کس نے مارا، کیوں مارا کے سارے ثبوت جمیل الدین عالی کے بھائی کے ہاتھ میں تھے۔ پنڈی سے کراچی آتے ہوئے جہاز گرا دیا گیا۔ ثبوت تلف ہو گئے اور پاکستان کی سیاست میں شہادت کی ابتدا ہو گئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں جتنے بھی سیاسی قتل ہوئے ہیں ان میں سازش ہمیشہ ایک قدرِ مشترک پائی گئی۔

شیکسپیئر کے جولیس سیزر میں لکھا ہے کہ ایک رات قبل سیزر کی بیوی نے خواب دیکھا تھا اور اس نے سیزر کو جانے سے اس روز منع کیا۔ سیزر نے مسکرا کر کہا ''خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے، میں واپس آ جاؤں گا۔'' واپسی نہیں ہوئی۔

بیگم رعنا نے شوہر کو جاتا دیکھ کر اداسی سے سوچا: آج نہ جاتے تو اچھا تھا۔ بیٹے اشرف نے کہا ''میں بھی ساتھ جاؤں گا۔'' مگر لیاقت نے منع کیا، کہا ''تم اسکول جاؤ، میں جلدی آ جاؤں گا۔'' واپس ہی نہیں لوٹے۔

وہ شخص جب لندن پڑھنے گیا تب ملازم ساتھ گیا، جو ان کے کپڑے اور کھانے پینے کا خیال رکھتا تھا۔ کہا: لیاقت نے کبھی ایک جوڑا دوبارہ نہیں پہنا۔ گھر، جائداد، کوٹھیاں، باغ اور کھیت سب چھوڑ آیا، مہاجر بنا اور کہہ دیا سب کچھ پاکستان پر قربان۔

صورتِ حال یہ ہوئی کہ کوٹ اور شیروانی درزی کے پاس ادھڑے ہوئے آتے اور رفو کیے جاتے۔ اپنی مثالی نوابی گنوادی۔ مثالی غربت لوگوں سے چھپائی، لیکن جب وہ دنیا سے گیا تو جیب میں چند نوٹ اور جسم پر قمیص کے نیچے پھٹی بنیان نے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ یہ کیسا نواب تھا؟

پھر فلم کے ایک گانے کو بچوں نے گایا:

''اور قائدِ ملت بھی چلا ہونے کو قربان''

ہمارے نیک لوگوں کی نیکیاں گانوں میں بیان اور کتابوں میں لکھ کر یک شیلف میں سجادی جاتی ہیں۔

بیگم، بیگم رعنا تھیں۔ دو معصوم بچوں کی ماں چند عہدوں سے بہلا دی گئی۔ ان کے کیے گئے چند سوالوں کے جواب آج تک نہیں دیے گئے۔ اور جب گورنر سندھ بنیں تب میں نے کالا گاؤن

ترک کر کے ہرا گاؤن پہن لیا تھا۔ خط لکھا کہ آپ آئیں کہ ہمارے کالج کی طالبات آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

ملٹری سیکریٹری کا جواب آیا ''بیمار ہیں اور آنے جانے سے قاصر ہیں''۔ کچھ دن بعد دوسری درخواست بھیجی۔ جواب آیا ''اگر وہ ایک کالج گئیں تو شہر بھر کے کالج بلائیں گے اور وہ کہتی ہیں میں اتنے کالج کیوں کر جاؤں گی، لہٰذا وہ نہیں آ سکتیں۔''

میں نے تیسری درخواست بھیج دی کہ ابھی تک مجھ میں سے طالب علمانہ ضد نہیں گئی تھی:

''میرا کالج ایک مضافاتی بستی میں ہے، یہاں کی طالبات آپ کو کیسے دیکھیں، اور وہ مجھے بھی معاف نہیں کریں گی کہ بیگم صاحبہ ان کے عہد میں ان کے شہر میں تھیں اور میں نے استاد ہو کر ان سے کیوں نہیں ملایا؟ میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ لکھ بھیجئے۔''

جواب آیا ''میں آؤں گی۔'' وہ آئیں۔ ایمبولینس میں آئیں۔ بہت کمزور تھیں۔ اسٹیج پر بیٹھیں۔ دو عدد باڈی گارڈ دائیں بائیں کھمبے کی طرح کھڑے ہو گئے جو مجھے برے لگے۔ تصویر میں کیسے لگیں گے؟ بیگم صاحبہ سے سرگوشی کی ''انہیں ہٹا دیں''۔ انہوں نے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے!'' ضد کے بعد کہا '' ADC سے کہیں''۔ میری ان سے تکرار ہوئی۔ مختصراً یہ کہ انہوں نے بتایا یہ حفاظت کے لیے ہیں۔ میں نے جھٹ کہا ''اپنی قائد کی حفاظت ہم خود کر سکتے ہیں، انہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔''

آخر کار وہ ہٹا دیے گئے۔ اسٹیج پر کھینچی گئی وہ تصاویر آج بھی میرے البم میں موجود ہیں۔ میں ان کے برابر میں فخر اور غرور کا جذبہ لیے بیٹھی ہوں کہ اپنے پہلے عشق کی بیگم کے ساتھ بیٹھی ہوں۔ کم عمری کا یہ فخر مجھے آج بھی سوچ کر اچھا لگتا ہے۔

اور جب اپنی تقریر میں مَیں نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ ''بیگم صاحبہ! آج میں نے سندھ کی گورنر کو نہیں اپنے عظیم رہنما کی بیگم، بیگم رعنا کو بلایا ہے کہ بیگم رعنا کو یہ فخر نہیں ہوگا کہ وہ گورنر ہیں بلکہ سندھ کی گورنری اس بات پر ناز کرے گی کہ کبھی بیگم رعنا لیاقت علی اس عہدے پر فائز رہ چکی ہیں۔''

یہ ایک ایسا لمحہ تھا جو آج بھی میرے جسم سے لپٹا ہوا ہے۔ بیگم رعنا نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا اور ان کی آنکھوں میں کئی موتی ٹپکنے کو بے چین اور میری آنکھوں سے

برسات شروع ہو چکی تھی۔

برابر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے میں اُن کے غرارے کو مسلسل دیکھ رہی تھی، انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے درزی سے اسے الٹا کرالیا ہے کہ نیچے کا حصہ بہتر تھا، اوپر کا رنگ ماند پڑ چکا تھا۔ برا لگتا تھا کہ اب ان کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔

یہ نواب کی بیگم اور وزیراعظم پاکستان کی بیگم تھیں جنہوں نے ہجرت کے وقت اپنے محل جیسے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے ایک چھوٹے سے کارپٹ کے ٹکڑے کو تہہ کر کے بغل میں دبایا اور دروازے سے باہر آئیں تو لیاقت وہ قالین ان سے لے کر واپس محل میں چھوڑ آئے۔

بیگم رعنا کو یہ قالین بہت پسند تھا جو انہیں کسی بادشاہ نے تحفے میں دیا تھا۔ ان کے دونوں ہاتھ خالی تھے کہ ہجرت ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ بات انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں طالبات کے لیے کی تھی۔ یہ 4 جون 1973ء کا دن تھا۔

اور پھر ان کے انتقال کے دن میں ان کے گھر اُس وقت تک بیٹھی رہی جب تک وہ چار کندھوں پر سوار ہو کر اپنے سرکاری گھر سے دو گز برابر گھر کی جانب روانہ نہیں ہو گئیں۔

میرے عشق کا یہ دوسرا مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

پھر 16 جون 2003ء کو میری ملاقات اپنے کالج میں اکبر لیاقت علی اور اشرف لیاقت سے ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ کالج کے قیام کے پہلے سال سے آج تک ہم نے 16 اکتوبر کا دن کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اور جب میں اس کالج سے رخصت ہوئی تب میں 40 یومِ شہادت لیاقت علی خان آتے جاتے سال کی طالبات کو دے کر آئی تھی۔ کیا یہ کسی استاد کے لیے کارکردگی کا ریکارڈ نہیں؟ مگر عشق میں ریکارڈ نہیں گنے جاتے، یہ میں جانتی ہوں۔

1995ء میں یکم اکتوبر لیاقت علی خان کی صد سالہ پیدائش کا دن تھا۔ جشن ہم نے اپنے کالج کی طرف سے یوں منایا کہ اُس وقت سندھ کے چیف منسٹر جناب عبداللہ شاہ نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں کراچی کے تمام کالجوں کے طلبہ و طالبات کے درمیان نغموں کا مقابلہ کراؤں۔ فریئر ہال کا گراؤنڈ مجھے دے دیا گیا۔ مقابلے میں طالب علموں کو انعام تو ملا ہی، میرے لیے بھی اس کارکردگی کے اعتراف میں انعام کا اعلان کیا گیا جس کو وصول کرنے کا انتظار

میں آج تک کر رہی ہوں، مگر ہاں مُکّا لہراتی ہوئی لیاقت علی خان کی تصویری شیلڈ ضرور میں نے کالج کے لیے وصول کی۔

اور پھر 2019ء میں مَیں لیاقت علی خان کی دوسری نسل کمال لیاقت کو سرسید یونی ورسٹی 17 اکتوبر کو یوم سرسید کے موقع پر لے آئی اور انہیں دکھایا کہ یونی ورسٹی کا ایک بلاک ہم نے سیدی درس گاہ کے طالب علم لیاقت علی خان کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

حاضرینِ کرام! میری گفتگو کا اب اختتام ہے۔ اس آڈیٹوریم میں ہم نے بھی ایک نغمہ گایا تھا، بول وہی تھے:

اس فرش سے اڑ اڑ کر ہم نے افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں

آج بھی ناہید اور پروین ہمارے دائیں اور بائیں رہتی ہیں۔

اور ہم اپنی جامعہ کے آج تک مقروض ہیں، جب بھی آتے ہیں مجاز کے دیے گئے ترانے کو اپنی جامعہ کے لیے دہراتے رہتے ہیں۔

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

خواتین وحضرات! ایک استدعا۔ شہیدِ ملت کا دن اگر ہم 16 اکتوبر کے آنسوؤں بھرے دن منانے کے بجائے یکم اکتوبر سے بدل دیں تو کیا یہ ٹھیک نہیں ہوگا! یوم سرسید 27 مارچ نہیں 16 اکتوبر کو منایا جاتا ہے۔ یوم اقبال 21 اپریل نہیں 9 نومبر ہے۔ یوم قائداعظم 11 ستمبر نہیں 25 دسمبر کا دن ہے۔ پھر شہیدِ ملت 16 اکتوبر کیوں؟

جاتے جاتے کیوں نا کہہ دوں:

صلۂ شہید کیا ہے تب وتابِ جاودانہ

☆☆☆

کردارسازی

موجودہ صورتِ حال میں طالب علموں کی ذہنی آبیاری اور کردارسازی میں اساتذہ کی ذمہ داریاں اور فرائض

اس موضوع میں دو الفاظ بہت اہم ہیں: ایک طالبِ علم اور دوسرا استاد۔ یہ دونوں الفاظ نہیں بلکہ شخصیت ہیں۔ اور شخصیت کے ہمیشہ کچھ نہ کچھ فرائض ہوتے ہیں۔ دوسرے دو الفاظ کردار سازی اور ذمہ داری کے ہیں۔ یہ شخصیت نہیں بلکہ فعل ہیں، اور فعل بغیر شخصیت مکمل نہیں ہوتا۔ گویا یہ چاروں الفاظ زندگی گزارنے اور بامقصد زندگی گزارنے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ اب رہ گئے دوسرے چند الفاظ، مثلاً موجودہ صورتِ حال اور ذہنی آبیاری۔ یہ ایک طرح سے پابند کردینے والے الفاظ ہیں کہ ہم جو کچھ سوچیں، سمجھیں یا تحریر کریں اُن ہی حدود میں رہیں۔

اچھا موضوع ہے، آج اور ہمیشہ کے تناظر میں ضروری بھی۔

جنگِ عظیم دوم میں ہٹلر سے پوچھا گیا کہ مسلسل جنگ کے نتیجے میں ہمارے قیمتی ترین لوگ مر رہے ہیں، کیا کریں؟ ہٹلر نے جواب دیا کہ اگر ہوسکے تو اپنی قوم کے اساتذہ کو کہیں چھپا دو۔ اگر استاد محفوظ ہیں تو یہ قیمتی لوگ پھر تیار ہو جائیں گے۔

یہ محض ایک تجویز نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ کردارسازی اور ذہنی آبیاری میں ماں باپ سے زیادہ اساتذہ کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ اساتذہ کا دائرۂ کار بڑا ہوتا ہے۔ ماں باپ کے دو چار بچے ہوتے ہیں جبکہ اساتذہ کے سیکڑوں اور ہزاروں۔

میں نے کہیں ایک جملہ پڑھا تھا جو میرے ذہن میں اٹک سا گیا ہے کہ ''ٹیچر اور سڑک میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں اپنی جگہ ہی رہ جاتے ہیں مگر دوسروں کو اُن کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔''

منزل سے کیا مراد ہے؟ منزل دراصل جینے کا مقصد ہوتا ہے۔ جینا صرف سانس لینے کا نام نہیں ہے۔ سانس تو ہر ذی روح لیتا ہے لیکن ہر ذی روح کی زندگی میں کوئی منزل نہیں ہوتی ہے۔

لیکن ایک بچہ کیسے یہ جانے کہ اس کے جینے کا مقصد کیا ہے؟ اور اگر کسی منزل کی تلاش ہے تو وہ کن راستوں سے چل کر اپنی منزل پا سکتا ہے؟ یہ بتانا، اسے انگلی پکڑ کر اس راستے پر ڈالنا اور راستے کے سنگِ میل کا پتا دینا بس استاد کا کام ہے۔ استاد ہونا کوئی ملازمت پہ جانا نہیں ہے، یہ کوئی پروفیشن نہیں ہے۔ استاد ہونا ایک منصب پر فائز ہو جانا ہے، اور منصب کی ذمہ داریاں پیغمبروں کی ذمہ داریوں جیسی ہوتی ہیں۔ ہر دور میں ایک پیغمبر آیا اور اس نے اپنے دور کے لوگوں کو جینے کے طریقے سکھائے، یہ بحث الگ ہے کہ وہ کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟ لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ آخری پیغمبر کیوں کامیاب ہوئے؟ اس کے لیے انہوں نے اپنے دور کے لوگوں کو اپنا بچپن دکھایا اور اپنی صاف شفاف جوانی بھی دکھائی، اور کہا بچے ہو تو مجھ جیسے بچے بنو اور جوان ہو تو مجھ جیسے جوان بنو۔ گویا کردار سازی اور ذہنی آبیاری کرتے ہوئے کسی بھی شخص کو پہلے خود مثال بننا پڑتا ہے۔ اگر اپنی شخصیت میں کھوٹ ہے تو کھوٹ کے خلاف لیکچر دینا مضحکہ خیز فعل ہے۔

اس موقع پر مجھے ایک مثال یاد آ رہی ہے۔

یہ 1965ء کا زمانہ ہے، میں کراچی یونیورسٹی کی طالبِ علم تھی، اپنی کلاس میں تھی کہ ایک خبر کسی طالب علم کے ذریعے ہم تک پہنچی کہ ایک لڑکی گرلز کامن روم کا فرنیچر باہر نکال کر کمرہ دھو رہی ہے۔ یونیورسٹی میں یہ فعل عجیب سا لگا۔ کامن روم اب اگر چہ ہوتا نہیں اس لیے طالب علموں کو سمجھانا پڑے گا کہ یونیورسٹی میں کیوں ہوتا تھا؟ مگر مثال اپنی جگہ موجود ہے۔ ہم اس عجیب و غریب نظارے کو دیکھنے وہاں پہنچے۔ ایک طالبہ نے شلوار کے پائنچے چڑھائے ہوئے تھے اور پانی بہا کر جھاڑو سے فرش دھو رہی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا۔ اس نے جھاڑو رکھا اور پانی سے گزرتی میرے پاس آ گئی۔

''تم کہاں سے آئی ہو؟'' میرا سوال مبہم سا تھا۔

مگر 'کہاں سے' مراد وہ سمجھ گئی اور کالج کا نام بتا دیا۔ مگر میں کالج نہیں اسکول کا نام جاننا چاہتی تھی۔

اس نے دوسرے سوال کا جواب دینے سے پہلے بغور میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا ''تم جواب نہ دو میں بتاتی ہوں''۔

اُس کی نظروں میں اب حیرت کے ساتھ چمک بھی تھی۔ ''کیا آپ نے بھی اسی اسکول سے پڑھا ہے؟'' اس کا یہ سوال نہیں، مجھ پر گرنے والا بم تھا۔

''ہاں۔'' اب میری نظریں نیچی تھیں۔ ''تم نے صحیح جانا۔''

''پھر تو آپ جانتی ہوں گی کہ میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں؟''

میری نظروں میں ہم دونوں کی مشترکہ استاد اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ وجود بن کر آموجود ہوئیں جو برسوں پہلے دنیا سے جاچکی تھیں۔ یہ وہ تربیت تھی جس کی مثال وہ طالبہ تھی۔ میں نے بھی ہمیشہ کامن روم کی بکھری کرسیوں کو بارہا اُن کی جگہ پر رکھا تھا۔ لٹکتے جالوں پر تنقید کی تھی۔ میز پر پھیلی ہوئی گندگی کی طرف اشارہ کر کے کامن روم کی ''بُوا'' کی سرزنش کی تھی اور چاہتی بھی تھی کہ یہ سب کچھ خود بھی کر دوں کہ یہ تربیت ہمیں اپنے اسکول میں دی گئی تھی جہاں ہم اپنے اسکول کے گراؤنڈ تک میں گرے پیڑ کے پتے بھی اٹھا کر کونے میں رکھی باسکٹ میں ڈال دیا کرنے کے پابند تھے۔ راہ چلتے کاغذ اٹھانا بھی ہمیں سکھایا گیا تھا۔ شکریے اور معذرت کے الفاظ دن بھر میں ہم درجنوں بار استعمال کرتے تھے۔ بس کی سواری میں اپنے سے بڑوں کے لیے خود کھڑے ہو کر سیٹ پر انہیں بٹھانا فرض سمجھتے تھے۔ استاد کی بتائی اور سکھائی ہوئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمارے خون کی گردش میں شامل ہو گئی ہیں۔ یہ لڑکی اپنی استاد کی دی ہوئی تربیت کی عملی تصویر پیش کر رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹے سے فعل کی چھوٹی سی مثال ضرور ہے لیکن ذہنی آبیاری کی چلتی پھرتی شکل ہے۔

ایک اور مثال سن لیں۔ میری ٹانگوں کا آپریشن ہوا تھا۔ سفر درپیش تھا۔ امیگریشن کے لیے لائن میں کھڑا ہونا محال تھا۔ جب میری باری آئی تب ڈیسک پر بیٹھے ہوئے آفیسر سے میں نے آگے کی سیٹ کی درخواست کی کہ دورانِ سفر میں ٹانگ پھیلا سکوں۔ اس نے ریکارڈ دیکھنے کے بعد معذرت کی کہ وہ سیٹیں پہلے سے دی جاچکی ہیں۔

ایک خاتون افسر برابر کی ڈیسک پر بیٹھی مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میرے مایوس چہرے پر نظر

ڈالتی میرے پاس آئی، ہاتھ سے پاسپورٹ لیا، ہینڈ کیری پکڑی اور مجھے لائن سے نکال کر ایک سیٹ کی طرف لے گئی اور بٹھا دیا۔ میں ایک تابعدار کی طرح بیٹھ گئی کہ مجھے واقعی بیٹھنے کی سخت حاجت تھی۔

وہ خاتون اپنے یونی فارم میں ملبوس میرے پاسپورٹ کو ہاتھوں میں لیے قدرے جھکی ہوئی کھڑی تھی۔

''میڈم! میں آپ کی شاگرد ہوں۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا، میں کوئی خاص طالبہ بھی نہیں تھی، لیکن آپ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میں آپ سے خفا رہا کرتی تھی کہ آپ نے ایک بار مجھے قدرے زور سے ڈانٹا تھا اور پھر جو بات مجھے سمجھائی تھی وہ مجھے اُس دن سمجھ میں نہیں آئی تھی۔''

''کیا تم بتا سکو گی کہ میں نے کیا سمجھایا تھا؟''

''جی مجھے یاد ہے اور میں بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''آپ نے سمجھایا تھا کہ ''تم کسی سے بھی اس کے رویّے یا فعل پر ضرور اختلاف کرو کہ یہ تمہارا حق ہے، مگر اختلاف کرتے ہوئے یوں نہ چیخو جیسا کہ تم چیخ رہی ہو۔ اپنا لہجہ تمہارا اپنا ہے اسے نرم رکھو۔'' اُس دن تو مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر اب جب کہ میری بیٹی کا قد میرے برابر ہے تب یکایک مجھے آپ کا یہ جملہ یاد آیا اور اسے مجھے اپنی بیٹی پر استعمال کرنا پڑا۔ یوں میں سمجھی کہ استاد جو کچھ کہتا ہے وہ صرف اُسی دن کے لیے نہیں ہوتا، وہ تو اپنے طالب علموں کی ذہنی آبیاری کر رہا ہوتا ہے۔ انہیں مستقبل میں زندگی گزارنے کے لیے تیار کرتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں اور کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے سنا، کہہ رہی تھی ''جہاز اُس وقت تک نہیں اُڑے گا جب تک کہ میں اگلی سیٹ آپ کو نہیں دلا دوں گی۔''

اب ٹشو سے آنکھیں صاف کرنے کی باری میری تھی۔

ان دو مثالوں کو شاید بڑی بات نہ سمجھا جائے، مگر سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ چھوٹی سکھائی ہوئی باتیں انسان بننے کے لیے کیسے کام آتی ہیں۔

ان مثالوں سے بھی یہی ثابت ہوا نا کہ کلاس روم کا لیکچر نمبر لینے کے کام آتا ہے جس کے نتیجے میں طالب علم کو سند حاصل ہوتی ہے جس سے وہ ملازمت پا جاتا ہے۔ یقیناً معاشی طور پر زندگی

گزارنے کے لیے یہ ضروری ہے، لیکن معاشرے میں ایک اچھا انسان بننے کے لیے اپنے تعلیمی ادارے میں اسٹیج پر اپنی صلاحیت دکھانا، ساتھی طالب علموں کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنا، لائبریری میں بیٹھ کر خاموشی اختیار کیے رکھنا...... یہ کلاس روم سے باہر کا درس ہوتا ہے جو طالب علم کے ذہن کے اندر اور عمل میں باہر جگہ پا جاتا ہے۔ بس اسی کو ذہنی آبیاری کہتے ہیں اور اسی سے شخصیت میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بس استاد کی دین ہوتا ہے اور اسی کو کردار سازی کہتے ہیں۔

اکثر ہوتا ہے کہ کلاس روم لیکچر سے زیادہ طالب علم درس گاہ کے اسٹیج سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ ذہنی میلان ہوتا ہے، آپ اسے بدل نہیں سکتے، لیکن ایک ذمہ دار استاد ان دونوں میں توازن پیدا کر سکتا ہے کہ یہ دونوں صلاحیتیں ایک طالب علم کے لیے ضروری ہیں۔ اسے مضمون بھی پڑھنا ہے اور سند بھی حاصل کرنی ہے جو اس کی اوّلین ترجیح ہے، لیکن اسٹیج کی کارکردگی کو اس پر فوقیت دینا غلط ہے۔ اُسے اس میں توازن بہر حال پیدا کرنا ہے اور یہ استاد کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ ایسے مشکل طالب علم کو دونوں راستوں پر کامیابی کے ساتھ کیونکر چلنے پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ بات بھی مثال سے سمجھی جا سکتی ہے۔ اپنی کلاس میں ایک طالبہ کو میں مسلسل بے چینی میں مبتلا دیکھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کلاس ختم ہو اور وہ اس سے آزاد ہو جائے۔ تحقیق سے پتا چلا صرف میری کلاس نہیں وہ تو ہر کلاس میں بے چین رہتی۔ کالج آتی، کلاس سے غائب رہتی۔ کئی دنوں تک اس پر نظر رکھنے کے بعد میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ ایک باادب طالبہ تھی۔ میں نے وجہ پوچھی۔ اُس نے اپنی کاپی میرے پاس رکھ دی۔ ''میڈم! میرا ذہن ہر وقت بس اسی میں کھویا رہتا ہے۔ میں آپ لوگوں کا لیکچر سمجھ ہی نہیں پاتی''۔ میں نے کاپی کے صفحات پلٹے۔ تمام صفحے اشعار سے بھرے تھے۔ ''تمھیں شاعری کا شوق ہے؟''

''جی''۔ اس نے یوں اقرار کیا جیسے وہ مجرم ہے۔

میں ان مکالموں کی طرف نہیں جاؤں گی کہ اس کے اور میرے درمیان کتنی گفتگو ہوئی، کتنی بیٹھک ہوئی، کتنے دن لگے اور مجھے کیا کیا طریقے استعمال کرنے پڑے۔ اسے نفسیاتی طور پر کیسے آمادہ کیا کہ دونوں چیزیں اس کے لیے برابر ضروری ہیں۔

آج یہ کہتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ وہ امریکہ کی ایک یونی ورسٹی میں پڑھا رہی ہے اور

اس عہد حاضر کی ایک بڑی شاعرہ کا درجہ بھی پا چکی ہے۔ ان کا نام ہے عشرت آفرین۔

یہ ذہنی آبیاری اساتذہ کے لیے لازمی فعل ہے، استاد کو اپنے طالب علم کے ذہن کو پڑھنا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ دوست کی طرح مل جل کر رہنا پڑتا ہے، تب کوئی بھی بے چین طالب علم اس کی گرفت میں بہ آسانی آ جاتا ہے، اور یہی ایک استاد کی کامیابی ہوتی ہے۔

آج کے حالات اُن حالات سے یکسر مختلف ہیں جن سے ہم لوگ گزرے ہیں۔ ہماری عمریں جس زمانے میں گزری ہیں وہاں سوائے گرمیوں اور موسم سرما کی چھٹیوں کے چھٹی نہیں ہوا کرتی تھی۔

ہمیں ایک ایک فعل پر اپنے استاد کے سامنے سر جھکا کر یا سر اٹھا کر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ ہمارے لباس پر استاد کی ناقدانہ نظریں ہوتیں۔ ہمارے جوتے بھی نظر انداز نہ ہوتے۔ ہمارے بڑھے ہوئے بالوں اور قرینے سے کی ہوئی چوٹیوں پر بھی نظر ہوتی۔ ہمارے اساتذہ کو ہمیں ڈانٹنے کا حق حاصل تھا، وہ کڑی سے کڑی سزا بھی دے سکتا تھا۔ اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ طالب علم استاد کو اپنے سے بہت بڑا، بہت طاقت ور سمجھے، جب ہی وہ اس کی دی ہوئی ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عار نہیں کہ اساتذہ نے اپنی قوت خود ختم کر دی ہے، اپنے حقوق اور فرائض میں جو توازن ہونا تھا اسے انہوں نے کھو دیا ہے۔ یوں درس گاہوں کی فضا میں ناگوار سی تبدیلی آ گئی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ استاد کے فرائض پر آج گفتگو نہ کی جائے، شاید یہ پہلے دور سے بھی زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔

☆ آج بھی اساتذہ کو اپنے طالب علموں کو یہ بتانا ہوگا کہ ایک ہارا ہوا انسان، ہارنے کے بعد بھی مسکرانے کی قوت رکھتا ہے تو جیتنے والا اپنی خوشی کھو دیتا ہے۔

☆ استاد کو اپنے طالب علموں کو بتانا ہوگا کہ چاقو، خنجر، تلوار، سب لڑنے کے اوزار ہیں اور تیز تر ہیں، لیکن الفاظ کا نشتر سب سے تیز ہوتا ہے۔

☆ استاد کو بتانا ہوگا کہ غلط باتوں کی مخالفت کرنا ضروری ہے کہ یہ حدیث بھی ہے، اور یہ بھی کہ لہروں کے ساتھ لاش بہا کرتی ہیں، تیراک نہیں۔

☆ اسے اپنے طالب علموں کو بتانا ہوگا کہ اندھیرے سے لڑائی کا احسن طریقہ یہ ہے کہ ان کی دسترس میں جو دیا ہے وہ اسے جلا دیں اور مطمئن ہو جائیں کہ انہوں نے کم از کم اپنے حصے کا فرض تو ادا کر دیا ہے۔

☆ استاد کو یہ بھی بتانا ہے کہ ہر ایک کی زندگی میں طوفان آتا ہے کہ زندگی میں طوفان آنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کڑا وقت ہی تو سبق سکھاتا ہے۔ ایسے ہی طوفان میں تو پتا چلتا ہے کہ کون ہاتھ پکڑ کر بھاگ رہا ہے اور کون ہاتھ چھوڑ کر۔

☆ استاد کو یہ سبق دینا ہوگا کہ جنہیں زندگی میں ہم حقارت سے دیکھتے ہیں شاید فرشتے ان ہی کو رشک سے دیکھ رہے ہوں۔

☆ استاد کو بتانا ہوگا کہ کلاس روم کے لیکچر امتحان پاس کرنے کے لیے ہوتے ہیں جو یقینا ضروری بھی ہوتے ہیں، لیکن جب اپنی طبیعت میں ضد، لفظوں میں مقابلہ اور دل میں میل آجاتا ہے تب زندگی میں یہ تینوں فعل جیت جاتے ہیں اور سب سے قیمتی چیز یعنی رشتے ہار جاتے ہیں۔

☆ استاد کو یہ بتانا ہوگا کہ کامیابی پورا جسم چھوڑ کر صرف قدم ہی کیوں چومتی ہے۔ یہ بتانا ہوگا کہ پھل دار شاخیں کیوں جھک جاتی ہیں؟ کبھی کبھی اپنی زندگی میں موجود خوب صورت لوگوں سے ہار جانا کیوں ضروری ہوتا ہے؟

☆ انہیں بتانا ہوگا کہ زندگی جینے کا مزہ تب آتا ہے جب ساری دنیا کسی کے ہارنے کا انتظار کر رہی ہوتی ہے اور وہ اپنی ہمت اور حوصلے سے وہ مہم جیت گیا ہو۔

☆ انہیں بتانا ہوگا کہ کسی بھی شخص کا زوال تب شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے مخلص لوگوں سے منافقت شروع کر دیتا ہے۔

☆ استاد کو سکھانا ہوگا کہ کچھ خطائیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی بھی بخشی نہیں جاتیں۔ ان میں سے ایک کسی کا دل توڑنا ہے۔

☆ بتانا ہوگا کہ دوست کی غلطی کو ریت پر لکھو تا کہ مٹا سکو۔

☆ استاد کو بتانا ہے کہ عبادت کو زندگی بناؤ کہ اس کے بغیر آخرت نہیں ملنی۔ عبادت اخلاق اور کردار کا نام ہے، یہ عبادت اگر زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی تو زندگی مشقت کے سوا کچھ نہیں۔

☆ استاد کو یہ بھی سکھانا ہے کہ خوشامد ایک بیماری ہے، یہ دل کو میلا کر دیتی ہے۔

استاد تو ایک رہنما ہوتا ہے، اسے شمع کی مانند جلنا ہوتا ہے، خواہ وہ بجھ جائے مگر اپنی فکر کی روشنی سے اردگرد اجالا کر دے۔ استاد کو اپنے طالب علموں کی ذہنی آبیاری کرنا ہے کہ وہ آنے والا وقت ہوتے ہیں۔

☆ استاد کو صرف یہ نہیں پڑھانا کہ دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن مل کر پانی بنتا ہے، بلکہ پانی کا بے جا استعمال گناہ بھی ہے اور دوسروں کا حق سلب کرنا بھی ہے۔

☆ استاد کو صرف یہ نہیں بتانا کہ رسد طلب سے بڑھ جائے تو قیمت کم ہو جاتی ہے کہ یہ بات تو طوطا بھی رٹ کر دن بھر بول سکتا ہے۔ ماہر معاشیات نے یہی تو کہا تھا۔

☆ اسے صرف جیومیٹری کے دائرے اور تکون ہی نہیں سکھانے ہوتے، بلکہ یہ بھی بتانا ہوتا ہے کہ زندگی مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے گزارنی پڑتی ہے، اور یہ بھی کہ زندگی ہمیشہ 90 ڈگری کا زاویہ ہی نہیں ہوتی۔ اسے سمجھانا ہوتا ہے کہ دو اور دو مل کر ہمیشہ چار ہی نہیں ہوتے بلکہ مل کر ہزاروں اور لاکھوں ہندسے بن جاتے ہیں۔

علامہ اقبال نے کہا تھا ''ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ''۔ اور اس ستارے کی کمان استاد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں والدین اپنا بچہ استاد کے حوالے کر کے کہتے تھے: ہڈی ہماری، بوٹی آپ کی۔ زمانہ بدل گیا، اب ایسا نہیں ہے۔ استاد نے اپنے منصب سے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے اور طالب علم نے استاد کی عظمت کو ماننا بند کر دیا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ یہ ایک سوال ضرور ہے مگر ایسا سوال کہ جس کا جواب سب جانتے ہیں مگر ہمیں اب اپنی تہذیب سے دلچسپی نہیں رہ گئی ہے، سو استاد سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے اور طالب علم ذہن کی آبیاری کے مفہوم سے نابلد ہیں۔

دنیا میں ایسے بھی ملک ہیں جہاں استاد نے اپنی عزت بنا رکھی ہے، اسی باعث فرانس کی عدالتوں میں استاد کے سوا کسی کو کرسی پیش نہیں کی جاتی۔ جاپان میں پولیس کو استاد کی گرفتاری کے لیے پہلے حکومت سے خصوصی اجازت لینی پڑتی ہے۔

کوریا میں کوئی استاد اپنا کارڈ دکھا کر اُن سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو ہمارے ملک

میں صرف وزیروں، مشیروں اور اسمبلی اراکین کے لیے مخصوص ہیں۔

مختصراً کہنا صرف یہ ہے کہ معاشرے میں تہذیب نظر آئے گی اور وہ استاد اپنے شاگردوں کی ذہنی آبیاری میں اپنے فرائض سے روگردانی نہیں کرے گا۔ اس کے لیے استاد کو اپنا منصب سمجھنا پڑے گا اور طالب علموں کو مکمل طور پر شاگرد بننا ہوگا۔

☆☆☆

اجازت ہوتو ماضی یاد کرلیں

(وہ دن جب طلبہ یونین پر پابندی عائد کی گئی)

صاحب! ماضی یاد کرنے کے لیے یقیناً کسی کی اجازت کی تو ضرورت نہیں ہوتی ہے لیکن بعض لوگ اتنے تابعدار قسم کے ہوتے ہیں کہ اٹھنے بیٹھنے، سونے، سوچنے اور کھانے پینے کی بھی اجازت طلب کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ کون سی قسم کے انسان ہوتے ہیں؟ اس کا فیصلہ کرنا ہمارے دائرۂ اختیار میں نہیں، لیکن میں نے جو اجازت مانگی ہے وہ صرف ماضی کی یاد سے متعلق ہے۔ ماضی ایک ایسا لفظ ہے جسے آپ کسی بھی معنوں میں استعمال کریں عقلمند لوگ اسے سیاسی اصطلاح قرار دینے سے نہیں چوکتے۔ ہم ٹھہرے بزدل قسم کے سرکاری ملازم، ''جی ہاں'' کے علاوہ ''جی نہیں'' بولنا ہماری شرطِ ملازمت میں کہیں درج نہیں۔ پھر سیاست کے میدان سے ویسے ہی ہم کوسوں دور بھاگتے ہیں اپنے مزاج کے باعث، لیکن سرکاری ملازمت ہمیں اس گوشے میں جانے سے روکتی بھی ہے۔ ہمارا ارادہ اتنی اچھی سرکاری ملازمت چھوڑنے کا ہرگز نہیں، اس لیے ہم خاصی احتیاط برتتے ہیں۔ یوں بھی ہمارا پیشہ آج کل جن مشکلات سے دوچار ہے اس میں عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اجازت ضرور طلب کرلیا کریں۔ چلیے ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ ہم ایک سرکاری کالج میں استاد ہیں۔ مدتوں سے ایک ہی تنخواہ پر ملازم ہیں۔ پروموشن وغیرہ کے لفظ سے تو آشنا ہیں، مگر اس کے مزے آج تک نہیں چکھے۔ بس یہ ہے ہماری مظلوم سی ہستی اور ہمارا مختصر سا تعارف۔ تو صاحب آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں موضوع سے بھٹک رہی ہوں۔ بس آپ کی اجازت درکار تھی۔ اجازت ہے تو ہم بھی شروع ہیں۔

جب ہم چھوٹی جماعتوں میں قواعد پڑھا کرتے تھے تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ ماضی دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ایک ماضی بعید اور دوسرا ماضی قریب۔ ہم اس وقت اسی قسم کے دونوں ماضی کو

یاد کررہے ہیں۔ ماضیِ بعید کا ایک واقعہ ہے کہ کراچی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ کی جماعت یونی کیرین کا ایک جلسہ فریئر گارڈن میں منعقد ہوا۔ وہ شام کراچی کی سہانی شاموں میں سے ایک تھی۔ سہانی موسم کے اعتبار سے بھی اور مزاج کے اعتبار سے بھی۔ مزاج سے مراد ہے کہ پرانے طلبہ کا اجتماع دل و دماغ کو کچھ ایسا معطر کردیتا ہے کہ مزاج کی خوشگواری کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ کچھ اپنی طالب علمی کا سنہرا زمانہ یاد کرنے کو ملتا ہے اور کچھ پرانے ساتھیوں سے مل کر ہم آپ ہی آپ کمسن سے ہوجاتے ہیں اور کمسنی کے زمانے کی پھر بات ہی کیا۔ شوخ و چنچل ساز مانہ، جہاں گرد آلود فضائیں، پُر بہار اور کٹھن آزمارا ستے پھولوں کی سیج ہوتے ہیں۔ استاد کا خوف، امتحان کا بھوت ہمارے دل کی کلی کو پھر بھی خاکستر نہیں کرپاتا۔ ایک ایسی شام جب ہم پھولوں کی طرح ہلکے اور بادِ بہار کی طرح جھوم رہے تھے۔ ہمارے ایک یونی کیرئن بھائی جو خیر سے وزارتِ تعلیم کے قلمدان کو اپنی گرفت میں لیے تھے' انہوں نے دھواں دھار تقریر شروع کی۔ جامعہ بھائی کی شخصیت ہمیں اچھی لگی لیکن ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو کے بجائے مرجھائے ہوئے پھولوں کا روکھا پن تھا۔ تقریر کیا تھی اساتذہ کی شان میں قصیدہ تھی۔ اس دور میں سب سے آسان کام استاد کی چھان پھٹک ہے۔ یہ مظلوم ہستی جواباً کچھ بولتی جو نہیں۔ چاروں طرف سے مخالفت کے بادل ہیں اور دنیا کی ہر بے ترتیبی کا ذمہ دار بس استاد کو سمجھ لیا گیا ہے۔ سو ہمارے جامع بھائی بھی اپنی تقریر کو استاد کی ہجو سے آراستہ پیراستہ کیے دے رہے تھے۔ طلباء کی بدحالی' تعلیم کی خستہ حالی' معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ' ظالم کی لوٹ کھسوٹ غرضیکہ تمام تان آ کر صرف اساتذہ پر ٹوٹ رہی تھی۔ تعلیمی ادارے بند رہنے کے ذمہ دار استاذ' طلباء کو کلاشنکوف تھمانے والے بس استاذ' کرفیو لگانے والے استاذ' معاشی' سماجی و اقتصادی ہر طرح کی بدحالی بس اس کے ذمہ دار صرف استاد۔ ایک طرح سے تو انہوں نے اساتذہ کو اتنا بااختیار بنا کر دکھایا کہ ہمارا جی چاہا کہ کاش ہمارے پاس ایسا ہی ایک الہٰ دین کا چراغ ہاتھ آجائے کہ ہم یہ سب کچھ اپنے قبضے میں لے لیں۔ الزام کی تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ اساتذہ ہمیں اٹھارہ گھنٹے پڑھاتے ہیں اور بس۔ حساب کتاب کے ماہر یہ صاحب جب سب کچھ کہہ چکے تو ماحول بدل چکا تھا۔ فضا کی ساری شیرینی ختم ہوچکی تھی اور ہم ہمجولیوں کی موجودگی میں بھی بس ایک دم تنہا کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کاش ہمارے منہ

میں زبان ہوتی اور اب انہیں کچھ جواب دے پاتے۔ جرنیلی زمانے میں زبانیں کھینچنے کے کام آتی ہیں دفاع کے لیے نہیں۔ دل میں عجب طرح کی کسک پل رہی تھی۔ بے بسی کا ہجوم تھا اور ذہن غبار آلود ایک آزاد وطن کے آزاد شہری کی یہ مجسم تصویر اپنا مذاق آپ تھی۔ دل سے ایک آہ نکلی۔ ہمارا منصب بددعا دینا نہیں سکھاتا' سو بس ایک دعا منہ سے نکل گئی: کاش ہمارا وطن ایک بار پھر آزاد ہو جائے' ہمارے منہ میں زبان آ جائے اور ہم بول سکیں' ہم جواب دے سکیں' ہم اپنا دفاع کر سکیں۔ نہ جانے یہ آہ کتنا اثر رکھتی تھی کہ جلد ہی عرش تک پہنچ گئی اور ہمارا وطن آزاد ہو گیا۔ ہمارے منہ میں زبان آ گئی اور ہم اپنا دفاع کرنے کے لائق ہو گئے۔

ہمارے ہی ایک طالب علم ساتھی ہماری وزارت کے وزیر ہو گئے اور ماضی قریب میں ہم نے اپنے شہر کے کمشنر کا ایک بیان پڑھا جس میں انہوں نے اساتذہ کے بارے میں صرف ایک جملہ کہا اور کوزے میں دریا کو سمو گئے۔ انہوں نے کہا۔ یہ ہمارے اساتذہ ہی کی ہمت ہے کہ اتنے صبر آزما اور کٹھن حالات میں تدریس کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کمشنر کراچی ہمارے جامع بھائی ہیں۔ ہم نے ساتھ ساتھ جامع میں تقریر کی جادوگری دکھائی۔ برابر برابر کے شعبے میں تعلیم پائی اور تعلیم کے چار سال جامع کی گرد' چاٹ' کتابیں سب کو اپنے اندر اتار لیا۔ آج اجازت ہو تو اس زمانے کے اوراق کو الٹ پلٹ کر بہار کے مزے لے لیں۔

ہم اس وقت استاد نہیں طالب علم تھے۔ کالا گاؤن پہنتے تھے۔ ہاتھ میں کتابیں ہوتی تھیں' دل میں امتحان کا خوف' سامنے سے ہرے گاؤن والے کوئی بھی استاد گزر جاتے تو سانس رک جاتی اور اس وقت تک رکی رہتی جب تک وہ سامنے سے گزر کر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ کلاس روم میں طالب علمانہ صورتحال عروج پر ہوتیں۔ کسی استاد کے لیکچر اتنی محویت سے لیتے کہ اپنے آپ کو بھولے ہوتے۔ کسی استاد کی کلاس کو حاضری کا درجہ دے کر چپکے سے پیچھے سے کھسک جاتے۔ کسی استاد کے لیکچر پر لقمہ دیتے۔ کسی کی آواز ٹیپ بھی کرنے کا بندوبست کرتے لیکن استاد کی ان تمام تقسیم کے باوجود ہرا گاؤن ہمارے لیے تقدس کی بے پناہ علامت بنا ہوتا۔ بغاوت کی تمام تر قوت رکھنے کے باوجود سراپا اطاعت گزار بننا اپنا دین اور ایمان ہوتا۔ اپنی بات منوانے والی عمر کے باوجود دوسرے کی بات ماننا ضروری خیال کرتے۔ جلسے جلوس کرتے' فنکشن کرتے اور ہوٹنگ

کرتے۔ کھیلتے' ہارتے بھی اور ہراتے بھی لیکن کالا گاؤن ہمارا وقار ہوتا اور ہرا گاؤن ہمارا رہنما۔ ہم نے جامع کے اسٹیج پر ہر طرح کی نقالی کی۔ ساتھیوں کی آوازیں نکالیں۔ اساتذہ کی حرکات و سکنات کو بھی نہ بخشا لیکن کلاس روم کی نقل کو اپنے ایمان سے خارج جانا۔ اکادکا کیس ہوا بھی تو کاپی استاد نے اٹھالی اور طالب علم پاؤں پڑ گیا۔ استاد کا دل پسیج گیا اور طالب علم کا دل ڈوب گیا۔ توبہ کی اور پھر اس کوچے میں کبھی نہ گئے۔ استاد سے تھپڑ بھی کھائے اور اسے ستایا بھی اور جب وہ سامنے آیا تو جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ میجر آفتاب حسن کی لاٹھی کی آواز اب بھی ماضی کی یادوں میں سے ایک ہے۔ تین فٹ کا فاصلہ اب بھی محاورے کے طور پر ہماری پرانی محفلوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وائس چانسلر اشتیاق حسین قریشی کی معصوم اور پُراسرار شخصیت کا دھیما پن اب بھی نظروں کے سامنے ہے۔ قاضی فرید مرحوم اپنے چھوٹے قد کے باوجود آج بھی ہمارے دلوں میں دراز قامت لیے کھڑے ہیں۔ مطلوب صاحب کی چپ چاپ تدریس کے 25 سال ہمارے لیے نشانِ راہ ہیں۔ خورشید صاحب کی متانت وسنجیدگی مجسم درس ہے۔ ڈاکٹر سرور' محترم جعفر کو اب بھی ہم ماموں سمجھتے ہیں۔ فخر الدین صاحب تو استاد کم دوست زیادہ رہے۔ صدیقی صاحب کے مختصر مختصر لیکچر دنیا کی بے ثباتی کا جو نقشہ پہلے کھینچا کرتے تھے آج بھی ان کے حوالے سے دنیا اتنی ہی بے ثبات ہے۔ اور ہمارے احسان رشید استاد کی شان ...... یہ سب مختلف نام ہیں لیکن ان کا مجموعی طور پر ایک ہی نام ہے اور ایک ہی چہرہ۔ یہ استاد تھے، ہمارے استاد۔

ایسا لگتا ہے ہم جامع پڑھنے کم جاتے تھے بس اس کی عزت کرنا ہمارا فرضِ اولین تھا۔ ہم نے اس وقت ہی سوچا کہ جب ہم کالا گاؤن اتاریں گے تو ہرا گاؤن ضرور پہنیں گے اور ہرا گاؤن پہن کر جب ہم اپنے طالب علموں کی سامنے سے گزریں گے تو ان کے دلوں کی دھڑکنیں رک رک جائیں گی، ان کی سانسیں بند ہوجائیں گی، وہ نظروں نظروں میں ہماری یونہی بلائیں لیا کریں گے۔ جیسا کہ آج ہم لیتے ہیں۔ ہم بھی ان کے لیے نشانِ راہ ہوں گے، منزل ہوں گے، ان کے لیے ان کا آسمان ہوں گے اور عزت وعظمت کا مینارہ ہوں گے اور ہم بھی ان کو اسی انہماک سے علم کے موتی، ذوق کے آبگینے، تربیت کے گہر اور قابلیت کے نگینے فراہم کریں گے، اس کے لیے ہم نے بڑی محنت کی۔ بڑی لگن اور کوشش کے بعد ہرا گاؤن ہمیں مل گیا۔ زندگی کا وہ پہلا پہلا دن

ہمیشہ ہمیں یاد رہے گا۔ ہم قدم میں کچھ اور بڑھ گئے تھے، وزن کچھ اور بھاری ہو گیا۔ سوچیں گہری ہو گئیں، قدم قدم میں اعتماد تھا۔ گفتگو اور انداز بدلے بدلے سے۔ ہرا گاؤن ہماری نئی زندگی کی نئی نوید تھا۔ طالب علموں نے بھی ہمارا ساتھ دیا، عزت کی، ہمیں روشن تارا سمجھا۔ اپنی منزل جانا ہم سے مل کر وہ خوش ہوئے، ہم سے جدا ہوتے ہوئے وہ روئے، وہ جہاں کہیں ملے ان کی نظروں میں پیار اور دل محبت سے لبریز تھا۔

ہم بھی فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ ہمارے طالب علم کلاس روم اور اسٹیج میں ایک توازن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہم سے پڑھتے رہے اور اسٹیج پر اپنے جوہر دکھاتے رہے۔ ہم اپنی تعلیمی زندگی سے حاصل کیے ہوئے تجربوں سے انہیں پختہ کرتے رہے، انہیں مباحثے کے آداب بتائے، ان سے شاعری کرائی، ان کی معلومات کا ٹیسٹ لیا، انہیں ڈرامے کرائے، موسیقی کی تربیت دی، ہم اور وہ بہت خوش تھے۔ ہماری زندگی میں ٹھہراؤ تھا اور وہ زندگی کے اس موڑ پر تھے جہاں کچھ کرنے کا بھی دل چاہتا ہے تیرنا نہ جانتے ہوئے بھی سمندر میں کود کر لہروں کے تھپیڑے کھانے یا ڈوب بھی جانے سے وہ خوفزدہ نہیں ہوتے۔

وہ دن بہار کے تھے، سکون کے تھے کہ ایک آندھی آئی اور یہ آندھی اتنی شدید تھی کہ ہمارے ہرے گاؤن کے تار تار بکھر گئے اور ان کے کالے گاؤن کہیں کھو گئے۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی کوششیں کیں۔ ہم نے تار تار لباس کو سینا چاہا، انہوں نے گمشدہ لباس کو ڈھونڈنا چاہا لیکن آندھی بڑی بے رحم تھی وہ آنکھوں میں مٹی بھی بھر گئی اور انہوں نے ہمیں پہچاننا چھوڑ دیا ہم محبت کرنے کے لیے ایک ایک کو ڈھونڈتے رہے۔ ہمارے درمیان اجنبیت بڑھتی گئی۔ کلاس روم کہیں کھو گئے، اسٹیج کہیں گم ہو گئے۔ طالب علموں کی جوانی کا رخ مڑ گیا۔ ہمارا ٹھہراؤ بس موت کی خاموشی تھا۔ ہم تو پتھر کا بت تھے، شاید ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا تھا اسی لیے پتھر کے ہو گئے۔ ہرے گاؤن ہمارے کندھوں پر جھول رہے ہیں لیکن ان کے مابین تار تار ہم اپنے طالب علموں کی زبان نہیں سمجھتے کہ اب وہ ہمارے ہم وطن نہیں رہے، وہ مختلف صوبوں کے لوگ ہیں، وہ اپنے کالج کے لوگوں کو رنگ و نسل کی تمیز کے ساتھ پہچانتے ہیں، اسی لحاظ سے نفرت و محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں بھی خانوں میں بانٹتے ہیں، اپنے خانوں میں فٹ نہ پا کر وہ ہم سے ناروا سلوک کرتے ہیں، ان

کے اس سلوک سے ہم ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ اپنے گاؤں کی طرح تار تار ہو گئے ہیں۔ ہم محبت کرنا چاہتے ہیں، ہم ان کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں، ہم ان کا آسمان بننا چاہتے ہیں، ان کی منزل بننا چاہتے ہیں، انہیں اپنا بنانا چاہتے ہیں، ان کی عمروں کی معصومیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، انہیں کلاس روم میں پڑھانا چاہتے ہیں، انہیں اسٹیج پر تربیت دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہ سب ایک رنگ ایک نسل کے لگتے ہیں، وہ ہمیں بھولے معصوم لگتے ہیں۔ ہم ان سے پیار کرتے ہیں، انہیں آندھیوں سے بچانا چاہتے ہیں، انہیں طوفانوں کی زد سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، ہم بڑھ کر ان کا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں مگر ہمارے ان کے درمیان بہت فاصلے ہیں۔ چلتے چلتے ہمارے پیر تھک گئے ہیں، ہم پھر بھی ہمت نہیں ہارے ہیں۔ ہم چیونٹی کی طرح بار بار اونچائی پر چڑھنے کی کوشش کررہے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ ہم کامیاب ہوں گے لیکن اس میں ہمارے بہت سے پیارے مارے جائیں گے، بہت سوں کی عمریں بیت جائیں گی، بہت سے بھٹک جائیں گے، بہت سے پچھتا رہے ہوں گے۔ ہم جو رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر انہیں دیکھتے ہیں ہمیں سب کے چہرے ایک سے لگتے ہیں۔ ان کے ٹوٹ جانے، بکھر جانے، کھو جانے اور لٹ جانے سے ہم بہت اداس ہیں۔ ہمارے تعلیمی ادارے سوگ میں بند ہو گئے ہیں، ان کی بہاریں کسی نے لوٹ لی ہیں۔ ہمارے قدم روز ادھر اٹھتے ضرور ہیں لیکن ڈگمگاتے قدم۔ اب ہم نوکری کرنے جاتے ہیں، اب ہم سرکاری ملازم ہو گئے ہیں۔ ہمیں ماہانہ خاص رقم کا ایک چیک ملتا ہے اور ہر ماہ اس چیک کو بغور دیکھتے دیکھتے ہمارے آنسوؤں کے کئی قطرے اس میں جذب ہو جاتے ہیں کہ چیک ہمارا مقصدِ حیات نہ تھا، یہ تو جینے کے لیے ایک چھوٹی سی ضرورت تھی۔ مقصدِ حیات تو گیارہ برس کی تعلیمی بربادی میں گم ہے، جب طالب علموں سے ان کا اسٹیج چھین لیا گیا تھا، جب ان کی عمروں کی معصومیت کو تعصّبات کی آگ میں ڈال دیا گیا تھا جبکہ ان کے کچھ کر گزرنے کے حوصلوں کو پسپا کیا گیا، ان کے ہاتھوں سے کتاب چھین کر اسلحہ تھما دیا گیا وہ پھر بھی ہرے گاؤں کا احترام کرتے رہے تو پھر ان کے تعلیمی اداروں میں بے وجہ تالہ بندی کی گئی، انہیں ان کے استادوں سے دور کر دیا گیا تا کہ وہ رہنمائی کی ایک کرن بھی ان سے نہ حاصل کر سکیں اور خود وہ روش اختیار کی کہ اساتذہ کے خلاف جب جب موقع ملا زہر اگلا، ادارے خود بند کیے۔ استاد کو بدشوق قرار دیا۔

کلاس روم سے جبراً نکالا اور اساتذہ پر الزام کہ وہ پڑھانا نہیں چاہتے۔ معصوم طلباء جو کچی عمروں کے تھے، جذبات کی رو میں بہہ گئے لیکن استاد کے دل سے اپنے طالب علموں کا درد نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی کہ یہی ایک ننھی سی کرن روشن ہے۔ شاید یہی کرن کبھی بڑے اجالے کا سبب بن جائے۔ بھٹکے طالب علم اپنے دوست اور دشمن کو پہچان لیں تو پھر ہم ان کے لیے ہدایت کا مینارہ ہو جائیں گے، ان کی منزل بن جائیں گے اور وہ رہنمائی کے لیے کسی اور کے پاس نہ جائیں گے، وہ اپنی ماں کی گود میں آ جائیں گے اور اپنے باپ کی شفقت کو پالیں گے۔ محبت میں بڑی طاقت ہے، یہ طاقت بڑے بڑے بتوں کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ شکریہ ادا کرتے ہیں اپنے شہر کے کمشنر اور اپنے جامعہ بھائی کا جنہوں نے ہمیں بے قصور جانا۔ ہمارے تار تار پیراہن پر افسوس کیا۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے اپنا ماضی یاد رکھا ہوا ہے جہاں نشانِ منزل استاد ہوا کرتے تھے۔ اور جو اپنا ماضی بھول گئے ہیں، خدا کرے ان کی یادداشت بحال ہو جائے۔

آپ سے شروع میں میں نے اجازت چاہی تھی کہ مجھے میرا ماضی یاد کرنے دیں۔ اب میں آپ کو اجازت دیتی ہوں کہ آپ اپنے ماضی کے آئینے میں اپنے چہرے کے نقوش کو بغور دیکھیں، دیکھیں کہ وہ کتنے بگڑ گئے ہیں، کتنے سنور گئے ہیں کہ اپنا محاسبہ انسانیت کی شرطِ اولین ہے۔

☆☆☆

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ

آج 20 فروری 2002ء کی شام ہے۔ آج کی شام میں اپنے ماضی کے ساتھی طالب علموں سے مخاطب ہوں اور انہیں کراچی جم خانے کے خوب صورت ہال میں خوش آمدید کہتی ہوں۔

ساتھیو! سابق طلباء انجمنوں کے جہاں دوسرے اور بہت سے فوائد ہیں وہاں سب سے خوش گوار پہلو یہ ہے کہ ہم وقت کی قید سے آزاد ہوکر ماضی کے ان دنوں میں پہنچ جاتے ہیں جب ہمارے چہرے کے خدوخال دلکش ہوتے تھے' ہم نوعمر ہوتے تھے۔ ہم میں خواہشات اور خوابوں کا طوفان برپا ہوتا جو ہمارے اندر توڑ پھوڑ کرتا رہتا۔ امنگیں' آرزوئیں' حوصلہ اور طاقت ایسی کہ بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرا جانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ لڑ پڑتے اور جیت کر دم لیتے۔ ہار بھی جاتے تو حوصلہ پھر بھی جوان رہتا۔ خواب دیکھتے اور خوش رہتے۔ مستقبل کے تانے بانے بنتے مگر یہ نہیں جان پاتے کہ جب ہم اپنی اپنی منزلوں پر پہنچیں گے تو کس قدر تھک چکے ہوں گے اور اس تھکن کا اثر ہمارے شگفتہ چہروں پر بھی پڑے گا۔ ماتھے کی لکیریں گہری اور بڑھتی عمر کی بے ترتیب شکنیں عیاں ہوجائیں گی۔ ہمارے خواب تو پورے ہو چکے ہوں گے مگر ان خوابوں کو Share کرنے والے راستے کی اونچ نیچ میں بھٹک کر کہیں گم ہو چکے ہوں گے۔ وہ کون سا مقام ہوگا جہاں ہم پھر مل سکیں گے۔

یہ موقع تو سابق طلباء کی انجمنیں ہی فراہم کرتی ہیں اور ایسی انجمنوں کے خالق اور رکھوالے کوئی ایک دو ہی جنونی ہوتے ہیں جو اسے بناتے ہیں' چلاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً وقت کو مٹھی میں لے کر دستیاب ساتھیوں کو ایک مقام پر جمع کر دیتے ہیں اور زندگی کے ان دنوں میں جبکہ بالوں میں چاندی جھلک چکی ہوتی ہے اور چہرے کے خدوخال پہچان میں رکاوٹ بن جاتے ہیں تب جمع ہوکر ایک دوسرے کو ماضی کے حوالوں سے پہچاننا اچھا لگتا ہے۔

ساتھیو! ایسا ہی ایک دن آج بھی آیا ہے۔ آج ہم ماضی کی تمام تر داستانوں اور گزرے خوب صورت دنوں کو اپنے اردگرد محسوس کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ سب اپنے اپنے دور کے ان دنوں میں پہنچ جائیں جہاں اپنے شفیق پرنسپل کی آواز سنائی دے اور آپ کے عزیز اساتذہ کے لیکچرز کی گھن گرج سے آپ دہل جائیں۔

چھوٹے سے نیشنل کالج کو یاد کریں۔ سامنے چیل والی کوٹھی ہے جہاں 36 نمبر کی لڑکھڑاتی بس آ کر رک جاتی ہے اور کنڈیکٹر چیخ چیخ کر "پسنجر" گھروں سے بلالایا کرتا۔ چھوٹا سا بنگلہ جس میں نچلی منزل میں نیشنل کالج اور اوپری منزل میں مالک مکان رہتے۔ جن کا ایک لڑکا نام اس کا مسعود سیڑھیاں اتر کر کلاس روم میں پڑھنے آجاتا۔

یہ چھوٹا سا نیشنل کالج ہو یا بڑا سا خوب صورت نیشنل کالج حسن عادل صاحب کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ مختصر سا آفس جو اسٹاف روم کا بھی کام دیتا تھا۔ دروازے پر لٹکی چک جس کے پار دوڑتی نظریں طلباء و طالبات کی ایک ایک حرکت کو کنٹرول کرتیں۔ گویا حسن عادل صاحب کے پاس کرنے کو کوئی اور کام تھا ہی نہیں۔ ایک کنارے "بابا" اسٹول پر اپنے آپ کو سجائے ہر وقت بیٹھے ملتے جن کا نام نہ ہمیں پہلے پتہ تھا نہ آج تک معلوم ہوسکا۔ ہر ہر کونے کی اہم اور غیر اہم خبریں جانے کیسے ان تک پہنچ جاتیں۔ اس باعث ہمیں ان سے محتاط رہنا پڑتا۔

گورے چٹے خوش شکل خوش لباس، مسکراہٹ بھی غضب کی اور غصہ بھی خوفناک۔ شفقت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور سزا دینے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ہری ہری آنکھیں اور مسکراتے ہونٹ ان کی شخصیت کا خاصہ تھے۔ طالب علموں سے بے انداز محبت اور ان کی تربیت میں بے حد سخت۔ کہتے بھی تھے میں نے سرسید کے علی گڑھ میں پڑھا ہے، تعلیم کو کم اور تربیت کو اولیت سمجھتا ہوں۔

معاشیات پڑھاتے تو یوں جیسے شاعری پڑھا رہے ہوں۔ دھیما لہجہ، مثالوں سے بھرا لیکچر، آٹھواں پیریڈ طالب علم ان کے لیکچر کو لوری سمجھ کر سو جانے پر مجبور ہوجاتے۔

یاد کریں ان کی ایک نصیحت "جس سے شکایت ہو اسی سے اپنی شکایت بیان کرو وہ اپنے آپ کو درست کرے گا یا تمہاری غلط فہمی دور کرے گا ورنہ تم غیبت کے مرتکب ہوگے۔" یہ میں نے

اپنی درس گاہ کے عالموں سے سیکھا ہے جنہیں سرسید نے اپنی درس گاہ کا نگہبان بنایا تھا۔

حسنین کاظمی صاحب کی نوجوانی کا زمانہ جس میں انہوں نے سنجیدگی کا مصنوعی لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مجال ہے جو ذرا بھی مسکرادیں۔ شیروانی اور سیدھے پائجامے میں کان پوری انداز۔ کم عمری میں استادی کی گدی نشینی کے باعث محتاط سا رویہ۔ اس پر سے وائس پرنسپل کا عہدہ بس غضب ہی تو ڈھاتا تھا۔ میر غالب پڑھاتے ہوئے ان کا جھینپ جھینپ جانا۔ اقبال اور حالی پڑھاتے وقت ان کے لہجے کا جوش ان کی کمسنی کی چغلی کھا رہا ہوتا۔ حسرت موہانی کو اپنا محبوب کہتے ہوئے لفظ محبوب ادا کرتے وقت آنکھیں نیچی کر لینا ہم سب کو بڑا بھاتا۔

☆ ظفر عمر زبیری' اللہ اللہ دو مضامین کے اکیلے استاد۔ نہ ہمیں سوکس اچھی لگتی تھی نہ تاریخ مگر ان کے گرمی کی بھری پری دوپہر میں طویل لیکچر کی آواز کلاس روم سے نکل کر ہم بیچاروں کے گھاس پر بیٹھ کر فرصت کے اوقات کو ان کے لیکچر سننے پر مجبور کر دیتے۔ اچھے استاد تھے۔ کم مسکراتے' ٹھیک ٹھاک ڈانٹ لیتے اور اپنے طالب علموں سے محبت کرتے' ملتے۔ بادشاہوں کے عہدِ حکومت اور مختلف جنگوں کا تاریخ وار واقعہ دنیا بھر کے ملکوں کے بنائے گئے دستور پر ان کے خشک لیکچر بغیر ان کا طالب علم بنے ہمیں مفت میں ملے اور ہم ان سے مستفید ہوتے رہے۔

☆ حسن مثنیٰ ندوی کی قدآور شخصیت کا رعب۔ لمبا قد' منحنی جسم' شیروانی اور پائجامہ' سر پر جناح ٹوپی' ہونٹوں پر پان کی لالی اور اس میں سے جھانکتی ہوئی دھیمی دھیمی مسکراہٹ ہونٹوں ہی سے نہیں آنکھوں سے بھی چھلکی پڑتی۔ کلاس روم میں سموسوں کی فرمائش اور ان کے کینٹین اکاؤنٹ سے بغیر اجازت چائے پینے کا مزا بھلا کون سا طالب علم زندگی بھر بھول سکتا ہے۔ اسلامیات پڑھاتے اور بس پڑھاتے چلے جاتے۔

☆ اور جب ذکر یحییٰ سلام اللہ کا آئے تو ان کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ اور پتلون نظروں میں گھوم جاتا ہے جس میں ایک اور یحییٰ سلام اللہ آسانی سے سما سکتے تھے۔ بے میچنگ ٹائی جو اپنا زمانہ گزار چکی ہوتی اور ملگجی سی شرٹ میں ملبوس۔ لمبے لمبے بال لہراتے کلاس میں داخل ہوتے تو کہے بنا ہم سب کہاں رہتے کہ یہ اپنے وقت کے سقراط اور بقراط ہیں۔ کیا عالمانہ گفتگو کرتے۔ انگریزی پڑھاتے Arms & the man کے کردار اور ان کا Sergius اور Riana یا Louka

بن کر کردار نبھانا پیریڈ میں جان ڈال دیتا۔'ڈرامہ' کہتے پڑھانے کی چیز نہیں، کرنے کی چیز ہے۔ یہ ان کا فرمان تھا جو ہمیں آج بھی یاد ہے۔

درمیانہ قد' بھاری جسم' پینٹ پر شیروانی اور بغیر لیس والے بند جوتے پہنے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی سجائے شمس الحق صاحب کا مضمون نفسیات تھا اور طالب علم ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ان کے گرد جھرمٹ کی صورت آس پاس رہتے۔نفسیات کی آسان انگریزی اصطلاحات کا ثقیل اردو ترجمہ کر کے وہ ہمیں اس کا تلفظ سکھاتے سکھاتے تھک جاتے۔ان کی نرم اور پُرکشش شخصیت کا سحر ہر طالب علم اپنے جسم و جان پر لیے شاداں و فرحاں پھرتا۔

☆ حمید صاحب جو کیپٹن صاحب کے نام سے پہچانے جاتے ایسی اکنامکس پڑھاتے کہ چھکے چھوٹ جاتے۔قد چھ فٹ سے تجاوز کر گیا تھا۔بہترین سوٹ سے آراستہ رہتے۔گردن دائیں بائیں موڑنے میں محتاط کہ کہیں کالر یا پتلون کی کریز پر شکن نہ پڑ جائے۔

معاشیات پڑھاتے وقت وہ خود مارشل اور رابنز کا روپ ڈھال لیتے۔یوں بتاتے' یوں سمجھاتے کہ ان کا طالب علم اپنی زندگی کی ہر یاد بھلا سکتا ہے سوائے ان کے پڑھائے ہوئے سبق کے۔اور یہ بات بالکل سچی اور پکی بھی تھی۔ہم آج تک ان کی کلاس کے سحر سے باہر نہیں آپائے ہیں جبکہ آدھی صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔

☆ کیا بات تھی پروفیسر احمد علی کی' انگریزی پڑھانے کیا آئے ہمیں خود انگریزی مضمون سے دلچسپی بڑھ گئی۔کئی صدی پہلے سلا ہوا لائن دار کوٹ' اس سے بھی قبل سلا ہوا پینٹ۔مجال ہے ٹائی کے بغیر ہوں۔صورت شکل اللہ نے انگریزوں جیسی بنائی تھی اور تلفظ ثابت کرتا تھا کہ کوئی انگریزی زبان میں ان کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔Ode to the west wind آج بھی ان کے ہی نام سے منسوب ہے۔Casablanka اور Ode to the nightingale آج تک زبانی یاد ہے۔

دلی کی شام اردو میں لکھا ناول تھا مگر انگریزی ترجمہ بھی انہوں نے ضروری سمجھا۔قران پاک کو بھی انگریزی میں منتقل کر کے انگریزوں کے آگے رکھ دیا۔کیا کمال کے استاد تھے۔ہم ان سے پڑھنے کے بعد آج تک اس بات پر نازاں ہیں کہ ہم ان کے شاگرد تھے اور وہ ہمارے استاذ

اسے ہم پہلے بھی اور آج بھی اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

☆ کیا ہم سب عشرت چیرا ای کو بھول سکتے ہیں جسے غیب سے یہ علم ہوجاتا کہ اس وقت کس طالب علم کو پیاس لگی ہے، خاص طور پر کس طالبہ کو، کہ پانی سے بھرا گلاس از خود پیش کر دیتا۔ اس کی اس خصوصیت پر ہم نے کئی بار نفسیاتی مسئلے کے طور پر کھوج لگانے کی کوشش کی مگر ہم تو کیا خود نفسیات کے استاد بھی ناکام رہے۔

آپ یاد کیجیے اُن دنوں کو جب ہم مباحثے کے میدان کے شہسوار تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے کہاں کہاں سے دلیلیں ڈھونڈ کر لاتے تھے اور روسٹرم کو اپنے مضبوط مکوں سے ہلا دیا کرتے۔

ان ہولناک راتوں کو یاد کیجیے جو کسی تقریب کے خاتمے پر شروع ہوتی تھیں اور رانا اظہر کی موجودگی کے باعث خوف سے لڑکیاں سہم سہم جاتی تھیں جبکہ بے چارے مفت کے بدنام رانا اظہر علی خان ان کی ڈھارس بندھا کر بحفاظت گھر چھوڑ آتے۔

☆ پکنک کی اس خوفناک رات کو یاد کیجیے جب سارا کالج رات کے بارہ بجے چراغاں ہو رہا تھا اور ہم جنگل میں واپسی کے لیے بس نہ پہنچنے پر ایک کوٹھری میں بحفاظت بند کر دیے گئے تھے اور اس کوٹھری کے اردگرد بہادر لڑکے پہرہ دے رہے تھے اور شرارتاً شیروں کی مصنوعی آوازیں نکال کر ہماری جان بھی ساتھ میں نکال رہے تھے اور ہمارے پریشان ابا لوگ کالج میں رت جگے کا سماں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حسن عادل صاحب پر وار ہی وار کر رہے تھے اور پھر آئندہ کے لیے یہ پالیسی ترتیب دی گئی کہ اب اس کالج کی تاریخ میں پکنک حرام کردی گئی ہے۔

☆ الیکشن کی بہاریں یاد کریں۔ امیدواروں کا ہارنا جیتنا ان سے ''ٹریٹ'' لینا اور ان سے ووٹ کے جھوٹے وعدے کرنا۔

☆ ہمیں یاد آ رہے ہیں ہمارے پیارے اور سب کے پیارے مکرم بھائی جن کے لیے کہا جاتا تھا کہ سن تیس سے ہیں، آج تک رواں دواں۔ اور وہ نرم دل مطلوب بھائی، ہر طرح کی مدد کے لیے ہر وقت دستیاب رہتے، اور وہ ظفر عزیز باجوہ جو کالج کے بالکل ساتھ والی لمبی چوڑی کوٹھی میں رہتے اور خود اپنی لمبائی اور چوڑائی پر بھی نازاں تھے۔ ملک ریاض جو اپنی مترنم آواز کے لیے

مشہور تھے، ہمیں ان کے گانے بھی یاد ہیں اور ان کا چہرہ بھی مگر پورا نام ذہن سے نکل چکا ہے۔ شاید ملک کے ساتھ وہ ریاض ہی تھے۔

آپ سب کو یعقوب بھی یاد ہوں گے۔ لگتا تھا کہ شہر کے سارے لمبے لڑکے نیشنل کالج میں آ بسے ہیں۔ یعقوب اور ان کا پالتو کتا دونوں ساتھ کالج آتے' ایک کلاس روم میں جاتا تو دوسرا کلاس روم سے باہر اپنے مالک کی حفاظت میں چوکیداری کرتا۔

☆ اور کیا ہم باری بھائی کو بھول جائیں۔ یونین کے سیکریٹری مکمل طور پر لیڈر تھے اور بعد میں سیاست کی کمان بھی سنبھالی اور عہدوں پر بیٹھ کر خوب نام کمایا۔ پورا نام باری جیلانی تھا مگر سب کے باری بھائی تھے۔

رحیم اور فیروز چاولہ خود ہمارے کلاس فیلو تھے۔ جانے کیسے ان سے دوستی ہوگئی۔ رحیم جی جان سے میمن اور فیروز ہر طرف سے پکے دلی والے۔ رحیم سے ہم مرعوب تھے۔ لال رنگ کی گاڑی میں آتے' بھلا کسی اور کے پاس ان دنوں گاڑی کہاں ہوتی۔

ہم نے ایک دن ان کی شادی کی جھوٹی خبر بھی اڑادی۔ سب دو چار روپے کے تحفے لے کر ان کے گھر پہنچے مگر دراصل وہ اپریل فول بنانے کا قصہ نکلا۔

فیروز چاؤلہ کا دلی والا انداز تھا اور پرانے گانے گا کر وہ ہم پر رعب جمایا کرتے تھے' ساتھ ہمارے پڑھتے۔ دوستی بڑی کلاس کے لڑکوں سے رکھتے' کہتے وہ دلی کے جو ہیں۔

اشرف بہت جلد ہم سے بچھڑ گیا تھا۔ لمبا قد' بالوں سے بھرا سر' گلے میں کیمرا لٹکا' ہاتھ میں فائل۔ ایک دو کلاسیں لے کر مُردوں کی تصویریں اتارنے سول اسپتال دوڑ جاتے۔ سنا کہ خود بھی مُردوں میں شامل ہوگئے مگر آج تک ان کی کھینچی بے شمار تصاویر ہمیں ان کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ ہمیں ساجدہ بھی یاد ہیں جو مکرم بھائی کے بغیر ایک لمحہ بھی گزارنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ دھن کی پکی نے ان سے شادی کر کے دم لیا۔

صادقہ گول مٹول تھیں' ایک ایک جملہ خلوص میں بھیگا ملتا۔ عابدہ تو ایسی دوست بنیں کہ آج بھی ان کے بغیر زندگی ادھوری لگتی ہے۔ ہم ملتے ہیں تو ڈھیر ساری بے مقصد باتیں کرتے ہیں۔ ہم نے کتنے ہی لوگوں کے ساتھ دن کے چھ سات گھنٹے روزانہ گزارے۔ کتنے مرحوم

ہو گئے' کتنے ہی دنیا کے میلے میں گم ہو گئے مگر ذہن کے گوشے میں' دل کے کونے میں چھپے بیٹھے ہیں۔

ہم اکثر اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں۔ ہمارا ان تمام ساتھیوں سے جو رشتہ تھا اور جو رشتہ ہے اسے نام کیا دیں؟

ہم اکثر یہ سوچتے ہیں کہ ہم اب تک طالب علمی کے ان زمانوں کو دل میں چھپائے، ذہن میں سجائے کیوں بیٹھے ہیں کہ زمانہ تو قیامت کی چال چل چکا ہے۔ صدی بھی بدل گئی ہے مگر ہم اب تک نہیں بدلے' ان ہی یادوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

عجیب مرض ہے جس کی دوا ہے تنہائی

روزِ ازل سے آج تک دنیا کسی نہ کسی وبا کی زد میں رہی ہے۔ کبھی انسان نے اس پر سبقت لی اور کبھی وبا نے انسان کو پچھاڑ دیا۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ جب جب انسان نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، جب جب اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کے حکم سے روگردانی کی، اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اپنی اپنی امتوں کو سکھاتے رہے، بتاتے رہے، ڈراتے رہے لیکن ان امتوں نے اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھا، اور جانا کہ ساری طاقت ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے، اور پھر وہ خوار ہوئیں۔

مگر اسی اسلامی تاریخ میں ایک امت حضرت یونسؑ کی بھی تھی جس نے نافرمانیوں کے نتیجے میں آنے والے عذاب کو پہچان لیا تھا، اب انہوں نے اللہ سے رجوع کیا، توبہ کی، استغفار کی کثرت کی، اور وبا سے محفوظ رہے۔

آج کی دنیا بھی بے راہ روی کی دنیا ہے، اپنی حد پھلانگ چکی ہے، اپنے آپ کو مضبوط سمجھتی ہے۔ کسی نے جمہوریت کا سہارا لیا ہوا ہے، کسی نے آمریت کا۔ کسی نے بادشاہت کا اور کسی نے طاقت کا، ایٹم بم کا، مہلک ہتھیاروں کا، زورِ بازو کا، دولت کے انبار کا، ذہنی فتور کا۔ اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر رکھا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے تو شیطان کو طاقت بخشی ہوئی ہے۔ مگر اس سارے غرور اور ساری طاقتوں کے بیچ اس حقیقت کو وہ نظر انداز کر رہے ہیں کہ آخری طاقت اللہ ہے۔ اس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا، اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ قہار بھی ہے، جبار بھی ہے۔ وہ احسان کرنے والا ہے، وہ بدلہ دینے والا ہے۔ بس اس نے اپنی رحمت کے لیے عبادت اور توبہ کو ذریعہ بنا دیا ہے۔ وہ غفور ہے، وہ رحیم ہے۔ ایک بہت چھوٹا سا عمل ہے جو انسان کو دنیا کی بڑی سے بڑی آفت سے منٹوں میں بچا سکتا ہے۔ ایک سجدہ اور ایک توبہ۔ استغفار کی کثرت سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوسکتا؟

آج کل ایک وبا جسے ''کورونا'' کا نام دیا گیا ہے، اس نے دنیا کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جو کہتے تھے ہم بزدل تھوڑی ہیں جو ڈر جائیں گے، وہ جو کہتے تھے میں دلیر ہوں، زیر ہو گئے ہیں۔ وہ جو کہتے تھے خوف کیا ہوتا ہے؟ خوف زدہ ہیں۔ اور وہ جو اپنے اجداد کے قصے سناتے نہیں تھکتے تھے کہ انہوں نے تو ڈرنا اور شکست کھانا سیکھا ہی نہیں تھا، شکست کھا گئے۔

یہ وبا چین کے ایک شہر ووہان سے پھیلی، اسی چین کا صدر شی جن پنگ جو مذہبِ اسلام تو کیا ہر مذہب کا منکر ہے، اپنے ملک کی ایک مسجد میں چلا گیا۔ عبادت کرتے ہوئے مسلمانوں سے درخواست کی کہ تم اپنے رب سے دعا کرو کہ ہم اس مصیبت سے چھٹکارا پالیں۔

نیوزی لینڈ کی وزیراعظم نے گزشتہ سال مسجد میں فائرنگ کرنے والے کی نہ صرف مذمت کی تھی بلکہ اپنی نگرانی میں نماز جمعہ ادا کراتی رہی ہے، اس نے بھی مسلمانوں سے دعا کی درخواست کی ہے۔

ان ملکوں سے وبا نے بھاگنا شروع کردیا ہے۔ استغفار جاری رہا، اللہ پر یقینِ کامل رہا تو اس وبا سے تمام ملکوں کو نجات مل ہی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے، ان پر سختی نہیں کرتا، سختی سے نکالتا ہے۔

ہم پاکستانی بھی خوب قوم ہیں، ہر صورتِ حال سے نبٹ لیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے جینے اور خوش رہنے کے لیے لطیفے بھی تراش لیتے ہیں۔

موبائل نے معاشرے میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ہر بڑے اور بچے نے اس میں سے اپنی پسند کی دنیا سجالی ہے، مگر فیس بک ایک ایسا ذریعۂ اظہار ہے جس سے سب ایک طرح سے مستفید ہورہے ہیں۔

اس دور کی چند دلچسپ تحریریں، لطیفے، فقرے اور جملے ہیں جو موقع کی مناسبت سے یاد رہ جانے والے ہیں، ہم انہیں یکجا کر کے اس مضمون میں شامل کر رہے ہیں کہ یہ آنے والے سالوں میں تاریخ کا کام دیں گے۔ انہیں آپ ان ہی دنوں کے پس منظر میں پڑھیں:

- اگر بچوں کی اسی طرح اسکول سے چھٹیاں رہیں تو سائنس دانوں سے پہلے والدین نے ویکسین تیار کرلینی ہے۔

- کورونا وائرس وہ واحد بیماری ہے جس کے علاج کی غرض سے ہمارے حکمران بیرونِ ملک نہیں جا سکیں گے۔
- بخدمت جناب کورونا صاحب!

''مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ پاکستان آہی گئے ہیں تو کرپٹ سیاست دانوں، حرام خور بیوروکریٹس، بددیانت میرا جسم، میری مرضی والیوں اور دیگر ناسوروں کو اپنے ساتھ لے جانا، نوازش ہوگی۔''

- ماسک مہنگے ہونے سے ثابت ہوا کہ لازمی نہیں مہنگائی حکومت ہی کرے، بسم اللہ میڈیکل اسٹور نام رکھ کے حرام مال کمانے والے بھی بہت ہیں۔
- ڈینگی نے کہا: کورونا آنے سے ہماری عزت میں کمی آ گئی۔ اچھا میں اب چلتا ہوں، دعاؤں میں یاد رکھنا۔
- پاکستانی خواتین کی کورونا لاک ڈاؤن سے ڈرنے کی سب سے بڑی تین وجوہات ہیں:

1۔ کام والی ماسی نہیں آئے گی۔
2۔ بچے اور شوہر ہر وقت گھر پر رہیں گے۔
3۔ لان کے سوٹ کی شاپنگ کیسے ہوگی۔

- اٹلی نے کورونا کے علاج کے لیے پاکستان سے تین ڈاکٹر مانگ لیے ہیں: ڈاکٹر شیریں مزاری، ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان اور ڈاکٹر عامر لیاقت۔
- ڈینگی آیا...... پلیٹیں آئیں۔ حریم شاہ آئی...... آٹا، چینی، ٹماٹر بحران آیا۔ ماروی سرمد آئی...... خلیل الرحمن قمر آئے۔ اب تو کورونا بھی آ گیا۔ نہیں آئے تو وہ دو بھائی نہیں آئے جو دوائی لینے لندن گئے تھے۔
- شوہر کو بار بار ہاتھ دھوتا دیکھ کر بیوی نے اہم مشورہ دیا: بار بار خالی ہاتھ دھونے سے بہتر ہے ساتھ میں چند برتن بھی دھو دیا کرو۔

- پاکستان میں کورونا مریضوں کی تعداد 400 اور نفسیاتی مریضوں کی تعداد 22 کروڑ ہوگئی ہے۔
- بخدمت جناب کورونا وائرس! واپسی پر ''میرا جسم میری مرضی'' والی آنٹیوں کو ساتھ لے جانا، مہربانی ہوگی۔
- ہماری صفائی والی نے فون کر کے بتایا ہے کہ وہ اپنے گھر پر ہی رہ کر کام کرے گی۔ فون پر ہمیں بتادیا کرے گی کہ کیا کیا اور کیسے کیسے صاف کرنا ہے۔
- اسکول بند کرنے کے بجائے 15 دن اسکول کی گھنٹی نہ بجاؤ، کورونا کو کیا پتا اسکول بند ہے یا کھلا ہوا ہے۔ یہ نسخہ قائم علی شاہ کا ہے۔
- ''یہ تو شکر ہے کورونا وائرس حرام کھانے سے پھیلا ہے، اگر حرام کمانے سے پھیلتا تو ہمارا کیا ہوتا؟'' سیاست دانوں کی آپس کی گفتگو۔
- ہم نے ایسے مسلمان بھی دیکھے ہیں جو 20 روپے کا ماسک 200 روپے میں فروخت کرنے کے بعد خانۂ کعبہ میں نماز نہ ہونے پر پریشان ہیں۔
- ایک بے چاری لڑکی نے حکومت سے درخواست کی: جلدی سے یونیورسٹی کھولیں، امی گھر میں بہت کام کرا رہی ہیں۔
- پاکستان خصوصاً کراچی میں شاعروں کی زندگی عذاب میں ہے۔ فیس بک پر صبح شام مشاعروں میں شرکت کی اپنی تصویریں اب کیسے ڈالیں کہ مشاعرے بند ہیں۔ اب وہ خود گھر میں بند ہیں اور شاعری میں آزاد ہیں۔ کورونا پر اشعار کی بھرمار ہے۔

وہ کیا کہیں گی کورونا سے گر ہوئی ملاقات
کہ میرا جسم ہے مرضی مری، ملوں نہ ملوں

☆

اب نہیں کوئی بات خطرے کی
اب سبھی کو سبھی سے خطرہ ہے

☆

عجیب مرض ہے جس کی دوا ہے تنہائی
بقائے شہر ہے اب شہر کے اجڑنے میں

☆

یہ نہ ہو کہ قُرب ہی پھر مرگِ ربط بن جائے
وہ اب ملے تو ذرا اُس سے فاصلہ رکھنا

☆

ہمارے واسطے فرقت ہے جان لیوا نعیمؔ
تمام شہر کو ملنے کا خوف مارے گا

☆

قربتیں لاکھ خوب صورت ہوں
دوریوں میں بھی دل کشی ہے ابھی

☆

تنہا ہوئے تو خود سے ملاقات ہوگئی
جس کا گمان بھی نہ تھا وہ بات ہوگئی

☆

دل کو اپنے بھینچ لیا ہے تم نے
ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا ہے تم نے

☆

میں کہ دنیا مجھے زندان لگے تھی
چار دیواری سے تو سانس گھٹے گی

☆

دل تو پہلے بھی نہیں ملتے تھے
اب تو ہاتھ ملانے سے بھی گئے

☆

ہائے یہ ویرانیاں زُعم عبادت بھی گیا
بت کدہ خالی پڑا ہے، کعبہ خالی، ہائے ہائے

☆

یہ جو ملاتے پھرتے ہو تم ہر کسی سے ہاتھ
ایسا نہ ہو کہ دھونا پڑے زندگی سے ہاتھ

☆

ہے احتیاط یہی گھر میں قید ہونا ہے
کہ چہرہ چھونا نہیں اور ہاتھ دھونا ہے

☆

سماجی فاصلہ رکھنا ہے ملنے جلنے میں
اور اس وبا سے نمٹنا ہے جو کورونا ہے

☆

آخری راستہ ہے بچنے کا
آدمی آدمی سے دور رہے

☆

تم سے ہمارا واسطہ اتنا ہی رہ گیا ہے کیا
ہم نے سلام کرلیا تم نے جواب دے دیا

☆

دل کو چھونے کی سہولت ہے تو کیا غم ہے کہ ہمیں
تیرے ہاتھوں کو اگر ہاتھ لگائے نہ بنے

☆

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

☆

گھوم پھر کر نہ قتلِ عام کرے
جو جہاں ہے وہیں قیام کرے

☆

اک دوسرے کے دکھ میں برابر کا ہے شریک
انسان اب کہیں بھی اکیلا نہیں رہا

☆

کیسا موسم ہے بے یقینی کا
فاصلے ان دنوں شفاء ٹھہرے

☆

ابھی تو ترکِ محبت کی وبا پھیلی ہے
پھر محبت کا بھی انکار کیا جائے گا

☆

دور رہیے دعا کیجیے دور سے
اب سب ہی سے ملا کیجیے دور سے

☆

لو ہم خود کو نذرِ وبا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

☆

آؤ اب فاصلوں سے ملیں
قربتوں کو سزا چاہیے

☆

پھیلی ہے وبا قید رہو اپنے گھروں میں
بھاگو کہ سزا سے تو سزا اور بڑھے گی
بیمارئ دل یا ہو وبا اور بڑھے گی
رکھی نہ اگر دوری، وبا اور بڑھے گی

☆

ماسک پہنے ہوئے تھے دونوں نے
خاک اظہارِ مدّعا کرتے

☆

کر گیا ایسا مرے شہر پہ جادو کوئی
اب نہ خوشبو ہے، ستارہ ہے، نہ جگنو کوئی

☆

ایک مدّت سے آرزو تھی فرصت کی
ملی تو اس شرط پہ کہ کسی سے نہ ملو

☆

زندگی کیا ہے اب کھلونا ہے
موت کا سمجھو اک بچھونا ہے

☆

ڈھل گیا ہے سکوت میں سب کچھ
خامشی بھی نہیں رہی باقی

☆

اس پہ ''کورونا'' سر پہ آ ٹھہرا
رات دن کا ہی رونا دھونا ہے

☆

ہر طرف ہے سناٹا زندگی ہے سہمی سی
کچھ ہی دیر پہلے تھی کیسی گہما گہمی سی

☆

نہ جانے خلقِ خدا کون سے عذاب میں ہے
ہوائیں چیخ پڑیں، التجا کے لہجے میں

☆

خلقت رہائی پائے گی لیکن سزا کے بعد
زندہ رہے جو لوگ ملیں گے وبا کے بعد

☆

یہ تو وہ اشعار ہیں جو شاعروں سے قیدِ تنہائی نے کہلائے ہیں، لیکن لوگوں نے اپنے طور پر اس موقع پر لطیفے بھی بنا لیے ہیں۔

- جو کبھی لکھا تھا ٹرک کی لال بتی کے نیچے۔ آج انسانوں نے اپنے پیچھے لکھ لیا ہے ''ذرا فاصلہ رکھنا''
- پاکستانیوں کی قوتِ مدافعت سے متاثر ہو کر امریکا، برطانیہ، فرانس، اٹلی اور اسپین نے بھی عوام سے ملاوٹ شدہ خوراک کھانے کی اپیل کی ہے۔

- بیگم نے شوہر سے روٹھتے ہوئے کہا:
  ''جائیے میں آپ سے نہیں بولتی، آپ نے میرے لیے کورونا کے موقع پر ایک بھی سوٹ نہیں بنوایا۔''
- ''یا اللہ لاک ڈاؤن عید کے تیسرے دن تک جاری رہے تاکہ بیگم کے جوڑے نہ بن پائیں''۔ایک شوہر کی دعا
- ایک ملازم نے اپنے افسر کے نام درخواست لکھی:

"Dear Sir,
I beg to state that i am suffering from leave.
please grant me two days work......"
Yours Sincerely

حقیقت ہو، شاعری ہو، مزاح ہو یا لطیفے تراشے جائیں، بہرحال آج دنیا جس تکلیف سے گزر رہی ہے اس کی مثال تاریخ میں شاید ہی موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ ساری انسانیت سے ناراض ہے اور ہم اس بات سے غافل ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے اعمال کا بدلہ ہے۔

صدقہ، خیرات، توبہ استغفار، سجدے، بے شمار سجدے ہی ہمیں اس ناگہانی مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں۔

مسلم تو مسلم، غیر مسلموں نے بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہم نے زمین کی ساری کوشش کر لی، اب آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

ٹیکساس کی رائس یونیورسٹی کے اسکالر ڈاکٹر کریگ کونسڈائن نے اپنے ٹوئٹ میں اعتراف کیا ہے کہ اس وبا سے بچاؤ کا حل رسول کریم ﷺ نے پہلے ہی بتایا ہوا ہے:

''اگر تمہارے علاقے میں کوئی وبا پھوٹ پڑے تو تم اسی علاقے تک محدود ہو جاؤ، نہ اپنے علاقے سے باہر جاؤ اور نہ باہر سے آنے والوں کو آنے دو۔''

☆☆☆

(ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ میں شائع ہوا)

دوسرا حصّہ

ڈرامے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر

کردار: 1۔ نجمہ
2۔شاہدہ (طالبات)
3۔منکر
4۔نکیر (دوفرشتے)

(صبح امتحان ہے اور دو طالبات رات کے وقت مطالعہ کر رہی ہیں۔صفحات الٹنے کی آوازیں آتی ہیں۔ دونوں کی آواز میں نیند، جھنجلاہٹ، گھبراہٹ، امتحان سے بیزاری اور خوف نمایاں ہے۔وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہیں)۔

نجمہ: (جلدی جلدی یاد کرنے کے سے انداز میں) کسی بھی شے کی قیمت کا تعین وہاں ہوتا ہے جہاں...... جہاں طلب اور رسد ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوجاتی ہیں...... ہم آہنگ ہوجاتی ہیں۔اور......اور......(جمائی لے کر) اللہ شاہدہ تم کیا پڑھ رہی ہو، بتاؤ نا۔

شاہدہ: (تیزی سے دہراتے ہوئے) آبادی تیز رفتاری سے بڑھتی ہے بہ نسبت خوراک کے......اور خوراک......خوراک......

نجمہ: ارے تم ابھی تک یہی پڑھ رہی ہو! مرکزی بینک کے فرائض یاد کرلو، مس نے کہا تھا یہ بہت امپورٹنٹ ہے اس سال۔

شاہدہ: اوہ۔ہاں۔ مجھے یاد ہے......سنو۔(جلدی جلدی) مرکزی بینک، مرکزی بینک بینکوں کا باپ......اُف توبہ......بینکوں کا بینک ہوتا ہے۔نوٹ جاری کرتا ہے۔افراطِ زر کنٹرول کرتا ہے......کرتا ہے......(لہجہ بدل کر) بھئی نجمہ اب بہت نیند آرہی ہے۔

نجمہ: (بیزاری سے) صبح امتحان ہے، اور لگتا ہے ساری زندگی کی نیند صرف آج ہی آکر رہے گی، کیا کریں ہم لوگ۔

شاہدہ: بھئی اب مجھ سے تو مزید پڑھنا ممکن نہیں......آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔

نجمہ: اُف، رات کے دو بج رہے ہیں۔ (گھبراہٹ سے) اور مجھے ڈیوڈ ریکارڈو کا نظریۂ لگان تو ابھی تک یاد نہیں ہوا۔ تم نے یاد کیا ہو تو تھوڑا سا مجھے بتا دو۔

شاہدہ: اللہ نجمہ......بس بھی کرو، اب صبح......میں تو چلی اپنے گھر......ذرا گلی تک چھوڑ دو۔ کتنی بھیانک رات ہے، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔

نجمہ: اچھا......چلو...... (جانے کی آواز)

(اور پھر نجمہ کے قدموں کی آواز......)

نجمہ: (نجمہ اپنے آپ سے) بھائی ریکارڈو صاحب مجھے تو اب آپ معاف کریں۔ آپ کے نظریے کو رات کے دو بجے انتہائی نیند کے عالم میں یاد کرنا اب میرے بس میں نہیں۔ برا مت مانیے گا۔ میں تو چلی اپنے بستر پر......خدا حافظ۔

(پھر خراٹے کی آواز......اور پھر آہٹ......)

منکر: بھائی نکیر دیکھو یہ مُردہ کون ہے؟

نکیر: زنانہ مُردہ ہے بھائی منکر۔ اللہ رحم کرے۔ مجھے عورتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ کان کھا جاتی ہیں یہ۔

منکر: ٹھیک کہتے ہو بھائی نکیر۔ کیا کریں ہمارا کام ہی ایسا ہے......خیر چلو شروع کرو۔

نکیر: (کڑک کر) قم باذن اللہ۔

منکر: خدا کے حکم سے اٹھ جا۔

(لڑکی کے گھبرا کر اٹھ جانے کی آواز......)

نجمہ: جی......جی......

منکر: (جلدی سے) تیرا رب؟

نکیر: تیرا رسول؟ (بہت جلدی جلدی تابڑ توڑ سوالات)

منکر: تیری کتاب؟

نکیر: تیرا ایمان؟

نجمہ: (گھبرا کر) ٹھہریے ٹھہریے...... ذرا آہستہ بولیے...... کیا آپ لوگ پولیس کانسٹیبل ہیں؟

نکیر: لاحول ولاقوۃ۔

منکر: بھائی منکر اس گناہ گار کو بتاؤ کہ ہم کون ہیں؟

نکیر: سن...... ہم خدا کے فرشتے ہیں۔ یہ بھائی منکر ہیں اور میں نکیر ہوں۔ منکر نکیر...... سمجھی؟ اور ہم تجھ سے تیرے اعمال کا حساب لینے آئے ہیں...... ہاں تیرا رب......؟

منکر: (جلدی سے) تیرا رسول؟

نجمہ: اُف...... خدا کے لیے دم لینے دیجیے...... آپ لوگ تو اس طرح بول رہے ہیں جس طرح ہمارے لیکچررز رٹا ہوا سبق دہراتے ہیں۔

منکر: (دوبارہ) لاحول ولاقوۃ۔ لڑکی تُو ہمارا مذاق اڑا رہی ہے۔

نجمہ: نہیں نہیں...... آپ شوق سے سوال کیجیے۔ لیکن خیال رہے کہ سوال میرے سبجیکٹ سے متعلق ہوں۔

منکر: سبجیکٹ کے متعلق...... یہ کیا بکواس ہے؟

نجمہ: جنابِ والا میرا سبجیکٹ معاشیات ہے اور میں اسی کے متعلق جواب دے سکتی ہوں۔ جی ہاں، اور دیکھیے سوال کم از کم گیارہ ہوں جن میں سے پانچ کے جواب دوں گی۔

منکر: بکومت۔ ہم خدا کے بتائے ہوئے سوال پوچھنے آئے ہیں۔ ہاں بھائی نکیر...... بسم اللہ۔

نکیر: (گلا صاف کر کے) تمہارا رب...... تمہارا رسول...... تمہارا...... (جلدی جلدی)

نجمہ: (بات کاٹ کر) معاف کیجیے گا آپ پھر بھول گئے۔ یہ تو آپ اسلامیات کا پرچہ حل کرا رہے ہیں۔ مجھ سے میرے مضمون کے بارے میں پوچھیے۔ تقسیم دولت، پیدائشِ دولت...... لگان...... سود...... میں ہر اُس سوال کا جواب دوں گی جو معاشی دنیا کے بارے میں ہوگا۔

منکر: بھائی نکیر یہ مُردہ تو بڑا ضدی ہے۔

نکیر: بات تو ٹھیک ہے۔ خیر میں اس کی خبر لیتا ہو...... (گلا صاف کر کے) اچھا اس فرد کا

نام بتاؤ جو تمہاری دنیا کا بانی ہے۔

نجمہ: (جلدی سے) آدم اسمتھ۔

منکر: آدم اسمتھ؟ لاحول ولاقوۃ۔ آدم علیہ السلام کو آدم اسمتھ بنا دیا۔ (نکیر سے) بھائی نکیر...... لکھو ایک سوال کا جواب غلط دیا گیا۔

نجمہ: یہ زیادتی ہے جنابِ والا۔ آپ ساری کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ہمارے تمام لیکچررز سے گواہی لیجیے۔

منکر: تم بھی جہنمی ہو...... اور تمہارے وہ لیکچررز بھی، جو آدم علیہ السلام کو آدم اسمتھ بتاتے ہیں۔ ہاں بھائی نکیر آگے چلو۔

نکیر: تمہاری پہلی کتاب؟

نجمہ: Wealth of Nations

منکر: استغفراللہ۔ کفر...... الحاد...... لکھو بھائی نکیر۔

نجمہ: میں صحیح کہہ رہی ہوں جنابِ والا۔ ہماری پہلی کتاب کا یہی نام ہے۔ اسے آدم اسمتھ نے لکھا تھا۔

منکر: جھوٹ مت بولو...... آدم علیہ السلام نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔

نجمہ: اگر نہیں لکھی تھی تو اس کی ذمہ داری شاہدہ پر ہے۔ یہ جواب امتحان میں میں نے اسی کی کاپی سے نقل کیا تھا۔

منکر: اچھا تو تم نقل بھی کرتی ہو......؟

نجمہ: سبھی کرتے ہیں جناب، اس میں حیرت کی کیا بات ہے (رازداری سے)، اگر آپ میری شکایت نہ کریں تو ایک بات اور بتاؤں۔

منکر: کیا......؟

نجمہ: سنا ہے ہمارے تمام لیکچررز نے بھی اسی فن کے ذریعے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔

منکر: لاحول ولاقوۃ۔ خیر اپنے لیکچررز کو بھی یہاں آنے دو۔ ان کی بھی خبر لی جائے گی۔ (نکیر سے) بھائی نکیر...... یہ مُردہ گمراہ بھی ہے...... ذرا جلدی جلدی اس کا حساب کتاب کرو۔

نکیر: سوال نمبر تین۔تمہارا ایمان کیا ہے؟

نجمہ: دولت کی منصفانہ تقسیم......Equal Distribution of Wealth

منکر: یہ کیا بلا ہے؟

نجمہ: کیا آپ نظریۂ تقسیمِ دولت سے ناواقف ہیں......؟ ریکارڈو کا کہنا ہے......

منکر: (بات کاٹ کر) ریکارڈو......؟ یہ کون سا نبی تھا بھائی نکیر؟

نکیر: (کاغذ الٹ پلٹ کر) اس نام کا تو کوئی نبی خدا نے نہیں بھیجا۔البتہ پچھلی صدی میں ریکارڈو نامی ایک انگریز ضرور گزرا ہے جو نسلاً یہودی تھا۔

منکر: (غصے سے) اچھا......تو تم یہودیوں کی تعلیمات پر ایمان رکھتی ہو؟

نجمہ: ہرگز نہیں جناب والا......ریکارڈو تو ایک معاشی مفکر تھا۔

منکر: بکومت......ہاں بھائی نکیر لکھو......مُردے نے تیسرے سوال کا جواب بھی غلط دیا......مزید یہ کہ وہ ریکارڈو نامی ایک یہودی کا پیرو ہے۔قیاس کیا جاتا ہے کہ ریکارڈو اُن بے شمار گناہ گاروں میں سے ایک تھا جنھوں نے گذشتہ صدی میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا......

(لکھوانے کے سے انداز میں)

نجمہ: عجیب مصیبت ہے۔آپ لوگ تو اخبار والوں سے بھی زیادہ غلط بیانی کرتے ہیں۔ جنابِ والا......ریکارڈو......

منکر: (کاٹ کر) خاموش رہو۔ہاں بھائی نکیر آگے چلو......

نجمہ: یہ سراسر ظلم ہے......جمہوریت کے آداب کے خلاف ہے۔میں واک آؤٹ کر جاؤں گی۔

منکر: (ہنس کر) محترمہ......نہ یہ امتحان ہال ہے، نہ اسمبلی کا اجلاس جو آپ واک آؤٹ کر جائیں گی۔(ڈانٹ کر) یہاں سے آپ خدا کی مرضی کے بغیر واک آؤٹ نہیں کر سکتیں۔

نجمہ: تو پھر خدا کے نام پر میرے ساتھ انصاف کیجیے۔مجھ سے غیر متعلق سوال نہ پوچھیے۔ میں آپ کو ریکارڈو کے نظریات کے بارے میں بتا سکتی ہوں۔مجھ سے مالتھس کے نظریۂ آبادی پر بحث کیجیے۔

منکر: مالتھس...... یہ کون بزرگوار ہیں بھائی نکیر......؟

نکیر: (کاغذات الٹ پلٹ کر) مالتھس...... مالتھس بھی ریکارڈو کی قبیل کا آدمی ہے بھائی منکر۔ اس نے آبادی کا ایک نظریہ پیش کیا تھا اور خدا کے بندوں کی آمد و رفت پر پابندی لگانے کے لیے آواز اٹھائی تھی۔

منکر: اچھا......تو گویا یہ حضرت خدا کی قدرت کے منکر تھے۔

نجمہ: ہرگز نہیں۔ مالتھس نے خدا کے بندوں کی بھلائی کے لیے سوچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا میں اس کے نظریات ہر ملک میں مقبول ہو رہے ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی اس نظریے کی عملی شکل ہے۔

منکر: خاندانی منصوبہ بندی......؟ یہ کس نئی عبادت کا نام ہے بھائی نکیر؟

نکیر: نہیں بھائی منکر! کان اِدھر لاؤ۔ میں تمہیں چپکے سے خاندانی منصوبہ بندی کا مطلب سمجھاؤں۔ (آپس میں سرگوشی کی آواز)

منکر: (سننے کے بعد) لاحول ولاقوۃ...... بلکہ استغفراللہ......لڑکی......اگر بھائی نکیر کی معلومات درست ہیں تو تم سب جہنمی ہو۔ خدا کی پناہ تم لوگ خدا کی قدرت میں روڑے اٹکانے لگے ہو۔

نجمہ: افوہ......آپ لوگ بہت ہی دقیانوسی قسم کے فرشتے ہیں...... پروردگار......کیا اس ماڈرن دور میں تُو ماڈرن فرشتے نہیں بھیج سکتا۔

منکر نکیر: (ایک زبان ہو کر) پروردگار......اس گناہ گار بندے کی دعا قبول نہ فرمانا۔

منکر: (پھر آپس میں) بھائی نکیر یہ لڑکی تو ہماری روزی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔

نجمہ: دیکھیے آپ لوگ خاندانی منصوبہ بندی کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ یہ تو خالص معاشی مسئلہ ہے۔

نکیر: بکومت۔ ہمارے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ تمہارے جیسے مُردے اگر روز قبر میں آنے لگیں تو اوور ٹائم کرتے کرتے ہمارا دم نکل جائے۔

منکر: ہاں بھائی نکیر لکھو......مُردہ ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ

اسے زندگی دینے پر قدرت حاصل ہے۔ قیاس ہے کہ کل یہ لوگ موت پر بھی قادر آنے کی کوشش کریں گے، اس لیے ضروری ہے کہ ایسے تمام لوگوں کو حسبِ اعمال سزا دی جائے۔

نجمہ: رحم۔۔۔۔۔۔رحم کیجیے جنابِ والا۔۔۔۔۔۔ یہ نظریہ میرا تو نہیں۔ میں تو صرف ایک طالبہ ہوں۔

منکر: اور تمہیں یہ بھی پتا نہیں کہ غلط باتوں پر اعتقاد رکھنا گناہ ہے۔ آگے چلو بھائی نکیر۔

نکیر: سوال نمبر چار تحریری ہے۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھو۔

میں پڑھتا ہوں سنو۔۔۔۔۔۔

الف: کائنات کی تخلیق کا مقصد بتاؤ۔

ب: اسلام میں کتنی شادیوں کی اجازت ہے۔

ج: حیات بعد الموت کسے کہتے ہیں۔

نوٹ: ہر سوال کے نمبر مساوی ہیں۔ خوشخطی کے لیے 5 نمبر علیحدہ ہیں۔

نجمہ: یہ سوال بھی غیر متعلق ہیں لیکن ریڈیو کے کوئز پروگرام میں شرکت کر کے میری جنرل نالج اچھی ہوگئی ہے۔ میں جواب دینے کی کوشش کرتی ہوں۔

وقفہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نجمہ: میں نے جواب تحریر کر لیے ہیں۔

منکر: (پڑھ کر سناؤ) بسم اللہ۔

نجمہ: کائنات کی تخلیق کا مقصد بظاہر تو یہ ہے کہ یہ خدا کی مرضی تھی، لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آسمان پر Unemployment تھی لہٰذا خداوند کو دنیا اس لیے بنانا پڑی کہ آپ جیسے فرشتوں کو روزگار مہیا ہو سکے۔

منکر: ہوں۔۔۔۔۔۔اب یہ بتاؤ کہ اسلام میں کُل کتنی شادیوں کی اجازت ہے؟

نجمہ: کچھ عرصہ پہلے تک تو چار کی اجازت تھی مگر اب ایک سے زیادہ شادی کرنا جرم ہے۔۔۔۔۔۔

منکر: کیا مطلب؟

نجمہ: حوالے کے لیے دیکھیے خاندانی منصوبہ بندی اسکیم۔

منکر: لاحول ولاقوۃ۔ اچھا...... ہاں...... ذاتی طور پر تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟

نجمہ: جی...... بہت برا خیال ہے۔ میری رائے میں تو چار شادیوں کے بجائے چار میں سے صرف ایک فرد کو شادی کرنا چاہیے۔

منکر: تم لوگ ناشکرے ہو...... اگر فرشتوں کو شادی کی اجازت مل جائے......تو...... اوہ...... یہ میں کیا کہہ گیا...... استغفر اللہ۔ خیر آگے چلو۔ حیات بعد الموت کے معنی بتاؤ۔

نجمہ: یعنی مرنے کے بعد کا عالم۔ اس موقع پر مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے، اگر اجازت ہو تو عرض کروں؟

منکر: اجازت ہے۔

نجمہ: عرض کیا ہے:

بتاؤں تم کو میں مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

منکر: اور عذابِ قبر؟

نجمہ: وہ تو میں اتنی دیر سے بھگت رہی ہوں۔

منکر: خیر...... یہ جواب بھی ناقابلِ قبول ہے۔ لاؤ کاغذ اِدھر دو...... بھائی نکیر...... اسے صرف خوش خطی کے نمبر مل سکتے ہیں...... اب تم آخری سوال کرو اور دوسری جگہ چلو۔ ابھی بہت سے مُردوں کا انٹرویو باقی ہے۔

نکیر: علم کے فوائد کیا ہیں، مثالیں دے کر واضح کرو۔

نجمہ: یہ بڑا پیچیدہ سوال ہے۔ اس کے جواب کے لیے تفصیل کی ضرورت ہے۔

منکر: ہم سن رہے ہیں، بیان کرو۔

نجمہ: علم کے بے شمار فوائد ہیں۔ لڑکیوں کو اس بہانے گھر کے کام کاج اور کھانے پکانے سے نجات مل جاتی ہے اور والدین کو شادی بیاہ اور جہیز کی فکر نہیں رہتی۔ کیونکہ پڑھی لکھی لڑکیوں سے شادی کرنے سے لوگ بہت ڈرتے ہیں۔

منکر: وہ کیوں؟

نجمہ: اس لیے کہ شوہر پڑھی لکھی بیوی کے میک اپ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔

منکر: ہوں۔آ گے چلو۔

نجمہ: علم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ لڑ کے لڑکیاں تمام دن کالجوں میں رہتے ہیں اور گھر میں امن رہتا ہے،لیکن علم کا سب سے زیادہ فائدہ صرف ایک طبقے کو پہنچتا ہے۔

منکر: کسے؟

نجمہ: پڑھانے والوں کو...... اس طبقے کے لوگ بہت باتونی ہوتے ہیں،انہیں بولنے کا مرض ہوتا ہے۔اگر تعلیم عام نہ ہوتو یہ جھکی کہلائیں۔مگر اب یہ لیکچرار کہلاتے ہیں۔ بک بک بھی کرتے ہیں اور تنخواہ بھی پاتے ہیں۔

منکر: یہ بات میری بھی سمجھ میں آتی ہے۔تمہیں اور کچھ کہنا ہے؟

نجمہ: جی ہاں۔علم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان میں سوچنے سمجھنے کی قوت بڑھ جاتی ہے۔مثال کے طور پر میں ایک واقعہ سنانا چاہتی ہوں،اجازت ہے؟

منکر: کہو۔

لڑکی: ایک تعلیم یافتہ شخص ایک جاہل کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔میز پر صرف ایک انڈا تھا۔ تعلیم یافتہ شخص نے جاہل سے کہا میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ دو انڈے ہیں۔جاہل نے وضاحت چاہی تو تعلیم یافتہ شخص نے کہا،دیکھو ایک اس انڈے کی ظاہری شکل اور دوسرا اس کا افادہ۔اس طرح یہ دو چیزیں ہیں۔یہ سن کر جاہل نے انڈا منہ میں رکھ لیا اور بولا: تو پھر انڈا میں کھائے لیتا ہوں،افادہ تم کھا لینا۔

منکر: خوب......ہمیں یہ جواب پسند آیا۔

نجمہ: شکریہ۔اسی طرح آپ لوگ فرشتوں کی مثال لے لیجیے۔شیطان خدا کا سب سے عزیز فرشتہ تھا۔چونکہ عالم تھا اس لیے اُس نے انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور شیطان بنا دیا گیا۔

منکر: سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ اب تم سمجھداری کی باتیں کر رہی ہو۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہارے اعمال کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور تمہیں جہنم بھیجنے پر مجبور ہیں۔

نجمہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جنابِ والا۔ میں نے تو زندگی میں کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔

منکر: یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ بھائی منکر تم نے مُردے کے بیانات لکھ لیے؟

نکیر: لکھ لیے بھائی منکر۔

منکر: اب یہ رپورٹ خداوند تعالیٰ کو روانہ کر دو۔ لکھو......

رب العزت...... بعد حمد و ثنا...... مُردہ نمبر 11,99,900 کی رپورٹ بابت اعمال ارسالِ خدمت ہے۔ مُردے کے بیان پر میرے اسسٹنٹ نکیر کے دستخط بطور گواہ موجود ہیں۔ ہم دونوں کی ذاتی رائے یہ ہے کہ مُردہ سخت گمراہ کن زندگی گذارتا ہے، لہٰذا سخت سزا کا مستحق ہے۔ مزید برآں مُردے کو گمراہ کرنے میں جن لوگوں کا ہاتھ ہے اُن کے لیے بھی حسب اعمال سزا کی سفارش کی جاتی ہے۔ ان میں سے آدم اسمتھ، ریکارڈو، اور مالتھس پہلے ہی وفات پا چکے ہیں اور ان کے پرانے اعمال نامے برائے حوالہ منسلک ہیں۔ بقیہ افراد جنہیں مُردہ لیکچرارز کا نام دیتا ہے خاص طور پر یحییٰ سلام اللہ اور نوشابہ صدیقی، ان کی آمد کا انتظار کیا جائے کیونکہ اصل میں یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے مُردے کو گمراہ کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا ہے۔

(ٹھہر کر)۔

نوٹ: مُردہ ایک لڑکی ہے، اس لیے اس نے باتوں میں زیادہ وقت صرف کر دیا ہے اور ہمیں دو گھنٹہ اوور ٹائم کرنا پڑا جس کے لیے ہم معاوضے کے حق دار ہیں۔

نجمہ: (بیزاری سے) اور آخر میں میری طرف سے یہ بھی لکھ دیجیے۔

"پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا"

منکر: تمہیں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اب تم خدا کے حکم سے آرام کرو اور عذابِ قبر کا انتظار کرو۔

نجمہ: رحم کیجیے۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔

منکرنکیر: (ایک ساتھ) خاموش۔

(قدموں کی آہٹ...... دونوں چلے جاتے ہیں)

نجمہ: اف...... اف...... (گھنٹے کی آواز سنائی دیتی ہے...... تین بار بولتا ہے......)

اوہ ابھی تین بجے ہیں...... مگر...... مگر...... وہ فرشتے...... اوہ تو یہ سب خواب تھا...... میں صرف ایک گھنٹہ سوئی ہوں...... میں نے خواب دیکھا...... سوچے اگر یہ حقیقت ہوتی...... تو کیا ہوتا...... سچ ہے ہماری تو وہ حالت ہے کہ......

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

☆☆☆

موقعے کا شعر

اسٹیج پر سامنے سلمیٰ اور شاہدہ کتابوں کا اپنا انبار لگائے پڑھنے میں منہمک ہیں، ان سے تھوڑے فاصلے پر چچا جان ہیں، پلنگ پر پڑے حقہ گڑ گڑا رہے ہیں۔

سلمیٰ، شاہدہ سے: بھئی یہ چچا جان تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ نہ پڑھنے دیتے ہیں، نہ آرام کرنے دیتے ہیں، اس سال تو ہمارا پاس ہونا...... بس اللہ ہی حافظ ہے۔

شاہدہ: ارے آہستہ بولو بھئی، اگر انہوں نے سن لیا تو ابھی انہیں موقع کے شعر یاد آنے لگیں گے۔

(اتنے میں چچا جان اٹھ کر ان کے قریب آ گئے)

سلمیٰ: لو، وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔

شاہدہ: (آنکھیں بند کر کے) میں تو سو رہی ہوں، اب تم جانو۔

چچا جان: اچھا تو باتیں ہو رہی ہیں۔

سلمیٰ: نہیں چچا جان! ہم لوگ تو سبق دہرا رہے تھے۔

چچا جان: میں سب سمجھتا ہوں، پڑھائی کا تو بس بہانہ ہے ورنہ تم لوگوں کا تو یہ عالم ہے کہ بقول شاعر کٹی رات حرف و حکایت میں۔

سلمیٰ: آپ بلا وجہ شک کر رہے ہیں چچا جان! ہم لوگ واقعی سنجیدگی سے پڑھ رہے ہیں۔

چچا جان: اچھا ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ چلو دہراؤ کیا یاد کیا ہے تم نے؟

سلمیٰ: جی ہاں سن لیجیے۔ ''معاشیات اس انسانی جدوجہد کے مطالعہ کا نام ہے جو محدود وسائل اور لامحدود احتیاجات میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے کی جائے۔''

چچا جان: لاحول ولا قوۃ۔ بس یہی لکھو گی امتحان میں کیا؟

سلمیٰ: جی ہاں چچا جان! بالکل صحیح جواب ہے یہ۔

چچا جان: خاک صحیح ہے۔ خدا کی بندیو! ہزار بار تمہیں سمجھایا ہے کہ عبارت میں زور پیدا کرنے کے لیے موقع کا شعر لکھنا بہت ضروری ہے۔

سلمیٰ: موقع کا شعر؟ مگر چچا جان! ہم لوگ تو معاشیات کے پرچے کی تیاری کر رہے ہیں۔

چچا جان: تو کیا ہوا۔ موقع کا شعر کہاں نہیں جڑ سکتا۔ پیدائش سے لے کر وفات تک زندگی میں جتنے بھی موقعے آتے ہیں ان کے لیے موزوں اشعار موجود ہیں، اور پھر وہ عبارت ہی کیا جس میں موقع نکال کر اشعار نہ لکھے جائیں! شعر کے بغیر عبارت ایسی ہی ہے جیسے زیور کے بغیر عورت۔

سلمیٰ: مگر چچا جان! آج کل جو عبارت لکھی جاتی ہے وہ اس زیور سے آراستہ نہیں کی جاتی، اور خاص طور سے معاشیات میں تو ہرگز بھی نہیں۔

چچا جان: اسی کا تو رونا ہے۔ عزیز من! سچ تو یہ ہے کہ عبارت آرائی ہمارے زمانے ہی تک تھی، اب ختم ہوگئی ہے۔ ہائے کیا عبارت ہوا کرتی تھی۔ کیسے کیسے موقعے کے شعر نکالتے تھے اربابِ کمال۔

شاہدہ: تو پھر اپنے زمانے کی کوئی عبارت سنایئے تاکہ ہم اس کی رہبری میں لکھنا سیکھیں۔

چچا جان: ہاں ہاں سنو۔ کہتے ہیں (ڈرامائی انداز میں) او مغرور تو ڑ زنجیر میں جکڑا ہوا ہے پھر بھی اس قدر اکڑا ہوا ہے۔ سر سے غرور مسندِ مخمل نہیں گیا۔ رسی تمام جل گئی اور بل نہیں گیا۔ دیکھا تم لوگوں نے، اسے کہتے ہیں عبارت اور عبارت میں موقعے کے شعر کا استعمال۔

شاہدہ: مگر چچا جان! آپ تو ڈرامہ سنانے لگے۔ ہمارا مضمون اس سے مختلف ہے۔

چچا جان: اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا عزیزی! بات صرف اچھی عبارت کی ہے۔ میری رائے میں تمہیں معاشیات کی تعریف اس طرح لکھنی چاہیے کہ معاشیات اس انسانی جدوجہد کے مطالعے کا نام ہے جو بقولِ شاعر ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

سلمیٰ: یہ تو ٹھیک ہے چچا جان! مگر معاشیات ایک سائنسی مضمون ہے، اس میں شعر کی کیا گنجائش؟

چچا جان: بڑی نا سمجھ ہو۔ ارے شعر کی گنجائش کہاں نہیں ہے؟ میرا بس چلے تو میں تمہاری پوری کتاب منظوم کردوں۔

شاہدہ: یا اللہ۔ اگر ایسا ہوتا چچا جان تو ہماری زندگی ٹھکانے لگ چکی ہوتی۔

چچا جان: کیا مطلب؟ گویا موقعے کا شعر نہ ہوا عذاب ہوگیا۔ موقعے پر شعر سوجھ جائے تو ایسا سکون ملتا ہے جیسے کوئی بچھڑا ہوا دوست مل گیا ہو۔ خیر چھوڑو اسے۔ تم لوگ ایسا کرو کہ ہر سوال کے لیے دو چار موقعے کے شعر یاد کرلو۔ بڑی مدد ملتی ہے عبارت لکھنے میں۔ سمجھیں۔

سلمٰی: اچھا اچھا شعر بھی یاد کرلیں گے مگر اب ہمیں ذرا پڑھنے دیں خدارا۔

چچا جان: کیا کہا، گویا ہم آپ کا وقت خراب کررہے ہیں۔ سمع خراشی فرما رہے ہیں۔ خوب صاحب، یہ تو وہی بات ہوئی بقول شاعر ؎

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

سلمٰی: یہ بات نہیں ہے چچا جان! امتحان سر پر ہے اور ہمیں محنت کرنا ہے۔

چچا جان: تو عزیز من! تمہیں محنت کرنے سے کس نے روکا ہے۔

محنت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

سلمٰی: مگر آپ تو شعر پر شعر سنائے جارہے ہیں، ہمیں مہلت تو دیجیے محنت کرنے کی۔

شاہدہ: ہاں چچا جان! اب رات زیادہ ہوگئی ہے، آپ جا کر آرام کریں۔

چچا جان: نہیں، ہرگز نہیں۔ میں تمہارا چچا ہوں۔ جانتا ہوں تم لوگوں کو۔ میں گیا آرام کرنے اور تم لوگوں کی باتیں ہوئیں شروع۔

سلمٰی: عجیب مشکل ہے۔ باتیں ہم کررہے ہیں یا آپ؟ چچا جان پلیز سمجھیں نا۔

چچا جان: اچھا تو گویا یہ بدلہ دیا جارہا ہے ہمارے ایثار کا۔ ہم ہیں کہ آپ کی خاطر اپنی نیند قربان کررہے ہیں اور آپ کو شکوہ ہے کہ ہم باتیں بنارہے ہیں۔ بقول شاعر ؎

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

سلمیٰ: اوہ، پھر موقعے کا شعر۔ چچا جان خدا کے لیے ہم پر رحم کھائیے۔

چچا جان: حد ہے بدذوقی کی۔ ایسا موقعے کا شعر سن کر بھی منہ سے داد کا کلمہ نہ نکلا۔ فرماتی ہیں خدا کے لیے ہم پر رحم کریں۔ لاحول ولاقوۃ۔ تمہارا نصابِ تعلیم ہے ہی سرے سے غلط۔

ایسے میں لڑکیوں کی سہیلی رضیہ کتابیں لیے داخل ہوتی ہے۔

سلمیٰ: آؤ آؤ رضیہ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔

(چچا جان ناگواری سے رضیہ کو سر تا پا گھورتے ہیں)

چچا جان: آپ کی تعریف؟

سلمیٰ: یہ رضیہ ہے چچا جان! میری کلاس فیلو۔ ساتھ میں پڑھنے آئی ہے۔

چچا جان: پڑھنے آئی ہے، خوب گویا غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے۔

رضیہ: (گھبرا کر) جی؟؟

چچا جان: برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے محترمہ! میرے لیے ان دو کوڑھ مغزوں کو پڑھانا ہی مشکل ہے کہ آپ بھی تشریف لے آئیں۔ گویا یک نہ شد سہ شد۔

رضیہ: تو کیا آپ پڑھاتے ہیں ان لوگوں کو؟

چچا جان: جی نہیں، فرشتے اترتے ہیں آسمان سے۔ ارے صاحب ہم نہیں پڑھائیں گے اپنی بچیوں کو تو کیا آپ پڑھائیں گی؟

رضیہ: رئیلی سلمیٰ؟

سلمیٰ: ہاں رضیہ۔ چچا جان ہمیں بہت دیر سے پڑھا رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ہمارا نصابِ تعلیم ہی سرے سے غلط ہے۔

چچا جان: بالکل، سو فیصدی ناقص۔

رضیہ: وہ کیسے آخر؟

سلمیٰ: وہ اس لیے کہ ہمیں موقعے کے شعر یاد نہیں کرائے جاتے ہیں۔ چچا جان کا اصرار ہے کہ ہم عبارت میں موقعے کا شعر ضرور لکھا کریں۔

رضیہ: اوہ۔ گویا چچا جان شاعر ہیں۔

چچا جان: نہیں صاحب، میں کہاں اور شاعری کہاں۔ بس استادوں کی صحبت کا فیض ہے کہ شعر سمجھ لیتا ہوں۔

سلمیٰ: تو پھر آپ ہمیں اتنے شعر سناتے کیوں ہیں، ہمارا قصور کیا ہے؟

چچا جان: کہنا چاہتی ہو کہ مجھے شعر سنانے کا خبط ہے۔ یہی نا؟ اللہ کی شان، اسی لیے تو بقول شاعر ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کر لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

رضیہ: یہ ہے سو فیصدی موقعے کا شعر۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ چچا جان ایسا کیجیے آپ ایک ساتھ ہمیں سارے موقعے کے شعر سنا دیجیے۔ اگر اس کے بعد ہم زندہ رہے تو پڑھ لکھ لیں گے ورنہ ایک اور موقعے کا شعر سنا کر ہمیں سپردِ خاک کر دیجیے گا۔

چچا جان: کیا مطلب ہے؟

شاہدہ: مطلب یہ ہے چچا جان کہ ایک گھنٹے میں ہم جتنا یاد کرتے ہیں، ایک موقعے کا شعر سن کر بھول جاتے ہیں۔ کیوں بھئی سلمیٰ، رضیہ، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟

رضیہ، سلمیٰ ایک ساتھ: بالکل ایسا ہی ہے۔

چچا جان: گویا تم لوگ کوڑھ مغز بھی ہو اور بدذوق بھی۔ اور کیوں نہ ہو، تمہارا نظامِ تعلیم ہی سرے سے غلط ہے۔ معاشیات، اقتصادیات، نفسیات، لغویات، پتا نہیں کیا کیا پڑھایا جاتا ہے۔ نہیں سکھایا جاتا ہے تو ذوقِ سخن۔ ڈگریاں ہیں کہ اندھے کی ریوڑیوں کی طرح بٹ رہی ہیں۔ آپ کیا ہیں؟ بی اے۔ آپ کیا ہیں؟ ایم اے۔ میں کہتا ہوں اگر ایک موقعے کا شعر یاد نہیں تو سب بیکار ہے۔

لاحول ولاقوۃ۔ زمانے کے انداز بدل گئے، بلکہ بقول شاعر ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

سلمیٰ: مجھے تو لگتا ہے چچا جان کے نزدیک ایک موقعے کا شعر ایک ڈگری سے زیادہ اہمیت

رکھتا ہے۔

رضیہ: کیوں چچا جان؟

چچا جان: بالکل، اس میں کیا شک ہے؟

رضیہ: تو پھر میری مدد کیجیے چچا جان! فرض کیجیے ہم کسی اہم کام میں مصروف ہیں اور ایک صاحب بلاضرورت ہمارا دماغ چاٹ رہے ہیں، تو اس موقعے پر کون سا شعر موزوں رہے گا؟

چچا جان: (جلدی سے بے خیالی میں) یہی کہ

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جی۔ مگر کیا مطلب؟ گویا اب میرا مذاق بھی اڑایا جانے لگا۔

رضیہ: نہیں چچا جان! توبہ کیجیے، بھلا ہماری یہ مجال کہاں۔

چچا جان: نہیں، ہمیں بتانے کی کوشش نہ کیجیے محترمہ! یہ تو بالکل وہی بات ہوئی کہ......

سلمیٰ: (بات کاٹ کر) بقول شاعر، سنو موقعے کا شعر۔

چچا جان: کیوں نہیں، جیسا کہو گی ویسا سنو گی۔ موقع آئے اور میں شعر سنانے سے چوک جاؤں، ناممکن ہے محترمہ۔ اور ہاں رضیہ صاحبہ! تو گویا ہم آپ کا دماغ چاٹ رہے ہیں۔ وقت خراب کر رہے ہیں آپ کا۔ بقول شاعر ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

شاہدہ: (رضیہ کو ایک طرف لے جا کر) فضول ہے رضیہ۔ یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔

رضیہ: تو سنو ایک ترکیب ہے۔ سلمیٰ آؤ تم بھی۔ (دونوں کے کان میں)

سلمیٰ: نہیں، غضب ہو جائے گا۔

رضیہ: تم فکر نہ کرو، میں سب سنبھال لوں گی۔

چچا جان: میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کانا پھوسی کا امتحان کب سے ہونے لگا ہے؟ کیا یہ کسی نئے پرچے کی تیاری ہو رہی ہے؟

سلمیٰ: نہیں چچا جان! رضیہ کہہ رہی تھی کہ آج ہم لوگوں نے کافی پڑھ لیا ہے، اگر آپ اجازت

دیں تو اب ہم آرام کرنے چلے جائیں؟

چچا جان: کیوں نہیں؟ بقول شاعر ؎

آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کے سویئے
آپ کی بلا سے فیل ہوں یا پاس

سلمیٰ: جی چچا جان ہم کیا کریں۔ نیند بھی تو زور کی آ رہی ہے۔

چچا جان: گویا بقول شاعر ؎

شاہدہ: میں ہاتھ جوڑتی ہوں چچا جان! اب موقعے کا شعر سننے کی بالکل سکت نہیں ہے۔

چچا جان: خیر تشریف لے جایئے۔ سدھاریے۔ بقول شاعر بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھایئے۔

(لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔ چچا جان ٹہلتے ہوئے پلنگ کی طرف جاتے ہیں۔ حقے کے دو ایک کش لگاتے ہیں اور زیرِ لب کوئی شعر گنگناتے ہیں۔ فوراً ہی شاہدہ اور سلمیٰ مردانہ لباس میں اور چہروں پر نقاب لگا کر داخل ہوتی ہیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر ہیں)

چچا جان: (انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر گھبرائے انداز میں) میرے خدا، یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ارے شاہدہ...... ارے سلمیٰ...... کہاں غائب ہو گئی ہو تم لوگ۔

سلمیٰ: (کڑک کر) خاموش۔

شاہدہ: اگر اب آواز نکالی تو خنجر سینے کے پار کر دوں گا۔ سمجھے۔

چچا جان: سمجھا سمجھا۔ ارے باپ رے۔ بقول شاعر ؎

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

سلمیٰ: بکومت۔

چچا جان: بہتر بہتر۔ لیکن حضرات! آپ بغیر اطلاع کے غریب خانے پر تشریف لے آئے، افسوس کہ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔

سلمیٰ: سنو، قتل کرنے والے اجازت لے کر نہیں آتے۔

چچا جان: قتل...... کس کا قتل، بھئی کیوں قتل؟ کیسا قتل؟

سلمیٰ: ہم تمہیں قتل کرنے آئے ہیں۔ (شاہدہ سے) تم مضبوطی سے ان کا ایک ہاتھ پکڑو۔ میں اس

کے گلے پر خنجر چلائے دیتا ہوں۔

(شاہدہ چچا جان کو گرفت میں لے لیتی ہے)

چچا جان: نہیں نہیں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ اگر ایسا ہی شوق ہے تو قتل کرنے کے لیے ایک عالم پڑا ہوا ہے۔ بقول شاعر ؎ ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے

سلمٰی: لیکن ہم صرف تمہیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔

چچا جان: مجھے ہی کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ آپ اپنا یہ شوق کہیں اور کیوں نہیں پوار کر لیتے؟ بقول شاعر ؎

تُو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

مگر خدارا اس گردن سے چھری کو دور ہی رکھو۔

سلمٰی: نہیں۔ خاموش رہو اور قتل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

چچا جان: افوہ، عجیب مشکل ہے۔ اب تو کوئی موقعے کا شعر بھی یاد نہیں آ رہا ہے کہ تمہیں باز رکھ سکوں۔ بھائیو! خدا کے لیے میری جان بخش دو، میں بے ضرر آدمی ہوں۔ اگر روپیہ پیسے کی لالچ ہے تو میں تجوری کی چابی تمہیں دیتا ہوں، جتنی رقم چاہیے لے لو، بخدا اُف نہیں کروں گا۔ اگر کوئی خفگی ہے مجھ سے تو بس مجھے تھوڑا سا مار پیٹ کر معاف کر دو۔ دیکھو موقعے کا شعر بھی یاد آ گیا ؎

سو جوتوں سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا

عزت وہ خزانہ ہے جو خالی نہیں ہوتا

سلمٰی: ہم چوری کی نیت سے نہیں آئے ہیں، سمجھے۔ بس تمہیں قتل ہی کرنے آئے ہیں۔

چچا جان: ارے باپ رے۔ بھائیو! میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو۔ کیوں مجھ بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگتے ہو؟ کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟

سلمٰی: شاہدہ سے پوچھتی ہے کیوں، کیا ہم اسے معاف کر دیں؟

شاہدہ: معاف کرنے کا حق صرف سردار کو ہے۔

چچا جان: تو کہاں ہیں آپ کے سردار صاحب۔ خدارا ان سے فرمائیے کہ وقتِ مددگاری ہے۔

(اسی دوران سردار کے بھیس میں رضیہ داخل ہوتی ہے)

شاہدہ: سردار تشریف لا رہے ہیں۔

چچا جان: (جھک کر) آداب بجالاتا ہوں قبلہ سردار صاحب۔ زہے نصیب کہ آپ نے قدم رنجہ فرمایا، ورنہ عجب نہ تھا کہ یہ بے گناہ ذبح ہو جاتا۔

رضیہ: (کڑک کر) کیا بات ہے، تم لوگوں نے اسے ابھی تک قتل کیوں نہیں کیا؟

سلمیٰ: سردار جی! یہ رحم کا طالب ہے۔

شاہدہ: زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

رضیہ: تو اس سے کہو کہ ہم ایک شرط پر اس کی جان بخشنے کو تیار ہیں۔

چچا جان: فرمایئے، فرمایئے۔ للہ دیر نہ کیجیے۔ میں ایک نہیں دس شرطیں پوری کرنے کو تیار ہوں۔

رضیہ: ہم نے سنا ہے کہ تم ہر موقعے پر شعر سنانے کے عادی ہو۔

چچا جان: جی ہاں، درست فرمایا آپ نے۔ لیکن میں کس قابل ہوں! آپ کہتے ہیں تو سنا ہی دیتا ہوں۔ بالکل موقعے کا ہی شعر ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

رضیہ: خبردار۔ شعر نہیں۔ سنو، تمہاری جان صرف اس شرط پر بخشی جا سکتی ہے کہ تم اس عادت سے ابھی اسی وقت توبہ کرلو۔

چچا جان: یعنی گویا مطلب یہ ہے کہ موقع محل دیکھوں اور شعر بھی نہ پڑھوں؟

رضیہ: ہاں، ہاں ہماری یہی شرط ہے۔

چچا جان: جی مجھے منظور ہے۔ زندگی بڑی قیمتی چیز ہے، اس کے لیے تو مجھے آپ کا حکم بھی ماننا ہی پڑے گا۔ میں توبہ کرتا ہوں، توبہ توبہ۔ کان بھی پکڑ لیتا ہوں۔ اب اگر شعر پڑھوں تو اپنا فاتحہ پڑھوں۔ لیکن خدا کے لیے اب یہ موذی خنجر دور کرلیں ورنہ میرا دم نکلا چاہتا ہے۔

رضیہ: ٹھیک ہے، ہم تمہاری جان بخشتے ہیں، لیکن یاد رکھو اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ کوئی معافی قبول نہیں ہوگی۔

چچا جان: آپ کیسی باتیں کرتے ہیں قبلہ، قولِ مرداں جاں دارد۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ

آیندہ موقعے کا شعر کبھی نہیں سناؤں گا، خواہ موقعے پر میرا دم ہی کیوں نہ نکل جائے بغیر شعر سنائے۔

رضیہ: ٹھیک ہے، اسے معاف کردو۔

(شاہدہ چچا جان کو چھوڑ دیتی ہے)

چچا جان: (آداب بجا کر)۔ عنایت، نوازش، کرم، مہربانی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ بقول شاعر ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

سلمٰی: خنجر تان کر۔ عادت سے باز نہیں آؤ گے۔ پھر شعر!

چچا جان: غلطی ہوئی، معاف کر دیجیے، پھر سے توبہ کرتا ہوں۔ عادت تو جاتے جاتے جائے گی۔ بقول......

سلمٰی: پھر شروع ہو گئے۔ (خنجر دکھاتی ہے) یہ آخری بار کی معافی ہے۔

چچا جان اچھل کر اندر بھاگ جاتے ہیں۔

(تینوں لڑکیاں اسٹیج پر حاضرین کی طرف نقاب اتار کہ خوب ہنستی ہیں)

رضیہ: دیکھی میری ترکیب کامیاب رہی نا۔

سلمٰی: بھئی مان گئے ہم تمھیں، اگر تم یہ ترکیب نہ لڑاتیں تو چچا جان شعر سنا سنا کر ہمارا دم نکال دیتے اور ہمیں پڑھنے کا بھی وقت نہیں دیتے۔

شاہدہ: چلو اللہ کا شکر ہے۔ کل سے ہم لوگ اطمینان کے ساتھ پڑھائی کریں گے۔ بقول شاعر کی گردان تو گئی۔

لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر خوب ہنستی ہیں کہ چچا جان دبے پاؤں داخل ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

چچا جان: (گرج کر) ہینڈز اپ۔ اگر جنبش کی تو گولی مار دوں گا۔

لڑکیاں گھبرا کر ہاتھ اوپر کر لیتی ہیں۔

چچا جان: سردار صاحب! یہ بندہ عاجز بڑا سخت جان ہے، اسے قتل کرنے کے لیے ابھی اور ریاض کی ضرورت ہے، مگر فی الحال آپ کلمہ پڑھیے اور پستول کی گولی کھا کر سدھاریئے۔

(لڑکیاں گھبرا کر پلٹتی ہیں تو چچا جان ان کا چہرہ دیکھ لیتے ہیں)

چچا جان: اوہ، تو یہ تم لوگ ہو۔ کم بختو، تمہاری یہ مجال! ٹھہرو تو کیسا سبق دیتا ہوں۔ شعر سنا سنا کر ادھ موا نہ کردوں تو میرا نام نہیں۔

(لڑکیاں اسٹیج پر اِدھر اُدھر بھاگتی ہیں۔ چچا جان پیچھے پیچھے)

چچا جان: (سنو سنو......بقول شاعر......) پردہ گر جاتا ہے۔

☆☆☆

شاعروں کا بینک

مس فرحت: بڑی دیر کردی آج آپ نے آنے میں۔

مینیجر: بس کیا بتاؤں مس فرحت۔ اس بینک کی ذمہ داریوں نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ آپ نے نیا شگوفہ سنا؟

مس فرحت: نیا شگوفہ۔ نہیں تو

مینیجر: (کاغذ کا پلندہ آگے بڑھا کر) دیکھئے

مس فرحت: (ایک نظر کاغذ پر ڈال کر) اوں یہ تو مرکزی بینک کی رپورٹ ہے۔

مینیجر: جی ہاں۔ اور اب اس رپورٹ میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اب ہمارے بینک کا مستقبل خطرے میں ہے۔

مس فرحت: اوہو۔

مینیجر: ملک میں شاعری کا شدید Inflation پھیلا ہوا ہے۔ جگہ جگہ مشاعرے ہورہے ہیں۔ قوالیاں ہورہی ہیں۔ قصیدے پڑھے جارہے ہیں مرثیہ گوئی ہورہی ہے۔

مس فرحت: جی ہاں۔ Poetry market کی حالت بڑی نازک ہے۔ مگر سنا ہے کہ حکومت نے اس Inflation کو روکنے کے لیے ایک نئی focal policy بنائی ہے۔

مینیجر: ارے صاحب پالیسی سے کیا ہوگا۔ رونا تو ان شاعروں کا ہے جو اپنے کلام کو بینک میں جمع کرانا گناہ سمجھتے ہیں۔ خیر۔ ذرا پڑھیے تو اس رپورٹ میں کیا لکھا ہے؟

مس فرحت: (رپورٹ پڑھتی ہے) حکومت نے شاعرانہ منصوبہ بندی کے سلسلے میں جو کمیشن قائم کیا تھا اس کا خیال ہے کہ اشعار ہر وقت جیب میں نقدی کی صورت میں رکھنے کے تین Motives ہوتے ہیں۔

(1)Creative motive جس کے تحت وہ اشعار آتے ہیں جو قصیدوں ۔ سپاس ناموں اور استقبالیہ دعوتوں میں پڑھے جاتے ہیں ۔ اور بڑے آدمی جنہیں سن کر نہ سمجھتے ہوئے بھی خوش ہوتے ہیں۔

(2)Circulative Motive جس کے تحت وہ اشعار آتے ہیں جو رسالوں وغیرہ میں چھپتے ہیں اور جن کا معاوضہ نہیں ملتا

(3)Destructive motive یعنی وہ اشعار جو مشاعروں میں پڑھے جاتے ہیں اور عام طور پر چرائے ہوئے ہوتے ہیں یا پھر وہ اشعار جو تاریخِ وفات نکالنے میں استعمال ہوتے ہیں اور جنہیں سن کر مرنے والے کی روح مفت میں شرمندہ ہوتی ہے

مینجر : بڑی ودلچسپ بات ہے۔آگے پڑھیئے۔

مس فرحت: حکومت کا خیال ہے کہ creative motive کے تحت جو اشعار کہے جاتے ہیں وہ شاعروں کے لیئے ذریعۂ روزی اور بڑے آدمیوں کے لیئے necessities میں سے ہیں ۔ اس طرح circulative motive والے اشعار بھی قابلِ معافی ہیں کیونکہ آج کل رسالے اور اخبار بھی عام طور پر قصیدے ہی شائع کرتے ہیں ۔ البتہ مشاعروں میں جو کلام پڑھا جاتا ہے وہ انتہائی destructive ہے اور اس کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ ملک میں inflation پھیل گیا۔

مینیجر: خوب

مس فرحت: اور اس لیئے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک میں جگہ جگہ شاعروں کے لیئے بینک کھولے جائیں گے اور اس طرح شاعروں میں کلام کو بینک میں جمع کرنے کی عادت پیدا ہو جائے گی۔

مینیجر: ہو چکی ۔ خیر آگے پڑھیں۔

مس فرحت: حکومت کا رویہ اس سلسلے میں انتہائی دوستانہ ہوگا تا کہ شاعر اس Saving Scheme کو سنسر نہ سمجھیں شاعروں کو مزید incentives دینے کے لیئے حکومت نے

اس سال شاعری پر شرح سود بھی بڑھا دی ہے

گذشتہ سال ہر دس شعر پر ایک شعر حکومت کی طرف سے۔ مگر اس سال اعلان کیا گیا ہے کہ جو بینک میں چار شعر جمع کرائے گا اسے ایک مقطع حکومت کی طرف سے سود میں ادا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ جو شاعر بیک وقت ۱۰۰ غزلیں بینک میں جمع کرائے گا اسے ہر غزل کا ترنم بطور سود ادا کیا جائے گا۔ اور جس شاعر کا سارا کلام پانچ سال safe deposit میں رہے گا حکومت اس کا دیوان چھپوا دے گی۔

مینیجر: سبحان اللہ۔ پھر کیا ہوگا؟

مس فرحت: اس پالیسی کی وجہ سے امید پیدا ہو گئی ہے کہ حکومت آئندہ سال تک private sector میں اتنا کلام کر لے گی جو آیندہ پنج سالہ مشاعرے کو finance کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ لیکن اگر شاعروں نے حکومت سے تعاون نہ کیا تو خیال ہے کہ حکومت کو آئیندہ پنج سالہ مشاعرے کے لیئے بیرونی امداد کا سہارا لینا پڑے گا۔ اور کم از کم پانچ شاعر باہر سے درآمد کرنے پڑیں گے۔

مینیجر: تو گویا شاعروں میں بچت کا رجحان پیدا کیا جا رہا ہے۔ مجھے تو امید نہیں ہے۔

مس فرحت: ارے کیوں آخر۔ اتنی تو آسانیاں دی جا رہی ہیں انہیں۔

مینیجر: آسانیوں سے کیا ہوتا ہے مس فرحت۔ شاعروں کی فضول خرچی اب انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ کوئی پیدا ہوا تو تاریخ ولادت۔ شادی ہو تو سہرہ۔ کسی سے خوش ہو تو قصیدہ۔ بگڑ جائیں تو ہجو۔ کوئی مر جائے تو تاریخ وفات یہ تو گہوارے سے لے کر لحد تک شعر خرچ کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ کبھی شعر جمع نہیں کرائیں گے۔

مس فرحت: حیرت ہے۔

مینیجر: حیرت کی بات نہیں ہے مس فرحت۔ شاعروں کی مامتا کو آپ نہیں جانتیں۔ ماں بچے کو چھوڑ سکتی ہے۔ مگر شاعر شعر سے الگ نہیں رہ سکتا۔

مس فرحت: بڑے مایوس ہیں آپ شاعروں سے؟

منیجر: میں کیا ان سے پوری انسانیت مایوس ہے۔ بیچارے عورتوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ آپ میری بات لکھ لیجیے مس فرحت اس ملک میں خاندانی منصوبہ بندی ممکن ہے مگر شاعرانہ منصوبہ بندی اوں ہوں Impossible

مس فرحت: اوہ، خیر یہ تو وقت ہی بتا سکے گا۔ فی الحال ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیئے؟

مینیجر: اچھا یاد دلایا آپ نے۔ حکومت نے اس سلسلے میں secret instructions جاری کی ہیں

مس فرحت: اچھا۔ وہ کیا

منیجر: ہر بینک کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر کوئی شاعر اپنا کلام نکالنے آئے تو جہاں تک ممکن ہو اسے باتیں بنا کر ٹال دیں۔ لیکن اگر وہ ضد کرنے لگے تو کوشش کی جائے کہ دو چار شعر سے زیادہ کا چیک cash نہ ہو۔ میرا مطلب ہے کہ جہاں تک ہو سکے اسے کم سے کم کلام withdraw کرنے دیا جائے۔

مس فرحت: ٹھیک ہے۔ میں اس کا خیال رکھوں گی۔ اور ہاں depositors کے بارے میں کیا ہدایت ملی ہے آپ کو

مینیجر: depositors کو بڑی اچھی طرح Treat کیجئے مس فرحت اسے باتوں میں لگایئے۔ پہلے کلام ڈپازٹ کرنے کے فائدے گنائیں۔ مثلاً مقطع کی لالچ دیں، ترنم کی اہمیت بتائیں۔ دیوان چھپوانے کی ترغیب دیں۔ وہ راضی نہ ہو تو نقصانات گنوائیں مثلاً سیفٹی ایکٹ میں پکڑے جانے کا امکان میرا مطلب ہے بڑی ہوشیاری سے آپ کو یہ کام کرنا ہوگا۔ بہت careful رہنے کی ضرورت ہے۔ بس یہ سمجھیئے جیسے ... جیسے آپ سانپ کے منہ سے دانت نکالنے کی کوشش کر رہی ہوں

مس فرحت: جی ہاں مجھے اس کا احساس ہے۔

مینیجر: بس ایک بات اور۔ اس کا خاص خیال رکھیئے کہ جعلی شاعری یا کھوٹا کلام جمع نہ ہو جائے۔ حکومت نے بینکوں کو اس طرف خاص طور پر متوجہ کیا ہے کہا جاتا ہے کہ ملک میں جعلی کلام

بہت بڑی مقدار میں سرکیولیٹ ہورہا ہے اوران کے بنانے والے اتنے ہوشیار ہیں کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چل رہا کہ وہ جعلی کلام استعمال کرر ہے ہیں یا اصلی۔

مس فرحت: یہ تو خطرے کی بات ہے۔

مینیجر: اس لیئے تو کہہ رہے ہیں کہ آپ احتیاط کیجیئے گا۔

مس فرحت: مگر میرا مطلب ہے کہ جعلی کلام کی پہچان کیا ہوگی۔

مینیجر: وہ میں آپ کو بتادیتا ہوں۔(رپورٹ کھولتا ہے) سنئے (شعر پڑھتے ہوئے) سنیے

رات کے بےکراں سناٹے میں
کسی نے چپکے سے مرے سر پہ چپت ماری ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا مرے دوست
عالمِ خواب ہے یا عالمِ بیداری ہے
ہو نہ ہو یہ میرے اغیار کی ہوشیاری ہے
خیر افسوس نہ کر اے دلِ محزوں کیونکہ
سو جوتوں سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

مینیجر: بتائیے یہ غزل ہے۔

مس فرحت: نہیں

مینیجر: نظم ہے؟

مس فرحت: نہیں

مینیجر: رباعی، مسدس، مخمس

مس فرحت: نہیں یہ بھی نہیں۔

مینیجر: تو پھر جان لیجیے یہ جعلی کلام ہے۔

مس فرحت: اوہ۔اچھا۔

مینیجر: جناب۔ اب اور ملاحظہ فرمائیے

مجھ سے پہلی کو محبت مری محبوب نہ مانگ
کیوں کہ پہلی کو مری جیب میں پیسے ہوں گے
تو نے اخباروں کی رڈی جو بچارکھی ہے
آج اس رڈی کو بازار میں بیچ آیا ہوں
چند پیسے بڑی مشکل سے کما پایا ہوں
سوچتا ہوں کہ تجھے اس کی خبر ہے کہ نہیں
ہو نہ ہو تجھ کو خبر دی ہے کسی نے آ کے
ورنہ تو مجھ سے محبت کا طلبگار نہ تھا
مجھ سے پہلی کو محبت مری محبوب نہ مانگ **...**

مس فرحت: بس بس اب جعلی کلام مجھ سے بچ نہیں پائے گا۔

مینیجر: جی اب آپ جعلی کلام کے لیے ایک کوڈ مقرر کر لیجیے۔

مس فرحت: کوڈ ورڈ۔؟ میرا خیال ہے اسے ہم" آزاد شاعری" کہیں گے۔

منیجر: آزاد شاعری - ونڈرفل - گریٹ۔ اچھا تو اب آپ آزاد شاعری کا ایک نیا فائل بنا لیجیے۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔

(مس فرحت اپنی سیٹ پر واپس چلی جاتی ہیں)

(زخمی صاحب داخل ہوتے ہیں اور انتہائی ادب سے جھک کر سلام کرتے ہیں)

زخمی: میں نے کہا حضور آداب بجالاتا ہوں

مینیجر: آداب۔ کہیے کیسے زحمت کی۔

زخمی: کیا عرض کیا جائے صاحب وہ جو کسی نے کہا ہے

عشق سے کون بشر ہے خالی
کر دئے جس نے گھر کے گھر خالی

مینیجر: مائی گڈنس۔ یہ عمر اور عشق۔ اسی لیے کہا تھا زخمی صاحب کہ غزلیں نہ کہا کیجئے

زخمی: اوہ۔ آپ غلط سمجھے سرکار۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ اور میں بھی ایک چھوٹی سی خواہش لے کر حاضر ہوا ہوں۔

مینیجر: ارشاد۔ ارشاد

زخمی: کیا عرض کیا جائے۔ میری ادبی حالت آپ سے ڈھکی چھپی تو ہے نہیں۔ آپ اچھی طرح سے واقف ہیں۔ بہ مشکل تمام اتنے شعر کہہ لیتا ہوں کہ تین دن کی داد اور تعریف کا بندوبست ہو جاتا ہے کچھ اچھے وقتوں کی غزلیں بچی تھیں جو آپ کے کہنے سے بینک میں جمع کرا دی ہیں۔

مینیجر: تو اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ آپ کی غزلیں محفوظ ہیں

زخمی: اس سے کس کافر کو انکار ہے۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ احباب خوش مذاق کا اصرار ہے کہ میں ٹنڈو آدم کے مشاعرے میں شرکت کروں۔ اس لئے۔

مینیجر: ارے چھوڑیئے بھی زخمی صاحب کیا کیجئے گا۔ فضول خرچی بری بات ہے۔

زخمی: مجھے اس کا احساس ہے مگر کیا کروں۔ خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم والی بات ہے۔ اجازت ہو تو ایک چیک پیش کرو

مینیجر: کتنی غزلوں کا چیک ہے۔؟

زخمی: زیادہ زحمت نہیں دوں گا۔ صرف دو غزلیں۔ چار رباعیاں اور ایک نظم نکالنا چاہتا ہوں۔

مینجر: آپ کی مرضی۔ بسم اللہ (زخمی مس فرحت کو چیک پیش کرتے ہیں۔ مس فرحت چیک دیکھتی ہیں۔)

مس فرحت: اوہ دو غزلیں۔ چار رباعیاں- اور ایک نظم- زخمی صاحب یہ قطعی فضول خرچی ہے۔

زخمی: میں شرمندہ ہوں مگر یہ عزّت کا معاملہ ہے

مس فرحت: اچھی بات ہے (چیک کو بغور دیکھتی ہے) مگر زخمی صاحب آپ کے دستخط صحیح نہیں ہیں۔

زخمی: دستخط صحیح نہیں ہیں۔محترم آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ یہ میرے ہی دستخط ہیں

مس فرحت: اس سے مجھ انکار نہیں ہے مگر دیکھیئے نا۔ یہ اصول کی بات ہے

زخمی: اصول کی بات ہے۔ گویا کہ یہ چیک.....

مس فرحت: جی ہاں یہ چیک کیش نہیں ہو سکے گا۔

زخمی: مذاق چھوڑیے محترمہ میں عجلت میں ہوں۔ٹنڈو آدم کی ٹرین میں بس اب ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔

مس فرحت: میں مجبور ہوں زخمی صاحب آپ کی دستخط صحیح نہیں ہے۔

زخمی: آخر کیا خامی ہے میری دستخط میں؟

مس فرحت: خاصی-اوں-یہ- جینالی آپ نے زخمی کو ایسا گھسیٹ کے لکھا ہے کہ وہ بالکل خبطی معلوم ہو رہا ہے۔

زخمی: محترم میں مذاق کا عادی نہیں ہوں۔ چلئے شعر گن کر ادھر بڑھایئے۔

مس فرحت: جناب زخمی صاحب میں بھی بحث کی عادی نہیں ہوں۔ لیجئے یہ چیک واپس لے جایئے۔

زخمی: غضب خدا کا۔ ارے صاحب جلدی کیجیے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔محترم میں پھر کہتا ہوں۔

مس فرحت: میں بھی پھر کہتی ہوں۔

زخمی: لپک کر مینیجر کی طرف آتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں قبلہ آپ۔ بخدا میں اس رویے کا عادی نہیں ہوں۔

مینیجر: کچھ رعایت کر دیجیے مس فرحت آپ ہمارے پرانے client ہیں۔

مس فرحت: مجھے افسوس ہے سر۔اب تو بینک کا وقت بھی ختم!

زخمی: کیا کہا بینک کا وقت ختم ہے محترم بخدا یہ زیادتی ہے ابھی پورے دس منٹ باقی ہیں۔

مس فرحت: مگر دس منٹ میں شعر نکالنا مشکل ہے۔

زخمی: اللہ کی شان۔محترمہ اچھے وقتوں میں ہم دس منٹ میں دوغزلیں کہہ لیا کرتے تھے اور آپ ہیں کہ دوغزلیں نکال نہیں سکتیں غضب خدا کا۔

مینیجر: صاحب میری بھی تو سنئے آخر۔مس فرحت آپ ایسا کیجیئے زخمی صاحب کوایک نظم withDraw کر لینے دیجئے۔

زخمی: صرف ایک نظم۔اف میرے خدا۔ارے صاحب یہ میرے کیریئر کا سوال ہے۔

مینیجر: زخمی صاحب یہ بھی میں آپ کو اپنی ذمہ داری پر دے رہا ہوں۔ورنہ میرے خدا ۔اب میں کیا کروں۔استاد کے سامنے بغیر غزل کے کس طرح جاؤں گا۔اب تو تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔

مس فرحت: (کاغذ کے پرزے دے کر) گن لیجئے زخمی صاحب- چھوٹی بحر کے پورے پندرہ شعر ہیں۔

زخمی: ارے ہوں گے صاحب یہاں تو سوال غزل کا ہے۔میرے معبود اب میں استاد کو کیا منہ دکھاؤں گا۔(پھر اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا ہو)،اللہ تیرا شکر ہے۔اور وہ سجدے میں گر جاتا ہے۔

مینیجر: ارے زخمی صاحب۔یہ سجدۂ شکر کیسا؟

زخمی: اللہ بڑا کارساز ہے اس نے میری لاج رکھ لی۔

مینیجر: بہت خوب۔آخر ہوا کیا؟

زخمی: اب آپ سے کیا چھپانا صاحب۔منے کی ماں نے برے وقتوں کے لیے اپنے جہیز کی چند غزلیں بچا رکھی ہیں۔سوچتا ہوں۔اب ان ہی سے کام چلا لوں گا یا اللہ تیرا شکر ہے۔ پروردگار تیری ایک حمد due رہتی ہے بخدا پورے 100 شعروں کی حمد لکھوں گا میرے مالک۔ اچھا صاحب خدا حافظ، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

مینیجر: تالیاں بجا کر مس فرحت کی داد دیتا ہے،گڈ ویری گڈ

(اب قاتل صاحب تشریف لاتے ہیں)

قاتل: یہ کس بات کی داددی جارہی ہے حضور کیا مس فرحت بھی شعر کہنے لگی ہے

مینیجر: اوہ قاتل صاحب،فرمایئے آج ہمیں کیسے یاد کیا۔

قاتل: کیا عرض کروں صاحب ہم تو ہمیشہ وقت پڑنے پرآپ کو زحمت دیتے ہیں۔

مینیجر: کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ دوستی میں ایسی باتوں کی کیا اہمیت ہے۔

قاتل: کرم ہے آپ کا۔بس یہی تو اک ادا ہے آپ کی جس کی وجہ سے آپ سے کچھ کہنے سننے کی ہمت پڑ جاتی ہے۔ذرا میرا اکاؤنٹ تو دیکھئے۔

مینجر: بہتر ہے۔مس فرحت۔

مس فرحت: رجسٹر لے کر حاضر ہوتی ہیں۔کیا نام ہے آپ کا قاتل.....

(پڑھتے ہوئے۔قمر،قیصر،قائم۔ہاں یہ رہا قاتل صاحب آپ کا نام۔)

آپ کے اکاؤنٹ میں بس تین شعر ہیں

قاتل: صرف تین شعر۔کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ مجھے Over Draft دے دیں۔

مینیجر: Overdraft چھوڑیئے صاحب،poetry market آج کل بے حد tight ہے۔

قاتل: میں باخبر ہوں۔مگر کیا کروں صاحب بیگم کے چھوٹے بھائی کی کل شادی ہے۔ بس ایک سہرا over draft کردیجیئے آپ تو جانتے ہیں ساری خدائی ایک طرف اور...

مینیجر: سہرا overdraft کردوں۔نہیں قاتل صاحب ممکن نہیں

قاتل: حضرت یہ قطعی غیر دوستانہ گفتگو ہے

مینیجر: میں معافی چاہتا ہوں۔ہمیں overdraft کے لیے سختی سے منع کر دیا گیا ہے ویسے ایک دوست کی حیثیت سے میں آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ٹھہریے شاید میرے پاس کچھ ہو۔(جیب ٹٹول کر کاغذ نکالتا ہے)میرے پاس اس وقت صرف ایک رباعی ہے اور ایک ادھوری غزل بھی ہے۔اگر اس سے کچھ کام چل جائے تو...اور رکیے۔مس فرحت آپ مجھے کچھ کلام ادھار دے سکیں گی۔

مس فرحت: دیکھتی ہوں (پرس ٹٹول کر) میرے پاس اس وقت صرف ایک تاریخِ وفات ہے۔

قاتل: لاحول ولاقوۃ۔ مجھے سہرے کی ضرورت ہے اور آپ تاریخِ وفات کی بات کر رہی ہیں۔تو یوں کہیے نا کہ آپ میری مدد کرنا ہی نہیں چاہتے۔

مینجر: اب آپ سے کیا عرض کروں آپ تو اپنے آدمی ہیں۔

قاتل: اس لیے آپ مجھ سے اس طرح پیش آ رہے ہیں۔خیر دوستی پر لعنت بھیجئے۔کوئی کسی کا نہیں آج سب اکیلے ہیں۔آپ مجھ سے دوٹوک بات کر لیجیے۔

مینیجر: ارشاد

قاتل: میں ملک کا سب سے بڑا عوامی شاعر ہوں۔کہیئے ہاں۔

مینیجر: درست

قاتل: میں آپ کا سب سے پرانا client ہوں۔

مینیجر: تسلیم۔

قاتل: میرا اکاؤنٹ ہمیشہ دوسروں سے زیادہ رہا ہے۔

مینیجر: یہ بھی صحیح ہے۔

قاتل: پھر اب آپ کیا کہتے ہیں؟

مینیجر: یہ حکومت کا سب سے بڑا بینک ہے۔کہیے ہاں۔

قاتل: ہاں

مینیجر: اور میں اس بینک کا مینیجر ہوں۔

قاتل: ہاں

مینیجر: بس تو ملک کے سب سے بڑے شاعر کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملک کے سب سے بڑے بینک کے مینیجر نے اُسے Overdraft دینے سے انکار کیا ہے۔

قاتل: اوہ میں سمجھا۔تمہاری شامت آئی ہے میرے ہاتھوں۔میں تمہیں دیکھ لوں گا۔

میں تمہاری ہجو لکھوں گا۔ میں تمہارے بینک کی تاریخِ وفات لکھوں گا، لکھ کر تمہارے منہ پر دے ماروں گا۔ میں تم سے انتقام لوں گا۔ (چلا جاتا ہے)۔

مینیجر: ارے سنئے تو قاتل صاحب۔ میں نے کہا۔ دیکھ رہی ہیں اب ہمیں دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔

مس فرحت: ارے چھوڑیئے صاحب۔ شاعر کا کہا اگر سچ ہوا کرتا تو آج ہماری خودی اتنی بلند ہوتی، اتنی بلند ہوتی کہ ایورسٹ کے بجائے خودی کی پیمائش کیا کرتے۔

مینیجر: یہ تو ٹھیک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

(بڑے میاں محمد رفیق اندر آتے ہیں)

رفیق: السلام علیکم مجھے محمد رفیق کہتے ہیں

مینیجر: محمد رفیق۔ میرا مطلب ہے صرف محمد رفیق۔

رفیق: جی ہاں خاکسار کا یہی نام ہے۔

مینیجر: مجھے حیرت ہے۔ پھر آپ کا یہاں کیا کام ہوسکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے یہ شاعروں کا بینک ہے۔

رفیق: جی مجھے معلوم ہے اور اسی لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

مینیجر: اچھا تو فرمایئے۔

رفیق: میں آپ کے پاس کچھ کلام جمع کرانا چاہتا ہوں۔

مینجر: کتنی تعداد ہوگی سب مل ملا کر۔

رفیق: خدا جانے صاحب۔ میں نے کون سا گن رکھا ہے۔

مینیجر: غضب خدا کا۔ آپ شاعر ہیں؟ کیسے شاعر ہیں۔

رفیق: لاحول ولاقوۃ۔ شاعر کون مردود ہے صاحب۔ یہ تو صاحب زادے کے کارنامے ہیں۔

مینیجر: تو گویا آپ کے صاحب زادے شاعر ہیں؟

رفیق: جی ہاں۔ بدقسمتی سے۔ کیا عرض کروں صاحب۔ آدمی کو بگڑنے میں کب دیر لگتی ہے۔ اچھا بھلا کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ایک روز کسی لڑکی نے مسکرا کر غلطی سے دیکھ لیا ہو گیا۔ بس اسی روز سے صاحبزادے اُسی لڑکی کی شان میں قصیدے لکھ رہے ہیں۔ لیجئے یہ رہے اس کے کرتوت۔

مینیجر: کتاب کھول کر دیکھتا ہے۔ تعداد تو کافی ہے مگر زیادہ تر شعر وزن سے گر رہے ہیں۔

رفیق: وزن سے گر رہے ہیں۔ سمجھا دیجیے۔ میں یہ سب نہیں جانتا۔

مینیجر: دیکھئے لکھا ہے بھینس کے آگے بجائی بین کل ماردی ظالم نے میرے ایک۔ اب آپ کہئے فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ کھرے کھوٹے کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ریڈی۔

رفیق: ریڈی۔

مینیجر:

ماردی ظالم نے میرے ایک لات

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

(دو مرتبہ دہراتے ہوئے)

مینیجر: دیکھا آپ نے لات وزن سے گر رہی ہے۔ میرے خیال میں آپ یہ کلام یہاں چھوڑ جائیے۔ ہم کھرے کھوٹے کی پرکھ خود کر لیں گے تو کیا نام بتایا تھا آپ نے؟

رفیق: محمد رفیق

مینجر: محمد رفیق، میرا مطلب کوئی تخلص وغیرہ؟

رفیق: لعنت بھیجیے صاحب تخلص پر میں باعزت آدمی ہوں۔

مینیجر: آپ غلط سمجھے۔ میرا مطلب ہے ہم بغیر تخلص کے کسی کا کلام جمع نہیں کر سکتے۔ یہ ضروری ہے۔ ہوں... آپ کا نام رفیق ہے نا اسے الٹ کر دیجیے تو فقیر بن جاتا ہے۔

رفیق: فقیر

مینیجر: جناب آج سے آپ کا تخلص فقیر ہوگا۔

رفیق: برا وقت پڑا ہے صاحب۔ جو چاہے کہہ لیجیے۔ خدا یہ دن دکھانے سے پہلے اٹھا لیتا تو اچھا تھا۔

مینیجر: (اٹھ کر ہاتھ ملاتا ہے) خدا حافظ۔

(اس لمحے رفیق سے ٹکرا کر قاتل صاحب اندر داخل ہوتے ہیں)

مینیجر: اوہ قاتل صاحب آپ۔

قاتل: جی ہاں۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں پھر آؤں گا۔

مینیجر: میں ایک بار پھر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ تو ہمارے دوست ہیں۔

قاتل: رہنے دیں دوستی وغیرہ۔ آپ سے میں نے over draft مانگا تھا مگر آپ نے انکار کیا تھا لیجئے آپ کے منہ پر میں 100 غزلیں، 20 قصیدے، چار مخمس اور دو رباعی ایک تاریخِ ولادت اور پانچ مرثیے لایا ہوں۔ لو۔ دیکھو گن لو۔

مینیجر: واہ قاتل صاحب واہ کمال ہی تو کر دیا آپ نے۔

قاتل: تعریف کی ضرورت نہیں مجھے رسید دو میں جلدی میں ہوں۔

مینیجر: ذرا دم تو لے لیں قاتل صاحب میں گن تو لوں۔

قاتل: پھر وہی بے اعتباری۔

مینیجر: اچھا صاحب بیٹھئے تو سہی۔ رسید بناتے ہیں۔

مس فرحت: ذرا قاتل صاحب کی شاعری گن کر رسید بنا دیں۔ مس فرحت رسید بنا کر دیتی ہیں قاتل صاحب رسید لے کر اپنے آپ سے کہتے ہیں۔

قاتل: ایسا انتقام لیا ہے تم زندگی بھر نہیں بھولو گے

(باہر چلا جاتا ہے)۔

منیجر: (خوشی کے ساتھ) مس فرحت اب ہمارا بینک بہت ترقی کرے گا۔ دور دور مشہور ہو جائے گا۔ حکومت ہماری قدر کرے گی۔ دیکھا آپ نے اسے کہتے ہیں بزنس۔ اچھا آپ ذرا اس کلام کو تو Count کر لیں میں فقیر صاحب کے کلام کی جانچ کرتا ہوں کہ اصلی تو ہے نا ہمیشہ کی

طرح۔

مس فرحت: تعداد تو ٹھیک ہے جتنی قاتل صاحب نے بتائی تھی اب ہمارے بینک کے deposit میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔

مس فرحت: آپ نے یہ کلام پڑھا بھی تھا۔

مینیجر: نہیں مگر قاتل صاحب پر مجھے اعتبار ہے۔

مس فرحت: تو پھر اس اعتبار کا نتیجہ سن لیجیئے۔

میں کہ اک شاعرِ آوارہ و آزاد چلن
ایک سہرے کے لیئے ترے حضور آیا تھا
تو نے افسوس مجھے ٹال دیا تھا، مجھ کو
جیسے سہرا وہ تیرے باپ کا سرمایہ تھا

مینیجر: (گھبرا کر)!Really

مس فرحت: جناب آگے فرماتے ہیں۔

تو نے صدیوں جو نچوڑا ہے وہ شاعر کا لہو
سرخ ہو جائے گا، گردوں پہ بکھر جائے گا
خوں بہانے کو فنکار نکل آئیں گے
اور ہستی کے یہ انداز بدل جائیں گے
بند ہو جائے گی صدیوں سے یہ اُجڑی کھیتی
سرخ ہو جائے گا ہر شاخ کا پتہ
شاعری کرنے لگے گا یہاں بچہ بچہ
تب میں اے قاتلِ غمخوار یہ پوچھوں گا سوال
جیت کس کی ہوئی ....تیری یا میری؟
یا کہ اس شاعرِ آوارہ وطن کی جو کبھی

ایک سہرے کے لیئے تیرے حضور آیا تھا

مینیجر (چیخ کر): ارے یہ تو آزاد شاعری ہے۔ سو فیصدی جعلی کلام۔ ہم تباہ ہو گئے۔ ہم برباد ہو گئے مس فرحت۔ مجھے بچاؤ۔ میرا بینک۔ میرا بینک۔

☆☆☆

تیسرا حصّہ

تبصرے میری کتابوں پر

چشمِ نم (سفرنامہ)

تبصرہ: محمد اسلام نشتر

مصنفہ: پروفیسر نوشابہ صدیقی

صفحات: 270

قیمت: پانچ سو روپے

ناشر: رب پبلشرز، 10 مہر ٹیرس، اسٹریٹ 6، برنس روڈ کراچی، 72400، فون نمبر 021-32636133

پروفیسر نوشابہ صدیقی کا سفرنامہ 'چشمِ نم' ہمارے سامنے ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نقوش لیے سادہ مگر پُروقار سرورق سے مزین اس سفرنامہ میں بھارت میں سفرنوازی کے واقعات اور احوال بیان کیے گئے ہیں۔ چشمِ نم میں کراچی سے دہلی، علی گڑھ، آگرہ، اعظم گڑھ، غازی پور جیسے تاریخی شہروں، نیز مصنفہ کے اپنے آبائی گاؤں پہنچنا، اور پھر واپسی بذریعہ دہلی کے سفر کے تجربات کو خوب صورت الفاظ میں سمو دیا گیا ہے۔

سفرنامہ کے نام اور ابواب کے موضوعات سے لگتا ہے کہ یہ سفر صرف سیر و فی الارض کے لیے کیے گئے بالعموم اسفار جیسا ہرگز نہیں تھا۔ گویا پروفیسر نوشابہ صدیقی کا یہ سفر اپنے اجداد کی قبور پر دعا، آثار و باقیات کی زیارت اور اپنے اعزہ سے میل ملاقات کے ساتھ بالخصوص اپنی قومی تاریخ اور جغرافیہ کے جائزے کا سفر بھی تھا۔ اس دوران مصنفہ نے لاشعوری طور پر اپنے اسلاف کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند میں مسلمان قوم اور سرسید احمد خان کی میراث، علی گڑھ کی تاریخ و روایات کو ایک بار پھر قومی جذبے کے ساتھ زندہ الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ سفرنامہ نگار نہایت چابک دستی کے ساتھ بات اور جذبات کو قومی دھارے میں لے کر چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ قومی نقش و نگار کے پس منظر کے طور پر نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے تاباں آبائی ماضی کو

بھی بیان کرنے لگتی ہیں۔ ان کے لیے ایسا کرنا اس لیے آسان ہوا کہ دونوں دراصل ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ یہ سب بیان کرنے میں ان کے جذبے کے سامنے تعمیل کے لیے الفاظ صف بستہ نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک علیگ ہونا دراصل علی گڑھ کے جذبۂ قومی سے وابستہ ہونا ہے جس نے قیام پاکستان کو ممکن بنایا۔ فاضل مصنفہ علی گڑھ اور دیگر تاریخی مقامات اور واقعات کی بعض دستاویزات کو یقیناً پہلی بار منظرِعام پر لائی ہیں۔ یوں یہ سفرنامہ سے کچھ بڑھ کر ہے۔ ہمیں ان دستاویزات کو صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ''کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی'' کی انگریزی اور اردو میں مکمل رپورٹ توجہ طلب ہے۔

ہم حیران تھے کہ 'چشمِ نم' کے نام اور سفرنامہ میں کیا نسبت! مگر اسے پڑھ کر لگا کہ واقعی اپنی روشن تاریخ سے ہمارا اجتماعی اغماض ہمیں چشمِ نم نہیں بلکہ اشک پیازی پر مجبور کر دیتا ہے۔ پیش لفظ 'کہانی میری' میں چشمِ نم کی وجہ تسمیہ ہمارے اندازے کو درست ثابت کر رہی ہے۔ ہم .... بھاگ بھاگ کر اب شاید روہانسے ہو چکے ہیں، مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر ابھی بھی آمادہ نہیں ہیں۔ یہ سفرنامہ کم از کم ہمیں یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے قومی سفر میں منزل کو بار بار دیکھتے بھالتے بھی رہیں۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ سفرنامہ کے اندر علمی و تعلیمی ماحول مسلسل برقرار رہا اور اس میں کہیں بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

پروفیسر نوشابہ صدیقی کا یہ محض ایک سفرنامہ ہی نہیں، بحیثیت پاکستانی اور بھی بہت کچھ ہے، مگر ہم دیکھنے اور سوچنے والے تو بنیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہمارا قومی سفر بھی اپنی اصل منزل کی طرف تیز تر ہو سکتا ہے۔ مصنفہ سفرنامہ میں جُزرسی کا حد درجہ کمال مظاہرہ کرتے ہوئے تمام مقامات کے منظر اور اشیاء کی جزئیات تک کو بآسانی بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ یوں قاری اپنے آپ کو اُسی جگہ ان کے ہم سفر محسوس کرتا ہے۔ شخصیات کا بیان ان کے حسبِ مراتب اور نہایت توقیر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ وہ شخصیات بھی مذہب حتیٰ کہ مسلک کو بس اس حد تک رکھتیں کہ اختلافات کے بجائے محبت، اور دوریوں کے بجائے قربتیں پیدا ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر نوشابہ صدیقی کے دادا مولوی ابوالحسن کے تحریر کردہ نواب محسن الملک، مولانا شیخ حسین عرب اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری کے مابین ہونے والے واقعے کو عمدہ مثال کے طور پر پیش کیا جا

سکتا ہے۔

سفرنامہ کی متعدد جہات اور بھی ہیں مگر ہم نے صرف چند جہات کو بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ہم نے دیگر کو قارئین کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ کس جہت سے اس سفرنامہ کو پرکھنا چاہتے ہیں۔ 270 صفحات پر محیط یہ سفرنامہ ہماری نئی نسل کے مطالعے کے لائق ہے۔ سفرنامہ کی شستہ زبان اور آسان فہم بیان نے اسے قاری کے لیے بیک وقت دلچسپ، معلوماتی اور مفید بنا دیا ہے۔ پڑھیے اور پھر دیکھیے کہ ہماری یہ بات کس حد تک درست ہے! اس کے بعد یقیناً آپ کو پروفیسر نوشابہ صدیقی صاحبہ کی ''افکارِ حسن''، ''چشم حیراں''، ''دلِ شوریدہ''، ''کلامِ اشرف کمالِ حسن''، ''زندگی بھر کی بات''، ''سرِشام''، ''صلیب کے زخم'' جیسی گراں قدر تصانیف، تالیفات اور تخلیقات پڑھنے سے بھی دلچسپی پیدا ہوگی۔

☆☆☆

چشمِ حیراں

تبصرہ: ایاز محمود

☆ ''مجھے آپ کا اندازِ بیان اچھا لگا''۔ یہاں جو کچھ بھی ہے اس کا اظہار خلوص میں گندھا ہوا ہے۔ آپ نے اپنے ممدوحین کے سروں پر نہ تو تقدس کا صافہ باندھنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی عیب جوئی کو اپنا شعار بنایا ہے، یعنی یہ ایک بے جا غلو سے پاک معتدل لہجہ ہے جس میں جذبات کی آمیزش اسے پُرتاثیر بنا دیتی ہے۔ جالبی صاحب، انجم اعظمی، ابراہیم جلیس، شفیع عقیل، حسنین کاظمی اور جمال بھائی کا خاکہ بطورِ خاص پسند آئے۔ عصمت چغتائی پر خاکہ نما مضمون میں تشنگی محسوس ہوئی۔ موصوفہ ایک مرتبہ جامعہ نگر میں ہمارے گھر بھی آئی تھیں۔ میں اسکول کا طالب علم تھا۔ جھکتے ہوئے آٹوگراف بک پر ان کے دستخط لیے۔

(2) (چشمِ نم' سفرنامہ)

بہت تاثراتی تحریر ہے جسے خشک آنکھوں سے پڑھنا کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں تھا۔ فن کی معراج یہ ہے کہ وہ رقتِ قلب پیدا کر دے کہ یہ کیفیت ہمیں انسانیت کی بلندی پر لے جاتی ہے، سو مجھ پر بھی یہ کیفیت طاری ہوئی۔

(3) چشمِ حیراں اور چشمِ نم دونوں اختتام کو پہنچیں اور میری چشم حیران بھی ہوئیں اور غمگین بھی کہ میں ہر پل آپ کے ہم قدم رہا۔ آپ نے اِدھر اُدھر ہونے ہی نہیں دیا۔ یہی احساس رہا کہ میں بھی وہی مناظر دیکھ رہا ہوں، محسوس کر رہا ہوں آپ کے ساتھ۔ یوں ہم نے بھی آپ کے ساتھ ان تمام مقامات کی سیر کی اور تمام بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی بھی کی۔

چشمِ حیراں ہمارے لیے انمول خزانہ ہے۔ ہم نے تو فقط نام سنے تھے ان کے، اور اب محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی سب کو جانتے ہیں اور ان کے ساتھ ہماری بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ بہت خوب نے خوبصورت انداز سے، بہت خوب صورت الفاظ کا استعمال اس خوب صورتی سے کیا ہے کہ

پڑھتے وقت توجہ ادھر اُدھر ہو ہی نہیں سکی۔ جیسے میلے میں کوئی بچہ پوری قوت سے ہاتھ تھام لیتا ہے کہ کہیں بچھڑ نہ جاؤں۔

میں نے آپ کی تحریر پڑھ کر جو ذہن میں آیا فوراً لکھ دیا۔ اتنی خوب صورت تحریر کہ میں ابھی تک اس کے سحر سے خود کو آزاد نہیں کر پایا، اور کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اب میں آرام سے آہستہ آہستہ دوبارہ اسی سفر پر رواں دواں ہوں اور ایک ایک لفظ سے لذت کشید کر رہا ہوں۔"

☆☆☆

یہ خاکے اور خاکے لکھنے والے

تبصرہ: مسعود اشعر

اصل خاکہ نگاری یہ ہے کہ آپ اس شخصیت کو بھی اپنے سامنے چلتا پھرتا دیکھیں جو لکھنے والا آپ کے سامنے لانا چاہتا ہے۔ اوراس کے ساتھ ہی زبان و بیان کے مزے بھی لیں۔ زبان کا یہ تخلیقی استعمال ہی ہے جو آپ کو ان شخصیات کے خاکے پڑھنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے، جنہیں آپ بالکل نہیں جانتے۔ یہ خاکے آپ اس لیے پڑھتے ہیں کہ لکھنے والے یا لکھنے والی کی چٹ پٹی زبان آپ کو وہ خاکہ پڑھنے پر مجبور کر دیتی۔ ایسے ہی خاکوں کا ایک مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا نام ہے" چشم حیراں"۔ اور اس کی لکھنے والی ہیں پروفیسر نوشابہ صدیقی۔ رسالہ" مکالمہ" کے ایڈیٹر مبین مرزا نے ہمیں یہ کتاب بھیجی تو ہم نے اسے سرسری دیکھا اور رکھ دیا۔ ہمیں یاد آئی وہ نظم جو بہت پہلے انگلستان سے چھپنے والے رسالے Encounter میں چھپی تھی۔ یہ اس رسالے کے ایک ایڈیٹر کی طنزیہ نظم تھی۔ نظم میں کہا گیا تھا کہ ایک منٹ میں اتنے پروفیسر پیدا ہوتے ہیں، اور وہ پروفیسر اتنے منٹ میں اتنی نظمیں لکھ لیتے ہیں، اور وہ نظمیں ہمیں شائع کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں (اس رسالے کے ایڈیٹر کو بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ امریکی سی آئی اے اسے مال فراہم کرتی ہے)۔ اس رسالے کے مدیر اعلیٰ تھے اسٹیفن اسپینڈر۔ ہم نے بھی پروفیسر نوشابہ صدیقی کی یہ کتاب دیکھی اور رکھ دی کہ اسے کیا پڑھنا۔ لیکن بیٹھے بیٹھے یونہی اس کے ورق پلٹنا شروع کیے تو پہلے خاکے نے ہی ہمیں پکڑ لیا۔ یہ خاکہ جمیل جالبی کا ہے۔ پڑھنا شروع کیا تو پڑھتے ہی چلے گئے۔ جمیل جالبی، حسن مثنیٰ ندوی، انجم اعظمی، ابراہیم جلیس، شفیع عقیل، جوش ملیح آبادی، مشتاق احمد یوسفی، مصطفیٰ خان، حسنین کاظمی، عصمت چغتائی، سر سلطان آغا خان، مختار مسعود، حسن اختر، انور شعور، نجم الحسن رضوی، طلعت اشارت اور صغیر افراہیم یہاں سب موجود ہیں اور ہم پروفیسر صاحبہ کی نظر سے انہیں دیکھ رہے ہیں ۔ ہم صرف ان شخصیتوں کی قلمی تصویروں سے ہی لطف نہیں لے رہے تھے بلکہ میٹھی میٹھی اور چٹخارے دار زبان کا مزہ بھی لے رہے تھے، بلکہ اچھی زبان پڑھ رہے تھے۔ اور اچھی زبان ہماری کمزوری ہے۔ معلوم

ہوا کہ پروفیسر نوشابہ صدیقی کا تو خاندان ہی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے دادا مولوی ابوالحسن اور والد حسن عبداللہ کا قریبی تعلق علی گڑھ سے تھا۔ یہ تعلق ایم اے او کالج سے ضیاالدین احمد تک پھیلا ہوا تھا۔ مولوی ابوالحسن ایم اے او کالج کے اسسٹنٹ سیکرٹری رہے تھے۔انہوں نے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے ساتھ کام کیا تھا۔ ڈاکٹر ضیاالدین جب وائس چانسلر تھے تو وہ یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکٹو کونسل کے رکن رہے تھے۔ رشید احمد صدیقی نے حسن عبداللہ پر مضمون بھی لکھا ہے۔ یہ مضمون رشید احمد صدیقی کی کتاب" گنج ہائے گراں مایہ" میں شامل ہے۔خاکوں کی اس کتاب میں پروفیسر نوشابہ صدیقی نے سرسید احمد خان کے نام دو خط بھی لکھے ہیں۔ان خطوں میں انہوں نے اپنے خاندان کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں اپنی یادیں بھی لکھی ہیں۔لیکن نوشابہ صدیقی صاحبہ نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے وہ آپ بھی پڑھ لیجیے:انور شعور کے بارے میں خوب لکھا ہے۔

"وہ میرے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔اُن دنوں کم گھروں میں کال بیل ہوا کرتی تھی۔ سوچتی ہوں گھنٹی کی آواز میں وہ اپنائیت کہاں جو دستک میں ہوا کرتی تھی۔دوڑی دوڑی دروازے تک گئی۔تب انور شعور کو کھڑا پایا۔خوشی کی انتہا نہ رہی۔" آجاؤ"۔ میں نے خوشی سے زیادہ جوش کے ساتھ آواز دی۔انور شعور اپنی جگہ کھڑے ہی رہے۔ مجھے اوپر سے نیچے بغور دیکھا، ایسے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں، پھر آنکھیں بند کر لیں اور نظر جھکائے جھکائے کہا غلط آ گیا، معاف کرنا، پھر آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑے اور سیدھے گلی میں چلتے چلے گئے۔اس کی اٹھتی نظریں، اس کی جھکتی نظریں، پھر اعتراف کرنا کہ میں غلط آ گیا، پھر پلٹ جانا، مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔ اس بے ہوشی اور بدحواسی میں بھی اپنی بچپن کی دوست اس کی دوستی، لمبی گزری ہوئی رفاقت کا اس نے کس قدر احترام کیا۔انور شعور تو معصوم سا ایک بچہ ہے۔اس نے اپنا قد ایک دو فٹ اور بلند ضرور کر لیا ہے، لیکن اس کے اندر اب بھی ایک سچا پکا چھوٹا سا بچہ بیٹھا ہوا ہے۔

اب انور شعور کا ایک شعر۔

وہ مجھے ایسے ملا جیسے ملا کوئی نہیں
میں نے پوچھا کون ہے اس نے کہا کوئی نہیں

☆☆☆

چشمِ نم اور چشمِ حیراں

تبصرہ: فرید بھٹہ، فلپائن

لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری کئی بار ڈوبتے ڈوبتے بچے اور پھر چھلانگ لگادی۔ اب اس کے ساتھ ہی کچھ لکھنے کی خواہش بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی، ہم نے سمجھایا بھی کہ ہم کیا ہماری تحریر کیا.... لیکن اولاد اور خواہشات جوان ہو جائیں تو ان کو قابو کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ تحریر انہی بے تاب خواہشات کا شاخسانہ ہے، ورنہ ہمیں اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں، لیکن عقیدت اور محبت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو ایسی کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔

جب ہمیں کتابیں موصول ہوئیں تو ہمارا ذوق شوق، وارفتگی اور کتابوں پر موجود نوشابہ صدیقی کی تصاویر کو دیکھتے ہوئے ہماری ایک عزیزہ نے بڑی پُراسرار مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے یہ سوال داغ دیا، "یہ آپ کی دوست ہیں؟''

ہم نے بھی ویسی ہی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے ایک لمحہ ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا کہ "یہ ہمیں اپنے شاگردوں کی صف میں بھی بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرما دیں تو ہمارے لیے ایک اعزاز ہوگا، دوستی تو بہت دور کی بات ہے۔''

نوشابہ صدیقی خوش شکل، خوش گفتار، خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی خوش لباس بھی ہیں۔ وہ سراپا خوشیوں کا مرقع ہیں۔ ایک جگہ وہ خود لکھتی ہیں کہ "کپڑا خواہ سستا ہی ہو لیکن سلائی اگر ڈھنگ سے ہوئی ہو تو وہ اس کی دیدہ زیبی اور قدر میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے، ورنہ تو بہت قیمتی کپڑا بھی دوکوڑی کا ہو جاتا ہے۔'' ہماری دو ملاقاتیں ہوئیں، ہم نے یہی محسوس کیا جیسے یہ لباس ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ لباس کی تراش خراش ہی اس کو آپ کی شخصیت کا حصہ بنا دیتی ہے، اور یہ حصہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

ان کی شخصیت میں اور بہت سی خوبیاں ہیں ۔ وہ مہمان نواز بھی ہیں۔ کہتی ہیں مجھے کھانا بنانا نہیں آتا۔ ہمیں تو اس کے برعکس ہی دکھائی دیا۔ ویسے بھی بہت لذیذ کھانے کو اگر بے ڈھنگے پن سے پروسا جائے تو وہ بدذائقہ ہو جاتا ہے، کہ آنکھیں ہر حس کو پیغام بھیج دیتی ہیں کہ کچھ خاص نہیں۔ بے دلی سے کھائے جانے والے کھانے میں لذت کہاں سے آئے گی! آپ اس خوبصورتی سے کھانے کی میز کو سجاتی سنوارتی ہیں کہ نہ صبر ہو سکتا ہے نہ ہی اس خوبصورتی سے نگاہیں ہٹتی ہیں، نہ ہی اس ترتیب میں بگاڑ پیدا کرنے کو جی چاہتا ہے، اور کھانے والے اس قدر رغبت اور چاہت سے کھانا کھاتے ہیں کہ کوئی غیر متعلق معمولی آواز بھی ناگوار گزرتی ہے۔

صاحبو! یہ وضاحت یوں ضروری ٹھہری کہ آپ یکسوئی سے اس مضمون کو پڑھ سکیں۔ آپ کی سوچیں ادھر اُدھر بھٹکتی نہ رہیں۔ عین ممکن ہے فرطِ عقیدت و محبت میں ہم کہیں ادھر ایسی باتیں بھی لکھ جائیں جو آپ کی سوچوں کے بہکنے کا سبب بنیں۔ کیونکہ بسا اوقات بے قابو سوچیں قلم کو بھی بے قابو کر دیتی ہیں۔ شوق کی فراوانی سوچنے کی مہلت نہیں دیتی۔

بقول مرزا غالب: غائب سے دماغ میں آنے والے خیالات قلم کی نوک صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتی ہے، اور اس خوبصورتی سے بکھیرتی ہے کہ کسی ایک لفظ کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا دیں تو پورے مضمون کا تانا بانا ہی بکھر جاتا ہے، یہ سمجھنا ہی دشوار ہو جاتا ہے کہ آخر مضمون لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ویسے بھی فی زمانہ غلط قیافے اور اندازے قائم کرنے میں بحیثیت مجموعی کیا تعلیم یافتہ کیا اَن پڑھ، کیا شوخ کیا سنجیدہ، یہاں تک کہ جو لوگ بولنے سوچنے اور لکھنے میں بھی اسراف پسند نہیں کرتے اس مرض میں مبتلا ہیں۔

درست قیافے اور اندازے لگانے میں ہم لوگ ہمیشہ سے اناڑی ہیں اور اس پر ہمیں کوئی تشویش بھی نہیں۔

نوشابہ صدیقی کی تحریر کے سحر سے آزادی ناممکنات میں سے ہے کہ قاری خود بھی آزاد ہونا نہیں چاہتا۔

وہ لفظوں کو اس خوبصورتی اور چابک دستی سے ایک مالا میں پروتی ہیں کہ کوئی لفظ اپنی جگہ سے

ہٹایا نہیں جا سکتا، آنکھ جھپکنا بھی گراں گزرتا ہے۔

ہر جملے میں آپ کا مطالعہ اور مشاہدہ، آپ کی تعلیم اور تربیت بولتی سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔ صاحبو! "چشم نم" ایک سفر نامہ ہے جو اپنے آبا واجداد کی تلاش میں اختیار کرنا پڑا۔ اس میں وہ پڑھنے والوں کو قدم قدم اپنے ساتھ رکھتی ہیں، ان کی آنکھوں کی نمی آپ کی آنکھوں میں اتر آتی ہے، ان کی مسکراہٹ آپ کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کو نہیں خود آپکو تلاش ہے۔

محبتوں، چاہتوں، مسکراہٹوں، اداسیوں کا ایک بے کنار سمندر ہے جس میں وہ زندگی کے کھوئے ہوئے لمحات ڈھونڈ رہی ہیں۔ آپ بھی بے اختیار اس میں کود جاتے ہیں۔ اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ، بچھڑ کر ملنے کی خوشی کیسے انسان کو نڈھال اور پھر مالا مال کرتی ہے، اس کو الفاظ کا جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں۔

حالانکہ ہمارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہجرت کے مصائب کا سامنا کیا، نہ دکھ اٹھائے، نہ بچھڑنے کا غم سہا، مگر "چشم نم" کو پڑھتے ہوئے قاری کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب اسی پر بیت رہی ہے۔ ہماری بھی وہی کیفیت تھی جو کانٹوں اور پھولوں کے اس سفر میں نوشابہ صدیقی کی ہوگی۔

صاحبو! نوشابہ صدیقی کی دوسری کتاب "چشم حیراں" ہے۔ یہ ان کے لکھے خاکوں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ نام تو "چشم حیراں" ہے مگر یہ پڑھنے والوں کو سراپا حیراں کر دیتی ہے، اور یہ ایک بار کی حیرانی نہیں، ورق ورق حیران کرتی ہے۔

خاکے بھی ان کے اس قدر بلند قامت ہیں کہ ان کو دیکھنے کے لیے دستار بھی سنبھالی جا سکتی ہے۔ ایسی ایسی نابغہ روزگار ہستیوں کا ذکر کہ جن سے عقیدت و محبت کے رشتے کبھی ختم نہیں ہو سکتے جو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

ہم نے سوچا تھا کہ تمام نام نہ لکھے جائیں لیکن اس فیصلے پر قائم رہنا بہت جوکھم کا کام ہے اور بددیانتی کے زمرے میں آ سکتا ہے۔

وہ آسمانِ ادب کے ماہتاب و آفتاب جن کی روشنی سے جہانِ ادب جگمگا رہا ہے، جن کی چکا چوند آج بھی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ آج بھی کسی میں اس قدر حوصلہ نہیں کہ وہ ان کی برابری کر

سکے جن کی صحبت و محبت اور رہنمائی نوشابہ صدیقی کو میسر رہی، جن کی روشن فکری نے نوشابہ صدیقی کی زندگی، سوچ اور تحریر کو اس قدر منور و معطر کر دیا ہے کہ وہ انہی کے آس پاس کھڑی دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔

صاحبو با ادب با ملاحظہ، اب ان اساتذہ کے نام آ رہے ہیں "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"۔ ذکر ہے اُن دیدہ وروں کا جن کے دم قدم سے مرغزارِ ادب آج بھی سرسبز و شاداب ہیں اور ان کے کھلائے ہوئے پھولوں کی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

جالبی صاحب، حسن مثنیٰ ندوی، نصیر صاحب، انجم اعظمی، ابراہیم جلیس۔ کیا آپ ابراہیم جلیس کو ڈانٹنے کا سوچ بھی سکتے ہیں؟ نوشابہ صدیقی کا ایک اعزاز یہ بھی ہے۔ انہوں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا، جس بھول پر انہیں ڈانٹ پڑی تھی وہ دوبارہ نہ کرنے کا عہد کیا۔

بڑے لوگوں کے کام اور رویے انہیں بڑا بناتے ہیں۔ شفیع عقیل، جوش ملیح آبادی، مصطفی خان صاحب، حسنین کاظمی، مشتاق یوسفی، عصمت چغتائی۔ سر سلطان آغا خان کے بارے میں کچھ لکھنا، پھر اس محفل میں سنانا جہاں جہانِ ادب کے ہیروں کی چکا چوند سے آنکھیں چندھیا رہی ہوں، کوئی آسان کام ہے؟ مختار مسعود، حسن اختر، انور شعور، نجم الحسن رضوی، طلعت اشارت، عاشقین، حسین امیر، صغیر افراہیم... یہ ایسے نام ہیں اردو ادب میں جن کا ایک حوالہ ہے اور ہمیشہ رہیں گے۔ سر سید کے بارے میں بھی لکھا۔ نوشابہ صدیقی کی وابستگی علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈھکی چھپی نہیں، بے شک انہوں نے وہاں تعلیم حاصل نہیں کی لیکن علیگ انہیں بھی علیگ ہی مانتے ہیں۔ جامعہ کراچی کے بارے میں لکھا تو پوری یونیورسٹی سامنے لا کھڑی کی۔ جنھیں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا وہ بھی محسوس کریں گے ہم نے دیکھی ہے۔

نوشابہ صدیقی کہانی میں زیادہ موڑ نہیں مڑتیں لیکن جہاں مڑتی ہیں ایک دم پہاڑی راستوں کی مانند مڑ جاتی ہیں، قاری خوف زدہ بھی ہوتا ہے پیچھے رہنا بھی نہیں چاہتا۔

وہ اونچے نیچے، ٹیڑھے میڑھے راستوں پر بے خطر بھی آہستہ خرامی سے، تو کبھی بگٹٹ بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ خوبی یہ کہ قاری کو پیچھے نہیں چھوڑتیں اسکا ہاتھ تھامے رکھتی ہیں۔ جہاں وہ مسکراتی ہیں، قاری قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جہاں ان کی آنکھوں میں نمی اترتی ہے، قاری دھاڑیں

مار مار کر رو دیتا ہے۔ یہ تحریر کا حسنِ اثر اور سحر ہے جس سے آپ نہ تو نکل پاتے ہیں نہ نکلنا چاہتے ہیں۔ ایسی دل پذیری بہت کم تحریروں کا نصیب بنتی ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن لفظوں کے رنگ اور مہک سے آپ آزاد نہیں ہو پاتے سوچوں کی پرواز چاروں طرف جاری رہتی ہے۔

صاحبو! یقین جانیے کہ ہمیں پہلی بار یہ ادراک ہوا کہ خاکہ نگاری دراصل ہے کیا۔ نوشابہ کے سامنے الفاظ ہاتھ باندھے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں، ہمیں الفاظ کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری تحریر میں وہ اثر پزیری یا خوشنمائی نہیں۔ ہم کسی اور راہ پر چل رہے ہوتے ہیں تو قاری دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

بہر حال ہم طالب علم ٹھہرے، اساتذہ سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں۔ نوشابہ صدیقی کو ہم نے استاد کی طرح پڑھا اور جب سنا تو یوں ہی سنا بھی۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم نے بہت کچھ سیکھا جو آیندہ ہمارے کام آسکے۔ ان کا ایک مضمون "میری اماں" ہمیں اپنی اماں کی یاد دلا گیا۔ دو اپنی اماں کا تذکرہ کرتی رہیں، ہم اپنی اماں کی انگلی تھامے ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ شاید وہ بھی لکھتے وقت روئی ہوں گی، ہمارے آنسو بھی خشک نہ ہوئے۔ اور اب جبکہ ہم یہ کتاب پڑھ چکے، یوں محسوس ہو رہا ہے ہم ان تمام ہستیوں سے مل بھی چکے ہیں۔

تحریر میں کسی کو کیسے زندہ کر دیتے ہیں یہ ہنر نوشابہ صدیقی کے پاس ہے۔

میرے ہاتھ میں ہے صبحوں کی عنان گلگوں
مری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری

☆☆☆

چشمِ نم

تبصرہ: انور سن رائے

مصنفہ: نوشابہ صدیقی

صفحات: 272

قیمت: 500 روپے

ناشر: رب پبلشرز، 10 مہر ٹیرس، اسٹریٹ 6، برنس روڈ، کراچی

نوشابہ صدیقی کی اس سے پہلے کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں خاکوں اور مضامین کی دو کتابیں اور دو ناول شامل ہیں، جبکہ دو کتابیں انہوں نے مرتب کی ہیں۔ مجھے اس سے پہلے ان کی کوئی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن یہ کتاب ان خوابوں کی تکمیل کا بیان ہے جنہیں وہ فرائضِ زندگی کے تقاضوں کے نیچے دباتی اور ملتوی کرتی چلی گئی تھیں۔ یہ ایک لحاظ سے سفر نامہ بھی ہے اور ماضی کو تازہ کرنے کی کوشش بھی۔ کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے لیکن ہر حصے میں آباء و اجداد کی یادوں کو زندہ حقیقت کے طور پر محسوس کرنے کی شدید خواہش ہے۔ وہ لوگ جن کے حافظوں میں غیر منقسم ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے کی کچھ یادیں محفوظ ہیں، وہ تو نوشابہ صدیقی کی اُس کیفیت کو محسوس کریں گے جوان گھروں اور مقامات کو دیکھ کر ہوئی ہوگی جہاں ان کے والدین اور ان کے آباء رہتے تھے، لیکن وہ جو اس تقسیم میں تقسیم نہیں ہوئے، وہ بھی اس کشاکش کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس کی وجہ اُن کا اندازِ تحریر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب جب آپ شروع کریں گے تو پڑھ کر ہی چھوڑیں گے۔

روزنامہ جنگ

☆☆☆

دلِ شوریدہ

تبصرہ: انواراحمد زئی

جنوری ۲۰۱۵ء، روزنامہ جسارت

مصنف:	پروفیسر حسنین کاظمی
مرتب:	نوشابہ صدیقی
قیمت:	سات سو روپے
صفحات:	۵۸۴
موضوع:	پاکستانیت اور ادب

پروفیسر حسنین کاظمی ان چیدہ، چیدہ اساتذہ میں تھے جن کو وضع داری، رواداری، پاسداری اور دلداری کے حوالے سے تو نمائندہ کہا ہی جا سکتا ہے مگر فکر و فن، خلاقی، ادب دوستی اور ادب پروری کے تعلق سے بھی ان کا سامنا کم از کم آج تو مشکل ہے۔ اپنی اپنی جگہ عمومی طور پر آج اساتذہ بھی بیوروکریسی کے کارندوں کی طرح اپنی تنخواہ اور مشاہرے میں زیادہ دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں، جبکہ پروفیسر حسنین کاظمی جیسے اساتذہ اپنی تنخواہ کو اعزازیہ سمجھ کر تدریس کے میدان میں اپنے امتیاز ہی کو اعزاز سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال، پاکستان، جناح اور اردو، ان کی چاہتوں کے حوالے اور استعارے ہیں۔ انہوں نے جو کالج قائم کیا وہ بھی علامہ اقبال ہی کے نام سے منسوب ہے۔

پروفیسر حسنین کاظمی بے مثال استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب، ناقد، انشاپرداز اور صاحبِ اسلوب کالم نگار بھی تھے۔ "دلِ شوریدہ" ان کے ان ہی مضامین کا مجموعہ ہے جو معاصر روزنامے میں شائع ہوتے رہے۔ مضامین کی تعداد 100 ہے جبکہ ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ ادبی، سیاسی، اقتصادی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور سائنسی شعبہ جات سے متعلق ان مضامین میں

پروفیسر حسنین کاظمی کے مطالعے، مشاہدے، فلسفے اور آدرش کے ایسے نکات سامنے آتے ہیں جن کی روشنی میں ایک سچے پاکستانی کی تصویر بنائی جاسکتی ہے۔ ان مضامین میں ڈاکٹر محمود حسین پر جو مضمون ہے اسے خاصے کی چیز کہا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر محمود حسین کے توسط سے سماجی تاریخ اور علمی تصویر مرتب کی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین، پروفیسر حسنین کاظمی کے آئیڈیل تھے اور وہ ان کی تقلید میں ان کی تصویر بننا چاہتے تھے۔

ان مضامین کی ترتیب وتدوین نوشابہ صدیقی نے کی ہے جو خود کو ڈاکٹر صاحب کی شاگرد، ساتھی، دوست اور بیٹی کہتی ہیں۔ ان کا ڈاکٹر صاحب سے پچاس برس کا رشتہ رہا۔ وہ ان کی طالب علم بھی رہیں، پھر بہت کم سنی میں ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ کالج میں پرنسپل ہوگئیں اور وہیں سے ریٹائر ہوئیں مگر ہر مرحلے میں اپنا تعلق اس آئیڈیل شخصیت سے قائم رکھا۔

نوشابہ صدیقی خود ایک صحافی، استاد، ناول نگار، خاکہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ ان کا ناول "صلیب کے زخم" تو وہ ناول ہے جسے جید نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے کئی نشستوں میں خود مصنفہ کی زبانی ان کے گھر میں زمین پر بیٹھ کر سنا اور داد دی۔ اسی طرح ان کے خاکوں کی کتاب "سرشام" میں مشفق خواجہ کا خاکہ بجائے خود خاکہ نگاری کی تعریف اور معیار دونوں کی دلیل ہے۔ ان کے ناولوں میں "زندگی بھر کی بات" کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ نوشابہ بنیادی طور پر کہانی کار ہیں۔ ایسی کہانی کار جس کی دنیا کہانی بننے ہی تک محدود ہے۔ اس لیے ان کے سامنے ہر فرد ان کی کہانی کا کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اچھا اور برا.... اور وہ اس فرد کو اسی طرح برتتی اور سمجھتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے پروفیسر حسنین کاظمی کو بھی زندگی آموز ناول کے کردار کے بطور سمجھا اور ان کے کالموں کو افکار جلیلہ سمجھ کر بڑی مشکل سے جمع کیا، اور پھر ہر عہد کے طالب علم سے لے کر ہر عمر کے پاکستانی کے لیئے "دلِ شوریدہ" بناڈالا۔

اس کتاب کے تذکرے میں دو خاموش کردار پردے کے پیچھے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کے نام چُھپے ہوئے اور کارنامے چُھپے ہوئے سے لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک نام پروفیسر حسنین کاظمی کی باکمال مگر کم گو بیگم فرحت کاظمی کا ہے، اور دوسرا نام نوشابہ صدیقی کے شوہر نثار صاحب کا ہے۔ فرحت کاظمی نے یہ مضامین سنبھال کر رکھے جن کا کھوج لگایا تو نوشابہ نے، مگر نثار

صاحب ہر جگہ، ہر مقام پر، ہر ادبی مجلس اور شعری محفل میں نوشابہ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت میں بھی ان کے ہم قدم اور ہم سفر ہے۔ شریکِ سفر ایسے ہوں تو زندگی کا سفر بھی آسان ہو جاتا ہے۔ کتاب میں چند یادگار تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جن کے توسل سے پروفیسر حسنین کاظمی کی سیرت کے ساتھ صورت اور شخصیت کا بھی پتا چلتا ہے۔

☆☆☆

چشمِ نم

تبصرہ فیصل عظیم، کینیڈا

کراچی کے علامہ اقبال گرلز کالج کی سابق پرنسپل اور آج کل سرسید یونیورسٹی اور ڈاکٹر جمیل جالبی لائبریری سے منسلک متحرک اور خوش گفتار شخصیت کی مالک، نہایت قابل علمی گھرانے سے تعلق رکھنے والی نوشابہ صدیقی صاحبہ ان کی مرحوم بہن بیگم دردانہ جلیل اور بہنوئی کرنل جلیل (جو سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش میں اسیر بھی رہے) کا میرے والدین سے ایک قلبی تعلق رہا ہے۔ کرنل جلیل اور بیگم جلیل، یہ دو نام تو گویا ہمارے بچپن کے رومان کا حصہ ہیں۔ پروفیسر نوشابہ صدیقی مدرّس، ماہرِ تعلیم، ادب پرور، ادیب پرور، ناول نگار، خاکہ نگار اور مضمون نویس ہونے کے علاوہ دلی سے دل تک کے سفرنامے کی خالق بھی ہیں اور اس کا عنوان ہے "چشمِ نم"۔

"چشمِ نم" ہندوستان کا زمینی نہیں، زمانی سفرنامہ ہے جو اس کی سرزمین یا جغرافیے سے زیادہ وہاں کی گمشدہ اور ہجر زدہ تہذیب اور تاریخ کے سفر کا احوال ہے۔ یہ مناظر اور سفری جزئیات کے بجائے تاثرات اور جذباتی واقعات پر مبنی ہے۔ اس میں آپ کو تاج محل یا آگرہ، دلی یا علی گڑھ کی منظر کشی پر اتنا زور نہیں ملے گا، کیونکہ نوشابہ صاحبہ کی توجہ کا مرکز اور دلچسپی تو ان جگہوں اور ان سے جڑی یادوں اور باتوں سے ہے جو سینہ بہ سینہ ان تک منتقل ہوتی رہیں اور جن کا تعلق ان کے آبا وَاجداد سے ہے۔ اسی لیے وہ عمارتوں کے جسموں کے بجائے ان کی روح میں سفر کر رہی ہیں۔ یعنی یہ بیک وقت ہندوستان کا سفرنامہ بھی ہے اور یادوں میں بسی اندر کی دنیا کا سفرنامہ بھی۔

اس سفر کی اصل محرک مصنفہ کی وہ تشنگی تھی جو بچپن کی یتیمی نے پیدا کی۔ پھر بچپن کی ہجرت اور نتیجتاً آبائی زمین، تاریخ، یادگاریں، کارناموں کے نقوش، جانے کیا کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آجانے سے وہ خلا اور بڑھ گیا جسے پُر کرنے کا خواب انھوں نے عمر بھر دیکھا اور بالآخر اولاد کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے بعد وہ اس خلا کو پُر کرنے نکل پڑیں۔ تلاش کے اس سفر میں

ان کی پہلی دلچسپی اپنے والد کی آخری آرام گاہ اوران سے جڑی یادگاریں تھیں۔اس لیے آگرہ کے سینٹ جونس کالج کے پروفیسر الیگزینڈر لال نے کہا کہ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ان یادوں کو جمع کرنے یہاں آئی ہیں جو آپ کی نہیں آپ کے والد کی ہیں۔

اس تصنیف کا اسلوبِ نگارش جذبات سے لبریز ہے۔ یہ فکر، دل اوراحساسات کا سفر ہے۔ اس میں الفاظ ایسے ٹانکے گئے ہیں کہ ناول نگار کی تخلیقیت جھلک جھلک اٹھتی ہے۔اس سفر کے دوران وہ اپنے والد کے انتقال کا غم بھی تازہ کرتی رہیں اور والد سے شکوہ بھی کرتی رہیں کہ وہ انھیں اتنی جلدی کیوں چھوڑ گئے۔ یہ ایسا شکوہ ہے جو ایک بچی ساری عمر سنبھال کر رکھتی ہے۔ یوں ہمیں اس تحریر میں ایک کیتھارسس بھی نظر آیا جوان جگہوں کو دیکھ کر اور چھوکر کیا گیا ہے جہاں ان کے والد رہے، گئے، بیٹھتے رہے، پڑھتے رہے یا پڑھاتے رہے۔خودکلامی سے عبارت اس دل گداز تحریر میں مصنفہ کی شخصیت کا جذباتی رخ بھی سامنے آتا ہے جس میں آنسوؤں کا ایک مسلسل بہاؤ ہے۔ وہ علی گڑھ سے اعظم گڑھ تک ریل کے سفر کے دوران لکھتی ہیں مگر کسی ماہر نے آج تک انسانی ڈھانچے پر ریسرچ کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ اس کا نام کیا تھا؟ اس نے کیسی زندگی گزاری؟اس کا دل کیسے کیسے دھڑکا؟اس کے ذہن میں خوشی اورغم کی کتنی کہانیاں رقم ہیں؟''

اس سفرنامے میں دلچسپی کا دوسرا محوران کی اپنی جنم بھومی اور وہاں کے علم وادب کا تاریخی پس منظراوراادارے ہیں۔ یہ ان کی یادیں بھی ماضی کی وہ جگہیں ہیں جن سے ان کی جذباتی وابستگی بھی ہے۔ یہ اُس سلسلے کی تلاش ہے جو غیر فطری طور پر ٹوٹ گیا تھا، اور جسے وہ جوڑنا چاہتی تھیں۔ یہ ماضی پرستی نہیں، اور ہو بھی کیسے کہ انھوں نے تو ایک بھرپور متحرک زندگی گزاری ہے اور آج بھی علمی اور تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مشاعرے اور دیگر ادبی محفلوں کے انعقاد کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی لائبریری کے لیے ان کی خدمات اس کا ثبوت ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے پیچھے مڑکر دیکھنے کے لیے حال پہ کوئی سودے بازی نہیں کی۔ سو یہ ماضی پرستی نہیں، اس کی بازیافت ہے اور تاریخ کا جیتا جاگتا مطالعہ بلکہ اچھی خاصی تاریخ نویسی ہے۔اور تاریخ دان مفکر و محقق تو ہوتا ہے ماضی پرست نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ والد کے انتقال اور پھر ہجرت کے باعث ان کی زندگی میں گھڑی کی سوئیاں کہیں

رک گئی تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی وقت کی اس ٹوٹی ڈور کا سرا ڈھونڈنے کے خواب دیکھے تھے اور اب جا کے وہ اس ڈوری کے سروں کو باندھ سکی ہیں۔ ان کی یادیں اپنے والد، دادا اور بزرگوں کی گراں مایہ خدمات کے گرد گھوم رہی ہیں۔ والد کو انھوں نے پورا ہوش سنبھالنے کے بعد نہیں دیکھا تھا جن کے انتقال کے وقت وہ صرف دو سال کی تھیں۔ سو ان کے پاس زیادہ تر وہ یادیں ہیں جو سنی ہوئی ہیں۔

مگر اس کتاب میں صرف باتیں اور یادیں نہیں ہیں بلکہ دستاویزات اور تصویریں بھی ہیں جن کے لیے کتاب کے چار حصے مخصوص کیے گئے ہیں۔ ان میں خطوط ہیں (اصل اور نقل دونوں)، ان کے بزرگوں کا کلام ہے اور اُس زمانے کی کچھ تحریریں اور مضامین ہیں۔ مگر ان کے خیالات کی اسکرین پر ابا کے سوا اور کوئی بھی مہمان کردار سے زیادہ جگہ نہیں لے پاتا، ہاں ان کے دادا اور دادا کے بھائی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ کتاب ان کے خاندانی پس منظر کا بہت عمدہ احاطہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ کس شاندار ماضی کی امین ہیں اور کیسے قابلِ فخر اجداد کی قابلیت اور روایات کی محافظ ہیں۔

ہجرت اور آبا کے شاندار ماضی سے کٹ جانے کا دکھ ان کے شعور کا ہے جس کا بھرپور اظہار یہ، یہ کتاب ہے۔ مگر اس میں انھوں نے بعض دیگر بزرگوں کا ذکر اور تحریریں بھی شامل کی ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب ان کی خاندانی تاریخ کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں اور زعما کی تاریخی دستاویزات کا حصہ بننے کے لائق بھی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ وہ اپنے آبا کے کام دیکھ کر فخر اور دکھ کے ساتھ بار بار جوابِ شکوہ کا مصرع دہراتی ہیں" تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو" جو ہمارے لیے بھی سبق بلکہ ترغیب ہے کہ آبا کی جانشینی کے حق دار کہلانا چاہتے ہو تو آج کی دنیا میں کچھ کر کے دکھاؤ۔

قصہ مختصر! ذاتی تعلق، والد کی محبت، عقیدت، تجسس اور شوق بلکہ سر میں سمائے سودے نے لگن اور قوتِ ارادی کے بل پر ان سے اس سفر اور سفر نامے کی شکل میں ایک بڑا کام کروا دیا ہے۔ رہی بات ذات کے سفر کی، تو ایک باب تھا جو بند ہونا تھا سو اس سفر میں وہ باب بند ہو گیا بلکہ مکمل ہو گیا۔

☆☆☆

صلیب کے زخم (ناول)

تبصرہ: فیصل عظیم۔ (کینڈا)

نوشابہ صاحبہ کی تحریر بھی ان کی گفتگو کی طرح دلکش ہوتی ہے۔ ان کا ناول "صلیب کے زخم" پہلی بار 1973 میں شائع ہوا تھا، دوسری اشاعت 2011 کی ہے۔ اس کی کہانی بڑے اسکرین کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتی ہے لیکن یہ اس کے لیے نہ لکھی گئی ہے، اور نہ ان عمومی کہانیوں جیسی ہے۔ کہانی کی رفتار بہت مناسب ہے جس میں ٹھہراؤ یا جمود نہیں۔ یہ اپنے اندر بہت سے دل اور جہان لیے ہوئے ہے، جس میں لطافت کے ساتھ ساتھ سوچنے کی دعوت بھی ملتی ہے اور پھر اس پر مجنوں گورکھپوری صاحب کا مضمون بجائے خود ایک سند ہے۔ پیش لفظ اور مضمون پڑھنے کے بعد تجسس اور نامعلوم کا مزہ لینے کی خواہش نے کہا کہ غلطی ہوگئی ناول پہلے پڑھتے اور مضامین بعد میں تو بہتر ہوتا کیونکہ مضمون میں کہانی کے اختتام کا ذکر ہے۔ مگر شکر ہے کہ مضمون میں انجام پوری طرح کھولا نہیں گیا اور نہ ہی میں یہ کام کروں گا۔ ایک لطیفہ ہے کہ سینما میں کسی کو بات کرنے پہ ٹوکا گیا تو اس نے پلٹ کر کہا مجھے ٹوکا تو فلم کا اختتام بتادوں گا کیوں کہ میری دیکھی ہوئی ہے"۔ سو آپ بے فکر ہو کر پورا پڑھ جائیں۔

یہ ایک انگریز عیسائی نرس سلینا کی کہانی ہے جس کا پلاٹ اس کی ایک مسلمان لڑکے سے جذباتی قربت پر مبنی ہے، جو اس کا مریض ہے۔ لیکن اس کی پرتوں میں جو ذیلی کہانیاں ہیں، ان میں نرس کے بچپن کے واقعات کے علاوہ جو بات زیادہ اہم ہے وہ اس گھر کے سربراہ اطہر کی شفقت ہے جہاں وہ مرکزی کردار انور کی دیکھ بھال کرنے آتی ہے باوجود اس کے کہ اصل کہانی چھوٹے بھائی انور کے گرد گھوم رہی ہے، اس میں سلینا کے بعد اطہر کے کردار کی اہمیت کبھی کبھی انور سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ جو کہانی میں کم کم آتا ہے اور اس میں نرس کو اپنے لیے بڑا بھائی اور باپ دکھائی دیتا ہے۔ سلینا کی زندگی اکیلے پن سے عبارت ہے جو اپنی نسل، پیشے اور مذہب کی لاج اور

اعتیار کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہے، جبھی وہ کہتی ہے کہ "مجھے مغرب کا مقدمہ لڑنا تھا۔" مسلمان (شاید پاکستانی) باپ اور انگریز ماں کی مغرب کی پروردہ لڑکی جو مشرقی دیس میں نوکری کے لیے آئی ہے، اس کی شرم بالکل مشرقی ہے۔ باہر سے انگریز مگر اپنے اندر مرحوم باپ کی مشرقیت سنبھالے، رشتوں کو ترسی ہوئی، محبت کے ہر تعلق میں رشتے ڈھونڈتی نظر آتی ہے۔ سلینا دراصل اپنے باپ اور اس کے ماضی کی تلاش میں کہیں کھوئی ہوئی ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ اس میں ہمیں مصنفہ کے لاشعور کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ سلینا بھی مصنفہ کی طرح بچپن میں ہی اپنے والد کے سائے سے محروم ہوگئی تھی چنانچہ باپ کی تلاش اس کے شعور اور لاشعور دونوں کا مستقل حصہ ہے۔

مگر ہم ایک بات سے بہت سہولت سے گزر جاتے ہیں۔ ناول کے ہیرو کی زندگی کا وہ واقعہ جس نے سب کرداروں کو اکٹھا کیا، وہ ایک اور انگریز لڑکی کی، محبت کے جھانسے میں وقت گزاری اور بے وفائی تھی مگر غور کریں تو یہ جنسی استحصال کی کہانی بھی ہے کیونکہ لڑکے اور لڑکی کی جگہیں بدل دیں تو وہی واقعہ جنسی زیادتی کہلائے۔ جیسے ایک فلم میں ماتحت مرد اپنی افسر عورت پہ جنسی استحصال کا مقدمہ کرتا ہے تو وکیل کی دلیل ہوتی ہے کہ جنسی ہراسگی کی بنیاد صنف نہیں، طاقت ہوتی ہے۔ میری نظر میں یہاں بھی ایسا ہی ہے جو ناول کی دو بڑی کہانیوں میں سے ایک کی بنیاد ہے۔

دل سے لکھی یہ کہانی احساس کو مہمیز دیتی ہے اور ایک مخصوص رفتار سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے جو مجنوں صاحب جیسے جید عالم اور زمانہ شناس کو بھی اپنی رو میں بہا لے گئی۔ نوشابہ صدیقی کا اندازِ تحریر پُراثر ہے اور ان کے الفاظ جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی منظر نگاری اور حسن و فطرت کی تصویر کشی بھی بہت خوبصورت ہے۔ وہ رومانی مشرقی جذبے کی تشکیل بہت سلیقے سے کرتی ہیں، جیسے رومانی واردات اور سلینا کے خوبصورت پیروں کی منظر کشی، یا جیسے وہ مشرقی لڑکیوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ "کاجل کے ڈورے کے ساتھ ساتھ حیا کی پتلی سی لکیر بھی ہوتی ہے۔" ایک جگہ بیداری، اونگھ اور نیند کے بین بین ایک کیفیت کا ذکر اتنی عمدگی سے کیا گیا ہے کہ میرا ذاتی تجربہ اس میں سمٹ آیا جو کبھی کبھی نیند میں عجیب مدوجزر میں لے جاتا ہے اور حقیقت اور خواب کا فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہسپتال کا تکلیف دہ نقشہ کھینچنا اور نجمہ کا سلینا کو دکھی دیکھ کر محبت سے بات کرنا، احساس کو چھیڑے بغیر نہیں رہتا۔ سولھواں باب تو قاری کو جذباتی

طور پر پوری طرح باندھ لیتا ہے۔اس پوری کہانی میں ایک ضمنی کردار جو نہ ہوتا تو بہت سے مسئلے حل ہوجاتے ، وہ ہے سلینا کے منگیتر ڈیوڈ کا،مگر تا دیر ناپسندیدہ رہنے والے اس کردار سے چوبیسویں باب میں اچانک ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے۔اس ناول میں کبھی کبھی کچھ ایسے نفسیاتی پہلو بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں جو میری گرفت میں نہیں آرہے،ممکن ہے میرا وہم ہو،واللہ اعلم۔

اس ناول میں مشرق کا رومان کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔مغرب کے بارے میں یہ جملہ جہاں مائیں اپنی ہی اولاد کو بھول جاتی ہیں،غلط نہیں ہے۔حالانکہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں،مگر یہاں کے نظام نے بچوں کو والدین سے جو قانونی آزادی دے دی ہے،وہ اپنے معاشرے کے پیر پہ کلہاڑی مارنے سے کم نہیں۔بہت سے گورے خاندانوں میں ایسا نہ ہونے کے باوجود میں نے یہاں جتنے خاندانوں میں یہ سب دیکھا ہے وہ عبرتناک ہے۔اوراب جب میں یہی ہوا مشرق میں چلتی دیکھتا ہوں تو بقول شبنم رومانی صاحب "کل جو ہوگا وہ سمجھنا کوئی دشوار نہیں"۔یہاں رہتے ہوئے جن باتوں نے مجھے بہت زیادہ حیران کیا وہ بہت سی ماؤں کے اولاد سے تعلقات اور ایک دوسرے کے لیے ان کے رویئے،جذبات اور خیالات ہیں۔مگر اس ناول میں آگے چل کر بجا طور پہ کہا گیا ہے کہ "اچھائی کسی ایک معاشرے کی میراث نہیں"۔اور یہ جملہ ناول میں آنا ضروری تھا کیونکہ یہ بھی ہم مغرب میں جابجا دیکھتے ہیں اور اکثر اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ لوگ اچھائی کو کتنا محدود سمجھ لیتے ہیں۔آخر میں سلینا کے ایک جگہ حضرت عیسیٰ کے مصلوب نہ ہونے کے بارے میں خیالات سے متعلق یہ ضرور کہوں گا کہ حضرت عیسیٰ کو مصلوب ہونے سے پہلے زندہ اٹھا لینے کا عقیدہ مسلمانوں کا ہے عیسائی تو ان کے مصلوب ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔بہر حال ناول بہت دلچسپ ہے،موقع ملے تو ضرور پڑھیں۔حصول کا آسان نسخہ یہ کہ آپ کراچی میں پروفیسر توشابہ صدیقی صاحبہ سے ڈاکٹر جمیل جالبی لائبریری (جامعہ کراچی) میں رابطہ کر کے یہ ناول حاصل کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

چشمِ نم

تبصرہ: ریاض الرحمٰن شیروانی۔علی گڑھ

کتاب: چشمِ نم
مصنفہ: نوشابہ صدیقی
ضخامت: ۱۷۰ صفحات
سالِ اشاعت: ۲۰۱۵
قیمت: ۵۰۰ روپے
پبلشرز: رب پبلشرز، ۱۰ امہر ٹیرس۔۶ برنس روڈ کراچی
مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی

محترمہ نوشابہ صدیقی کا قدیم وطن غازی پور ہے۔ان کے دادا مولوی ابوالحسن اور والد حسن عبد اللہ کا علی گڑھ سے قریبی تعلق رہا تھا جو ایم اے او کالج سے علی گڑھ یونیورسٹی کے دورِ ضیا الدین احمد تک پھیلا ہوا تھا۔مولوی ابوالحسن ایم اے او کالج کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے تھے اور نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب محمد اسحاق خاں، نواب سر مزمل اللہ خاں شیروانی سب کے ساتھ کام کیا تھا اور ان کی خوشنودی حاصل کی تھی۔ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی وائس چانسلری میں وہ یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے۔نواب صدر یار جنگ سے ان کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ وہ جب علی گڑھ آتے تو ہمیشہ ان کے مستقر حبیب منزل میں قیام کرتے۔حسن عبد اللہ صاحب نے مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔وہ مولانا سید سلیمان اشرف کے درس قرآن میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔مولانا سلیمان اشرف اور پروفیسر رشید احمد صدیقی دونوں انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔رشید صاحب نے ان پر مضمون بھی لکھا تھا جو "گنج ہائے گراں مایہ" میں شامل ہے۔وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسٹیورڈ (پراپرٹی آفیسر) ہو گئے تھے۔وہیں

1946ء میں چالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی تدفین مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں ہوئی۔ وہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے لیکن ان کے والد (مولوی ابوالحسن) نے یہ صدمہ جس صبر و استقامت سے برداشت کیا وہ ایک سچے مومن کی نشان دہی کرتا تھا۔ حسن عبداللہ صاحب کے انتقال کے وقت نوشابہ صدیقی صاحبہ کی عمر صرف دو سال تھی، لیکن وہ باپ کی کمی ہمیشہ اس حد تک محسوس کرتی رہیں کہ وہ ان کی زندگی کا ایک بڑا جزو بن گیا۔ غازی پور کا ذکر آیا ہے تو یہ عرض کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ اس نے مسلم یونیورسٹی کو تین ممتاز وائس چانسلر دیے ہیں: سر شاہ محمد سلیمان، پروفیسر عبدالعلیم جو مولوی ابوالحسن کے بھتیجے ہوتے تھے، اور موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند عزت مآب محمد حامد انصاری۔ غازی پوریوں بھی مردم خیز خطہ ہے۔ اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ انصاری کے نام کافی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد نہ معلوم مولوی ابوالحسن کن وجوہ سے کراچی منتقل ہو گئے۔ نہ غازی پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، نہ ابوالحسن صاحب سیاسی آدمی تھے، اور نہ ان کی عمر ایسی تھی کہ وہاں جا کر انھیں جاہ و منصب کی خواہش ہوتی۔ نوشابہ صدیقی صاحبہ نے زیر تبصرہ کتاب میں اس کی توجیہ یہ کہہ کر کی ہے کہ وہ ہجرت پر مامور تھے، مجبور نہیں ممکن ہے اس کی بشارت انھیں خواب میں ہوئی ہو۔ اُس وقت نوشابہ صدیقی بچی تھیں۔ اس لیے ان کی پرورش اور تعلیم کراچی ہی میں ہوئی اور انھوں نے باقی زندگی وہیں بسر کی اور کر رہی ہیں۔ وہ معاشیات کی استاد رہیں۔ کراچی یونیورسٹی میں ان کے استاد پروفیسر احسان رشید صدیقی بھی تھے۔ انھوں نے زیر تبصرہ کتاب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ احسان رشید صاحب سے کہا تھا کہ آپ کے والد میرے والد کے استاد رہے تھے، اور آپ میرے استاد رہے۔

نوشابہ صدیقی صاحبہ نے تعلیم حاصل کی، معلم رہیں، شادی ہوئی، خانہ داری کے فرائض انجام دیے، بچوں کی پرورش و پرداخت کی، سماجی اور علمی و ادبی کام کیے لیکن اپنے دادا اور والد کی سرزمین کو بھی نہیں بھولیں۔ غازی پور اور وہاں کے اعزہ کے ساتھ دلی تعلق تو رہا ہی لیکن سب سے زیادہ ان کے خیالات میں وہ مقامات ہی رہے جن سے ان کے والد کا تعلق رہا تھا اور ان میں سرفہرست علی گڑھ تھا، کیوں کہ یہاں ان کے والد نے تعلیم ہی نہیں پائی تھی اور ملازمت ہی نہیں کی

تھی، بلکہ یہاں ان کی قبر بھی تھی۔

زیر تبصرہ کتاب (چشم نم) محترمہ نوشابہ صدیقی کا ہندوستان کا سفرنامہ ہے۔ ہمارے خیال سے اس کا دوسرا نام" باپ کی تلاش'' بھی ہوسکتا ہے، کیوں کہ ان کے اس سفر کا حاوی جذبہ یہی تھا۔ یہ 2014ء میں اُس وقت ہوا جب وہ دنیا کے دھندوں سے فارغ ہوچکی تھیں۔ انھوں نے خود لکھا ہے" دوسروں کے لیے جینے کا وقت ختم ہوگیا۔ اب میں اپنے لیے جینے نکل پڑوں گی۔'' اور ان کے نزدیک اپنے لیے جینے کا مطلب تھا اپنے باپ دادا سے وابستہ مقامات کی زیارت۔ وہ 60 سال کے بعد ہندوستان آ رہی تھیں۔

انھیں ویزا تین مہینے کا ملا تھا لیکن انھوں نے ہوائی جہاز کا واپسی کا ٹکٹ 15 دن ہی کا لے لیا، کیوں کہ" وہاں بھلا کون میرا منتظر ہے لیکن ہندوستان مہمان نواز ہے، وہ اُن لوگوں کو بھی نہیں بھولا ہے جو اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ ان کا بھی مشتاق رہتا ہے۔" مگر یہ کیا ہوا کہ 15 دن تو لمحے بھر میں گزر گئے۔ ابا کی قبر روز مجھے آواز دیتی تھی۔ سرسید کی درس گاہ نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ابا کی درس گاہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور حسن منزل، صمد منزل (غازی پور) نے میری آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر دیے۔ اپنے گاؤں کے اجڑے کھیت شکوہ کر رہے تھے،" تم دیر سے آئیں۔''

اللہ رے ہجرت کا کرب۔ آگے لکھتی ہیں:" میں نے جب سے شعوری طور پر آنکھیں کھولیں ایک اَن دیکھی دنیا میں جیتی رہی ہوں۔ یہ خواہش ہر وقت میرے دل میں کہیں نہ کہیں چھپی رہی کہ میں وہ دنیا دیکھوں جہاں میرے آباؤ اجداد نے زندگی گزاری؟ ان کے اندر یہ خواہش تو رہی لیکن اصلی جذبہ یہ تھا کہ جو نعمت ان سے دو سال کی عمر میں چھن گئی تھی، جہاں جہاں اس کے نقش قدم پڑے تھے وہاں وہاں ان کے قدم بھی پہنچ جائیں۔ بہر حال وہ کراچی سے اڑیں اور صرف دو گھنٹے میں دہلی پہنچ گئیں۔ ہمارے دونوں ملکوں کے فاصلے کتنے قریب ہیں لیکن کتنے دور ہو گئے ہیں۔ دہلی آ کر ان کا پہلا سابقہ جامع مسجد سے پڑا، اور پہلا منظر ان کے سامنے یہ آیا "صفیں بچھی ہوئی تھیں، نمازی خشوع وخضوع کی کیفیت میں تلاوت کر رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں تسبیح تھی اور دانے شمار کر رہے تھے''۔ گویا اس لحاظ سے آج بھی ہندوستان، پاکستان میں کوئی فرق نہیں تھا۔

دہلی میں انہیں لال قلعہ، قطب مینار، خواجہ نظام الدین اولیا کا آستانہ سب اپنی شان اور اپنا تقدس دکھاتے ہوئے ملے۔ ان مقامات پر بھی وہ اُن قدموں کے نقوش کو نہیں بھولیں جن کی تلاش میں وہ نصف صدی سے زیادہ کی مدت میں ہندوستان آئی تھیں۔

اور پھر وہ آنسو بہاتی ہوئی اُس شہر میں آ گئیں جو ان کی اولین ترجیح تھا۔ یہ شہر وہ تھا جس کے بارے میں ان کے بقول شاعر نغمہ سرا تھا:

سرشار نگاہ نرگس ہوں، پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

وہ علی گڑھ آ کر یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس نمبر ایک میں ٹھیر گئیں۔ انھوں نے گیسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر سات میں سامان رکھ کر گرم دوپہر میں پہلا کام یہ کیا کہ یونیورسٹی قبرستان کی راہ لی کہ ان کا اصلی مقصود وہی تھا، اور وہاں پہنچ کر وہ اپنے ابا (حسن عبداللہ صاحب) کی قبر تلاش کرنے لگیں۔ شہر خموشاں میں 2014ء میں 1946ء کی تلاش کتنا دشوار کام تھا۔ یہ داستان سناتے ہوئے ان کا لہجہ بہت جذباتی ہو گیا ہے۔ اس تلاش میں کئی گھنٹے گزر گئے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئیں، تاہم مایوس بھی نہیں ہوئیں۔ انھیں بانی درس گاہ سر سید احمد خان کا امید پر معرکتہ الآرا مضمون یاد تھا۔ اگلی صبح وہ پھر وہاں پہنچ گئیں اور تلاش پھر شروع کر دی۔ اب اس تلاش میں رفیق گورکن بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا تھا۔ بالآخر تلاش کامیاب ہوئی۔ من جد، وجد اور جوئندہ یابندہ۔ ایک قبر کے پاس بیٹھ کر انھوں نے جھاڑیاں صاف کیں۔ قبر کا پتھر کالا ہو گیا تھا، اسے بھی کسی نہ کسی طرح صاف کیا۔ ابھی ایک لفظ ہی صاف ہو کر سامنے آیا تھا کہ ان کی چیخ اس قبرستان میں بلند ہوئی۔ انھوں نے زندگی میں ایک کام یہ بھی کیا تھا کہ اپنے والد کی ڈائریوں کی مدد سے ان کا کلام مرتب کر کے شائع کر دیا تھا۔ وہ حسن تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے مجموعہ کلام کا نام "افکارِ حسن" رکھا تھا۔ وہ بطور نذرانہ عقیدت قبر پر رکھ دیا۔ وہ تین دن علی گڑھ میں رُک کر دہلی کے لیے روانہ ہو گئیں، لیکن پھر آنے کے ارادے سے۔

وہ دہلی سے علی گڑھ، وہاں سے آگرہ، پھر علی گڑھ، اعظم گڑھ اور اپنے سابق وطن مالوف غازی پور کا سفر کرتی رہیں۔ ہر جگہ ان کی آؤ بھگت ہوئی۔ آگرہ سینٹ جانس کالج میں بھی ان کے

والد نے تعلیم حاصل کی تھی اور کچھ عرصہ پڑھایا بھی تھا۔ وہ وہاں گئیں اور کالج کے پرنسپل الیگزینڈر لال نے دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ وہ آگرہ کالج بھی گئیں۔ وہاں بھی ان کے والد استاد رہے تھے۔ وہاں بھی پرنسپل راوت اور انگریزی کی استاد شاداں نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ اگر کوئی شخص ہندوستان آئے اور آگرہ جا کر تاج محل نہ دیکھے تو وہ گویا ہندوستان آیا ہی نہیں۔ بہت سے تو صرف تاج محل دیکھنے کے لیے ہندوستان آتے ہیں۔ شاہ جہاں ہندوستان کو کیا دولتِ بے بہا دے گیا ہے۔ محترمہ نوشابہ صدیقی نے بھی تاج محل کی زیارت کی۔ تاج محل صرف ہندوستان ہی میں تعمیر ہوسکتا تھا، کہیں اور نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ وہ انڈو پرشین تہذیب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

علی گڑھ میں انھوں نے بہت کچھ دیکھا، بہت لوگوں سے ملیں۔ ان سب کا ذکر انھوں نے بہت اپنائیت اور فراخ دلی سے کیا ہے۔ انھوں نے علی گڑھ والوں کو بھی اپنی شخصیت اور اپنے جذبات سے بہت متاثر کیا۔ وہ معاشیات کی پروفیسر رہی ہیں لیکن ان کی سادگی اور ان کا اندازِ گفتگو ذاتی فخر ومباہات سے یکسر خالی ہے۔ اگر انھیں فخر ہے تو اپنے آباؤاجداد پر، اور ان کا انکسار یہ ہے کہ وہ اپنے کو ان کے مقابلے میں ہیچ بتاتی ہیں، حالانکہ خود ان کے اپنے کارنامے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

آگرہ سے علی گڑھ ہوتی ہوئی وہ اعظم گڑھ چلی گئیں۔ علی گڑھ سے اعظم گڑھ تک کا سفر انھوں نے ٹرین سے کیا۔ لکھا ہے کہ وہ ٹرین میں چالیس سال کے بعد بیٹھی تھیں۔ ٹرین کے سفر میں ان کے ذہن میں علی گڑھ کی یادیں پھر تازہ ہوگئیں۔ انھوں نے اپنے ایک بھائی کا ذکر کیا ہے جو تعلیم منزل میں پیدا ہوئے تھے اور مصنفہ کے یہاں آنے سے پانچ ماہ قبل ان کا 85 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا۔ اگر وہ حسن اختر تھے تو ان کا اور خاکسار تبصرہ نگار کا ایک سال آفتاب ہوسٹل میں ساتھ رہا تھا۔ اُس وقت راقم الحروف ایم اے کا طالب علم تھا اور وہ انٹرمیڈیٹ میں تھے۔ مصنفہ نے ایک بات عجیب لکھ دی ہے کہ "میرس روڈ اب زمیں بوس ہو چکا ہے۔" ایسا بالکل نہیں ہے، الحمدللہ میرس روڈ تو اب 1946ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ آباد، پُررونق اور روشن وتاباں ہے۔ خیر وہ اعظم گڑھ پہنچ گئیں جو ان کی بہن کا شہر تھا۔ لیکن اس شہر سے ان کا کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا، البتہ انھیں وہاں پہنچ کر اپنے اردو کے استاد انجم اعظمی یاد آگئے۔ وہ انھیں اپنے چند بہترین استادوں

میں سے ایک قرار دیتی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے وہ علیگ بھی تھے اور رشید احمد صدیقی کے شاگرد بھی۔ یہ انجم اعظمی ہمارے بھی دوست تھے۔ اعظم گڑھ میں مصنفہ کا قیام دو دن رہا اور وہ اپنی بہن اور ان کے بچوں کی مہمان داری سے بہت متاثر ہوئیں۔ اور اب وہ اپنے قدیم وطن غازی پور پہنچ گئیں۔ وہاں بھی انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ اپنے اعزہ سے، اور ان کے اعزہ ان سے مل کر خوش ہوئے۔ اپنے آباؤ اجداد کی قدیم عمارتوں حسن منزل اور صمد منزل کی زیارت کی اور آنسو بہائے۔ مکانوں کی رونق مکینوں سے ہوتی ہے۔ جب مکین ان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو شکست وریخت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ تاہم انھوں نے دیکھا کہ غازی پور میں الحمدللہ مسجدیں آباد ہیں، تعلیم وتدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے گاؤں بھی گئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں کے ہندو بھی ان سے مل کر اتنے ہی خوش ہوئے جتنے مسلمان۔

انھوں نے اپنے بزرگوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ البتہ اکثر جگہ جذباتیت حاوی ہوگئی ہے۔ کتاب میں بعض جملے بہت خوب صورت اور خیال انگیز ہیں۔ مثلاً: "ہماری نئی نسل یاد رکھے اور بھول جانے جیسے جذبے میں ہم سے یکسر مختلف ہے"۔ اور "بچے کسی دوسرے ملک میں تیسرے درجے کے شہری بن کر زندگی گزار رہے ہوں گے"۔ دراصل آج کا سب سے بڑا المیہ دولت اور اقتدار کی ہوس ہے۔ وطن سے باہر جا کر آدمی بلاشبہ دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری بن جاتا ہے لیکن دولت ضرور ہاتھ آجاتی ہے، اور جب دولت اور اقتدار مل جائے تو نہ اقدار وروایات کی اہمیت رہتی ہے اور نہ کسی کو یاد رکھنا ضروری رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ والدین اور دیگر متعلقین کو وقتاً فوقتاً پیسے بھیج دیے ان کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ملازم رکھ دیا اور ذمہ داری ختم ہوگئی، بلکہ اب تو اولڈ ایج ہوم نے اس کی بھی جگہ لے لی ہے۔

جب پروفیسر نوشابہ صدیقی اپنے سابق وطن سے رخصت ہو رہی تھیں تو ان کے ذہن میں خیال تھا کاش میں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوتی، اسی شہر میں رہتی۔ انھوں نے کراچی جیسے بڑے اور بارونق شہر میں بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری ہے۔ پھر وہ کیا جذبہ ہے جس نے ان سے یہ لکھوایا ہے؟ انھوں نے یہ تو لکھا ہے کہ "ہم ہجرت پر مامور تھے لیکن یہ پتا نہیں لگتا کہ کیوں مامور تھے؟" بہرحال ذہنی کیفیت یہ تھی کہ ان چاروں موسموں کے نام کے سوا مجھے پانچویں موسم کا کوئی

پتا نہیں تھا، مگر اسی لیے میرے وجود نے چیخ چیخ کر کہا" ہاں مجھے اس کا نام معلوم ہے۔ یہ درد کا موسم ہے۔ یقین جانیے میرا سارا جسم ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔''

غازی پور سے وہ دہلی آ گئیں۔ دہلی میں انہوں نے مسلمانوں اور اردو کے حوالے سے جو دیکھا اس سے مایوس نہیں ہوئیں۔

لکھا ہے" دہلی یونی ورسٹی کا شعبہ فارسی بھی دیکھا جس کے صدر ہندو تھے۔ اچھا لگا کہ ہندوستان میں ہندی کے علاوہ دیگر زبانیں بھی شوق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔'' غالب انسٹی ٹیوٹ اور اردو اکیڈمی کا ذکر انہوں نے بہت تفصیل سے اور اچھے انداز میں کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ کچھ، تحریریں اور کچھ تصویریں ہیں۔

☆☆☆

کلام اشرف کمال حسن

تبصرۃ: انجینئر محمد فرقان سنبھلی، علی گڑھ

تحریر و تقریر کی ماہر نوشابہ صدیقی اپنے والد کے انتقال کے وقت بہت چھوٹی تھیں اتنی چھوٹی کہ ان کی آنکھوں میں والد کی شبیہ تک محفوظ نہیں رہ سکی۔ نوشابہ صدیقی کی پرورش ان کی دادی اشرف النساء نے بڑے لاڈ پیار کے ساتھ کی حالانکہ کہ وہ بھی زیادہ عرصہ تک ساتھ نہ رہ سکیں اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ اشرف النساء، بریلی درگاہ شاہ نظام الدین سے بعیت تھیں۔ انھوں نے شعری اصناف میں طبع آزمائی کی اور دو سو سے زائد نعتیں تحریر کیں۔ عطیہ بیگم فیضی نے جب پردے سے باہر آؤ تحریک چلائی تو اشرف النساء نے اس کے خلاف نظم لکھی جو بہت مقبول ہوئی تھی۔ "کلام اشرف کمال حسن" میں نوشابہ صدیقی نے تقریباً دو سو صفحات پر اشرف النساء کی شعری کائنات کو سجایا ہے۔ ان میں حمد اور نعت، سلام، مرثیہ، مناجات، نظمیں، غزلیں، ٹھمری وغیرہ شامل ہیں۔ اس انتخاب کا بیش تر حصہ مذہب سے ان کے گہرے شغف کو ظاہر کرتا ہے۔ کتاب میں تصویر کعبہ، حالت کعبہ، حالات مدینہ، حالات عرب، نذر علی مرتضی، غزل از بریلی شریف، حالت اسلام وغیر عنوانات سے بھی شعری تخلیقات پیش کی گئی ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

یہ باغ اچھا ہمیں دکھایا کہ تم ہوا دل کو کچھ نہ بھایا نظر میں ہے وہ بہار چھائی کہ جس میں ذکر خزاں نہیں ہے۔

تو میرا ہے میں تیری ہوں تو مجھ میں ہے میں تجھ میں ہوں تو لیلی ہے میں مجنوں ہوں تو مجھ میں ہے میں تجھ میں ہوں۔

محبت میں بےخود بنا کر تو دیکھو
مجھے جام وحدت پلا کر تو دیکھو

(ٹھمری)

موری کسمی چنریا رنگا دے بلماں،
موری خالی پڑیا بھرا دے بلماں

غازی پور کو نوشابہ صدیقی نے "گلابوں کا شہر" کہا ہے اس کی تاریخ بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ امیر مسعود نے 730ھ مطابق 1330ء میں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام فیروز شاہ تغلق کے دیئے ہوئے خطاب "غازی" کے نام پر "غازی پور" رکھا۔ اس کتاب میں ان کا کلام بھی "کلیات قاری" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ "کلیات قاری" کا اضافہ کتاب کی رونق کو دوبالا کر دیتا ہے۔ نوشابہ صدیقی نے دادا مولوی ابوالحسن کا ذکر تذکرہ مشاہیر غازی پور کے حوالے سے پیش کیا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ اس کے ساتھ کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ، دادا کی اسناد، ستائشی خطوط اور دفتری مراسلت کی عکس نقول تک کو پیش کیا گیا ہے جو کہ نوشابہ صدیقی کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہے۔ جو کلام پاکستان ہجرت کے بعد باقی رہ گیا تھا اسے انھوں نے کتاب میں شامل کیا ہے۔

نوشابہ صدیقی کی پھوپھیاں بھی شعر کہتی تھیں ان کے کلام کو بھی کتاب میں شامل کر کے پورے خاندان کے ادبی ذوق کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نوشابہ صدیقی نے اپنی اس کوتاہی کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ اس کتاب کے سلسلے میں مزید تحقیق کر سکتی تھیں مگر چند وجوہ کی بنا پر ایسا کرنے سے قاصر رہیں۔ وہ اپنے بچوں کے وسیلے سے دور حاضر کی اس تلخ حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ نئی نسل ہو سکتا ہے اس کتاب میں دلچسپی نہ لے کیوں کہ انھیں ان بزرگوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جنھیں انھوں نے دیکھا ہی نہیں۔ پھر بھی وہ پر امید ہیں کہ ان کے بچے نہ سہی لیکن آنے والی نسلوں میں کوئی بچہ ضرور ایسا ہوگا جو ان کے ادھورے کام کو آگے بڑھائے گا۔

کتاب کے آخر میں شجرہ کا اضافہ مزید تحقیق کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ دیدہ زیب ٹائٹل کور، عمدہ پرنٹنگ، دیدہ ریزی سے کی گئی پروف ریڈنگ کی وجہ سے بھی کتاب عمدہ کاوش کہی جا سکتی ہے جسے یقیناً قارئین پسند کریں گے۔ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ نوشابہ صدیقی کے خاندان کی ادبی کاوشوں سے متعارف کراتی ہے بلکہ ایسے کئی شعراء کے کلام کو بھی منظر عام پر لاتی ہے جو کہ اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ امید کی جاتی ہے کہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

چشمِ حیراں، ایک تاثر

تبصرہ: ڈاکٹر رخسانہ صبا کراچی

اردو میں اگر چہ خاکہ نگاری کا ابتدائی رنگ ہمیں "آبِ حیات" میں نظر آتا ہے، لیکن باقاعدہ طور پر مرزا فرحت اللہ بیگ سے لے کر عہد حاضر تک اردو میں خاکہ نگاری کی روایت بڑی روشن اور مستحکم رہی ہے۔ چشم حیراں نوشابہ صدیقی کے خاکوں اور مضامین کا مجموعہ ہے جسے حال ہی میں اکادمی بازیافت نے شائع کیا ہے۔ کراچی کے علمی وادبی منظر نامے پر نوشابہ صدیقی ہمیشہ سے ہی فعال رہی ہیں۔ تدریسی ذمے داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ ماضی میں مشاعروں اور ادبی تقریبات کے انعقاد میں جس طرح اپنا کردار ادا کرتی رہی ہیں وہ بھی ہم سب پر عیاں ہے، لیکن ان مصروفیات کے ساتھ انھوں نے قلم سے بھی اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے۔ ان کے دو ناول "صلیب کا زخم اور زندگی بھر کی بات" بھی شائع ہوئے۔ افکارِ حسن، کلامِ اشرف، کمالِ حسن اور دلِ شوریدہ کے نام سے انھوں نے تین کتابیں بھی مرتب کیں۔ چشمِ نم کے نام سے انھوں نے ہندوستان (علی گڑھ) کا سفر نامہ بھی لکھا۔ اس سے قبل ان کے خاکوں اور مضامین کا پہلا مجموعہ سرشام بھی شائع ہو چکا ہے اور اب چشم حیراں کے نام سے خاکوں اور مضامین کا یہ تازہ مجموعہ سامنے آیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں اکیس مختلف شخصیات کا ذکر ہے اور ان کے وجود سے وابستہ اُس رنگارنگی کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے جس کا مشاہدہ و مطالعہ نوشابہ کی چشم حیراں نے کیا۔ جی ہاں انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے۔ ان شخصیات میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر جمیل جالبی، عصمت چغتائی، انجم اعظمی، ابراہیم جلیس، مشاق احمد یوسفی، مختار مسعود شفیع عقیل اور انور شعور، نجم الحسن رضوی، طلعت اشارت اور صغیر افراہیم جیسی علم و ادب سے وابستہ معتبر ہستیوں کی کہکشاں بھی ہے، حسن مثنیٰ ندوی، حسنین کاظمی اور نصیر صاحب جیسے مثالی اساتذہ کی مہتاب صفت

روشنی بھی ہے، عاشقین جیسے گم نام، مگر مضبوط کردار کا اجالا بھی ہے اور ذاتی زندگی سے وابستہ کچھ قیمتی رشتوں (والدہ، بھائی اور حسین امیر فرہاد) کی جھلملاتی ہوئی کرنیں بھی ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ سرسید احمد خاں کے نام دو خطوط، جامعہ کراچی پر ایک مختصر تحریر اور چشم نم پر ریاض الرحمن شیروانی کا تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا جذباتیت میں گندھا ہوا اسلوب ہے جو شروع سے لے کر آخر تک نہ صرف یہ کہ قاری کی دل چسپی برقرار رکھتا ہے، بلکہ اسے اس جذباتیت میں شریک بھی رکھتا ہے۔ مضامین کے عنوانات میں بھی جذباتی رنگ نمایاں ہے۔ اس رنگ کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض شخصیات کو مصنفہ نے فاصلے سے نہیں دیکھا، بلکہ ان سے قریبی رابطوں کے ساتھ ساتھ جذباتی وابستگی اور قلبی تعلق کی کارفرمائی بھی رہی ہے، لیکن جن کے ساتھ ان کے رابطے براہ راست نہیں رہے، مثلاً سر محمد آغا خان، عصمت چغتائی، مختار مسعود وغیرہ، وہاں بھی ذہنی وابستگی کے سبب یہ رنگ اسلوب نمایاں ہے۔ دوسری بات یہ کہ دو تین کے علاوہ یہ تمام تحریریں رفتگاں کے حوالے سے لکھی گئی ہیں جن میں سے بیش تر سے مصنفہ کی ذہنی، مجلسی اور ذاتی قربتیں رہیں اس لیے ان کے بچھڑ جانے کا دکھ بھی ان میں نمایاں ہے۔ کتاب میں شامل چند جملے بطور خاص اس جذباتیت کے گواہ ہیں۔ مثال کے طور پر:

میری آنکھوں سے ایک بوند آنسو بھی نہیں ٹپکا کہ وہ تو اندر ہی اندر میرے خون ہوتے ہوئے دل کو دھونے کے کام آ رہا تھا۔ (سب کے جلیس..... ابراہیم جلیس، ص ٦٦)

مٹے ہوئے لفظ مٹے ہی رہیں گے کہ لکھنے والا اپنا قلم دنیا میں چھوڑ گیا ہے اور اپنی انگلیاں ساتھ لے گیا ہے۔ ("جو تھے مگر نہیں رہے۔ انجم اعظمی" ص ۵۴)

انسان بھی تو دنیا کے ہجوم سے نکل کر یکا یک گم ہو جاتا ہے، یوسفی صاحب کی طرح کہ آج وہ بھی نہ دائیں ہیں نہ بائیں۔

("بے حد سنجیدہ یوسفی صاحب"۔ ص ۱۲۱)

ہر ورق سے کوئی شخصیت کوئی یاد اٹھ اٹھ کر گلے ملنے لگتی ہے۔ زندگی کا ورق بھی تو کتاب ہی جیسا ہے۔ مختار مسعود بھی اپنی ہی کتابوں کے ورق میں سجے سجائے کھڑے ہیں۔ کتاب کا مالک مر

جاتا ہے، کتاب اوراس کی داستان کبھی نہیں مرتی۔

("مختار مسعود...جو آج اپنی درس گاہ میں موجود ہیں"،ص ۱۴۵)

اس کتاب میں قاری کی دل چسپی برقرار رہنے کا ایک اور سبب یہ ہے، کہ مصنفہ نے واقعہ نگاری کی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے اسے افسانوی اسلوب میں ڈھال دیا ہے۔ مصنفہ کا تعلق چوں کہ ناول نگاری سے رہا ہے، اس لیے ایسا ممکن بھی تھا۔ بعض مضامین پڑھتے ہوئے قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے کوئی افسانہ پڑھ رہا ہو۔ یہ کیفیت کئی مضامین میں موجود ہے، نائٹ کمانڈر... سر سلطان آغا خان نامی مضمون میں تو یہ کیفیت اور بھی نمایاں ہے، یہاں تک کہ "اپنی بات" کے عنوان سے جو پیش لفظ ہے، اُس کی ابتدا بھی کچھ اس طرح ہوئی ہے:

لیجیے، "چشم حیراں" ٹھہر گئی۔ تین سال سے بھٹک رہی تھی۔

"(اپنی بات"ص ۹)

چند اور مثالیں دیکھیے:

میں نے پوری زندگی اپنے آپ سے سوال کیا ہے کہ لمحے جو گرد بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو چکے ہیں، انھیں اپنی آیندہ زندگی میں جوڑ دوں یا گھٹا دوں۔

("حسن منزل سے حسن منزل تک......میری اماں"ص ۱۸۱)

دروازوں کی لکڑیاں چیخ رہی ہیں، لوہے زنگ آلود ہیں۔ درخت بوڑھے ہو چکے ہیں اور اب جھک کر دوبارہ زمین سے اپنا رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ فضا میں سناٹا ہے، مگر سننے والے وہ آوازیں بھی سنتے ہیں جب ہرے بھرے اس گاؤں میں زندگی کا میلہ سجا رہتا تھا۔

("علیگ قلم مزدور.... حسن اختر"ص (۱۴۶)

صبح صبح آنے والے فون کی گھنٹی گئے دنوں کے تار کی آمد کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ تار والے کی آمد ہمیشہ خدشات سے دوچار کر دیا کرتی تھی۔

("عاشقین سے جمال بھائی تک"ص ۱۹۴)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نے ہجرت کی تھی اور مجھے نہ ہجرت کے معنی معلوم تھے نہ ہی تلفظ کے ساتھ اس لفظ کو ادا کر پاتی تھی۔

("جومعافی کے قابل نہیں... حسین امیر فرہاد" ص ۲۰۷)

دونوں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک نے رک کر دوسری سے کہا۔" میں طلعت اشارت ہوں اور تم ؟" دوسری میں تھی اور میں بھی رک گئی۔

("ادھر نگاہ کرو، پھر سے رسم وراہ کرو... طلعت اشارت" ص ۱۷۳)

خاکہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جس کے عناصر ترکیبی میں اختصار، کردار نگاری، واقعات کے انتخاب، مجموعی تاثر اور حسنِ بیان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ خاکہ نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ بے جا تعریف و تنقیص اور تعصبات سے گریز کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ شخصیت کی مرقع کشی اس طرح کرے کہ اُس کا اصل عکس ابھر کر سامنے آجائے اور قاری کے ذہن پر اُس شخصیت کا ایک گہرا تاثر نقش ہو جائے۔ اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے خاکہ نگار کبھی منتخب شخصیت کا حلیہ اور سراپا بیان کرتا ہے، کبھی غیر جانب داری اور جرأت اظہار کا راستہ منتخب کرتا ہے، کبھی واقعات کے ربط و تسلسل سے کام لے کر اس کردار کی انفرادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی منظر نگاری اور دل چسپ اسلوب سے کام لے کر شخصی اوصاف کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔

خاکہ نگاری کے لوازمات کو سامنے رکھتے ہوئے "چشم حیراں" کو مکمل طور پر خاکوں کا مجموعہ نہیں کہا جا سکتا۔ مصنفہ نے خود بھی اسے خاکوں اور مضامین کا مجموعہ قرار دیا ہے لیکن بعض تحریریں خاکوں سے زیادہ یادداشتیں معلوم ہوتی ہیں یا انھیں، خاکہ نما کا نام دیا جا سکتا ہے، کیوں کہ ان میں اختصار، واقعات کے ربط و تسلسل اور حسن بیاں کے باوجود قاری کے ذہن پر شخصیت کا نقش گہرا نہیں ہو پاتا اور کرداری اوصاف نمایاں نہیں ہوتے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا ایک سبب اصل مسودے کی گم شدگی بھی ہو جس کا ذکر "اپنی بات" میں کیا گیا ہے۔ دوم یہ کہ ان تحریروں میں خود مصنفہ کی شخصیت بار بار در آئی ہے جس پر محبت اور عقیدت کے جذبات غالب ہیں۔ خاکہ نگاری کے لیے لازم ہے کہ شخصیت کو ایک خاص فاصلے سے دیکھا جائے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض تحریروں میں مرقع نگاری عمدہ ہے، مثلاً حسن مثنیٰ ندوی پر لکھی گئی تحریر میں سراپا نگاری بھی ہے اور بحیثیت استاد ان کے رویوں کی عکاسی بھی، میری اماں کے نام سے جو خاکہ ہے وہ بھی بہت اثر انگیز

ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر غلام مصطفی خاں پر لکھی گئی تحریریں محبت وعقیدت کی مظہر ہیں۔ انور شعور اور شفیع عقیل کی عادات و اطوار کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی قاری کی ملاقات ان کی انفرادیت سے ہوتی ہے۔ جمال بھائی اور حسین امیر پر لکھی گئی تحریریں مصنفہ کی انسان دوستی کا احساس دلاتی ہیں اور جوش ملیح آبادی پر لکھا گیا خاکہ جرات اظہار کی نمائندگی کرتا ہے۔ عصمت چغتائی اور مختار مسعود پر لکھے گئے مضامین تاثراتی ہیں، کیوں کہ وہ جلسوں میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے۔ نصیر صاحب اور حسنین کاظمی کے خاکے محبت سے بھرپور ہیں، لیکن پڑھنے والے کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں کے نام تحریر کردہ دونوں مخطوط میں کراچی میں سرسید کے حوالے سے منعقد ہونے والی تقریبات اور سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ جامعہ کراچی کے نام سے جو تحریر ہے وہ مصنفہ کے زمانہ طالب علمی کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔

بحیثیت مجموعی زیرِ نظر کتاب میں ان معتبر شخصیات کے تذکرے موجود ہیں جن کی رفاقتوں، اور فرقتوں کے عکس مصنفہ کی چشم حیراں میں تخمیر گئے ہیں اور پرکشش اسلوب کی بنا پر وہ یہ عکس قاری کی آنکھوں میں منتقل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہی ہیں۔

☆☆☆

(مکالمہ کراچی، کتابی سلسلہ ۱۴۶ کادمی بازیافت)

حرفِ سپاس... پروین حیدر

تذکرے ہوتے ہیں ان لوگوں کے دنیا میں مدام
قامتِ فکر میں ہو سرو و سمن جن کا مقام
جیسے نوشابہ کا ہے حرف کے آنگن میں قیام
ہر قدم پر ہے بصیرت کا بصارت سے کلام
ہر گھڑی رزم گہِ فکر میں ہیں سینہ سپر
لفظ ہیں ان کی زرہ حرف ہیں ان کا لشکر
چپ ہوں تو حرف مہکتے ہیں صدا کی صورت
نوکِ خامہ پہ دمکتے ہیں حنا کی صورت
ورقِ دل برستے ہیں گھٹا کی صورت
دستِ تخیل میں ہیں لفظ دعا کی صورت
اس طرح لفظ و معنی کو عطا کی ہے حیات
حرف کے نقش میں بھر دیتی ہیں یہ رنگِ ثبات
برگزیدہ کسی بیدار سی ساعت کی عطا
بالیقیں فن کو فروغ ان کی ریاضت کی عطا
اور پر شوق و جنوں ذوقِ سماعت کی عطا
یہ مقام آپ کے کردار کی دولت کی عطا
ان کے ہی عکس سے روشن ہیں ادب کے مہتاب
اپنے آباء کی طرح آپ ہیں خود اپنا جواب

☆☆☆

صلیب کے زخم

تبصرہ: مجنوں گورکھپوری

ناول کیا ہے اور ہم اِسے کیوں پڑھتے ہیں؟

اس سوال کا جواب اٹھارہویں، انیسویں صدی سے لے کر اب تک مغربی ناقدین دیتے آئے ہیں اور ہماری اردو زبان میں بھی اس سوال پر کافی مواد ملے گا۔ جتنے جوابات اب تک دیے گئے ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو بالکل درست ہو لیکن ہر جواب میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ ایک بہت عام تجربہ یہ ہے کہ پڑھنے والا کہانی یا ناول میں سب سے پہلے تفریح یا لذت کا عنصر طلب کرتا ہے۔ تفریح بھی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اور اس کو بھی ہم زندگی کے مقاصد میں شامل سمجھتے ہیں۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ تفریح اور لذت میں فرق ہوتا ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ داستان یا کہانی یا ناول کسی دور میں بھی محض تفریح نہیں رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھتے وقت ہم نے ان میں تفریح کے سوا کچھ نہ پایا ہو۔ اور تو اور الف لیلی کی ایک ہزار راتیں، طلسم ہوش رُبا کی آٹھ جلدیں اور حاتم طائی کے کارنامے محض تفریح نہیں۔ ان میں اپنے زمانے کی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ اور یہ عکس تخلیقی اور Projective یعنی تیسری سمت یا مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہمیں ان کہانیوں سے یہ بصیرت ملتی ہے کہ اس وقت زندگی کیا ہے۔ اس کو کیا ہونا چاہیے اور یہ کیسی ہوسکتی ہے تقریباً سینتیس (۳۷) سال ہوئے میں نے اپنے مقالے "افسانہ اور اس کی غائت'' میں لکھا تھا کہ افسانہ ایک پہلو سے تفریح ہوتا ہے۔ مگر دوسرے پہلو سے وہ زندگی کے بحران سے نجات پانے کی کوشش ہوتی ہے۔

ذرا الف لیلیٰ کے قصوں کی شانِ نزول پر غور کیجیے۔ شہنشاہ شہریار کے لیے یہ قصے تفریح تھے۔ اور لوریاں کا کام کرتے تھے لیکن وزیر زادی شہرزاد سے پوچھا جائے تو وہ صرف اتنا کہہ سکتی تھی

کہ مجھے تو اپنی موت کو ایک صبح سے دوسری صبح تک ٹالتے رہنا ہے۔ گویا زندگی کو بحرانی لمحوں سے بچانے کی خواہش و ہدایت ناول یا افسانے، کم سے کم جدید ناول یا افسانے کا اصل مقصد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ناول میں ایک لذت، ایک طیف کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ وہ وعظ یا پند ہو کر رہ جائے گا۔ اور کوئی اُس کو دل لگا کر نہ پڑھ سکے گا۔

گذشتہ دس بارہ سال کے اندر میری نظر سے کئی ناول گزر چکے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک میں، میں نے کچھ نہ کچھ فنی حسن اور فکری رسائی پائی ہے۔ اور ان میں سے کئی پر موقع موقع سے میں نے اپنی مختصر رائے کا اظہار کیا ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے نوشابہ صدیقی نے مجھے اپنے زیرِ طبع ناول "صلیب کے زخم" کا مسودہ دکھایا۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ میں اس ناول پر تعارف یا مقدمہ لکھوں۔ میں نے ان کو بہت بہلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے فیصلوں سے ٹلنے والی معلوم نہیں ہوئیں۔ آخر مجھے ہی اپنی جگہ سے ہلنا پڑا۔

میں نوشابہ صدیقی سے اچھی طرح واقف نہیں۔ مجلسوں اور تقریبوں کی ملاقاتوں سے اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ کس قسم کی شخصیت اور کس مزاج و کردار کی مالک ہیں۔ لیکن میں نے اُن کو "صلیب کے زخم" میں دیکھا اور میرے لیے یہ ناول اور وہ خود ایک ہی ہیں بقول اس مصرعے کے، جو عام طور سے زیب النساء سے منسوب کیا جاتا ہے۔

ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا

اس ناول کو شروع سے آخر تک دل لگا کر پڑھ جانے کے بعد جو قابلِ تجزیہ تاثر پیدا ہوتا اور باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جیسے کسی نے اپنی اصل ہستی کو جس کو مدتوں سے وہ کھوئے ہوئے ہے اور بھلا چکا ہے یا اگر کسی نے اپنی اصل ہستی کو کبھی نہیں پایا ہے تو وہ اس کو پا جاتا ہے۔ خود مجھ پر پہلا اثر یہی ہوا کہ میری وہ ہستی جو کم و بیش نصف صدی سے کھوئی ہوئی تھی خلاف توقع مجھے پھر مل گئی۔ یہ احساس بازیافت اس منزل پر جس پر میں ہوں سخت خطرناک ہوتا ہے۔ میں اس بازیافت کو پھر جلد سے جلد کھو دینا چاہتا ہوں۔ مگر یہ تو میں نے اپنے ذاتی تاثر کا قصہ چھیڑ دیا۔

ناول کی بہت سی تحتی صنفیں ہیں۔ کوئی کسی ایک خاندان کی مکمل زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، کوئی تاریخی ناول ہوتا ہے۔ کسی ناول میں زندگی پر مابعد الطبعیاتی یا ماورائی نظر ڈالی جاتی ہے۔ کسی

ناول میں نفسیاتی الجھاوے سلجھائے جاتے ہیں۔کوئی پرابلم ناول کسی اہم مسئلہ زندگی پر ہوتا ہے۔ کوئی تصوریت لیے ہوئے ہوتا ہے۔کسی میں عمل کا پیغام ہوتا ہے۔کوئی خالص جمالیاتی ہوتا ہے یعنی فن برائے فن کی نمائندگی کرتا ہے۔اور کسی ناول میں سائنس کے موجودہ اور آئیندہ اکتشافات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آخر "صلیب کے زخم" کس قسم کا ناول ہے؟ اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔اس میں گھریلو زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو واقعات لیے ہوئے ہیں۔بڑے سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے بچے تک کی زندگی کا مختصر نمونہ ہماری نظر سے گزرتا ہے، جو فطری ہے۔ناول میں صحت مند قسم کی عملیت بھی ہے، اور تصوریت بھی۔اس میں واقعاتی زندگی کا پورا عکس بھی ہے، اور وہ رومانیت بھی ہے جس سے انسان جب تک وہ انسان ہے کسی دور میں بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمام عناصر باہم اس طرح شیر وشکر ہیں کہ ان کا کیمیائی تجزیہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔افراد اور سماج، انفرادی شخصیت کے مطالبے اور سماجی نظام کے تقاضے دونوں برسر پیکار ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔اور پیکار، پیکار محسوس نہیں ہوتی۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ منزل ہے جہاں فرد کی ذاتی روح کائنات کی روح کے ساتھ مل کر ایک آہنگ بن گئی ہے۔

ویسے تو ناول کا ہر کردار اپنا ایک فطری مقام رکھتا ہے لیکن اس کی روحِ رواں سلینا کراس اور انور ہیں۔اور سلینا کراس تو ایک ایسا محور معلوم ہوتی ہے جس پر جہاں تک اس ناول کا تعلق ہے زندگی کا پورا کرہ گھوم رہا ہے۔ناول کی ترتیب روز مرہ واقعات سے ہوتی ہے۔لیکن یہ محض واقعات کی کہانی نہیں ہے۔یہ کرداروں کی کہانی ہے۔بیرونی کش مکش یا تصادم معاشرے اور اس کے مروجہ اخلاقی اور اجتماعی معیار و روایت کی پیداوار ہے۔لیکن اندرونی پیکار خود کرداروں کی شخصیتوں اور مزاجوں سے پیدا ہوا ہے۔ایسے دو کردار بہت کم دیکھے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے بہ یک وقت اتنا قریب ہوں اور اتنا دور ہوں۔

کہانی کی ابتدا انور کی تیارداری سے ہوتی ہے جس میں یوں تو سارا گھر شریک ہے لیکن بغیر ایک سند یافتہ اور تجربہ کار نرس کے کام نہیں چلتا۔یہ نرس سلینا کراس ہے جو آتے ہی مریض کو اپنے

ہاتھ میں اس طرح لے لیتی ہے کہ گھر والے اعتماد کے ساتھ سبک دوشی سی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ انور کی بیماری بھی ایسی ہے جو عام نہیں ہے یعنی وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے اور یہ بات اس کے ذہن سے بالکل محو ہوگئی ہے کہ وہ ایک عرصے تک لندن اور ایڈنبرا میں وہاں کے لوگوں اور وہاں کے معاشرے میں بالکل گھل مل کر زندگی گزار چکا ہے۔ وہ ایک بالکل نابالغ بچے کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ اور ان حرکتوں میں سنجیدگی کے ساتھ منہمک ہے۔ اس کا بچکانہ مشغلوں میں ایک مشغلہ پانی میں صابن گھول کر نلکی سے چھوٹے بڑے بلبلے اُڑانا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ آسمان پر سیارے یا راکٹ بھیج رہا ہے۔ نرس پہلے ہی دو چار گھنٹے کے اندر انور کی نبض جس طرح پا لیتی ہے اور بغیر اس سے کسی قسم کا اختلاف کیے ہوئے اس کو رام کر لیتی ہے۔ یہ ہر نرس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور انور اچانک اس سے یوں مانوس ہو جاتا ہے کہ گویا یہ وسیلہ موانست بذریعہ الہام اس کو ملا ہے۔

اگر کوئی دوسرا اس موضوع پر قصہ چھیڑتا تو ایک ماہر نفسیات یا تحلیلِ نفسی کے عالم کی طرح ہم کو طرح طرح کی اصطلاحوں میں الجھا دیتا۔ اور اس کی یادداشت واپس لانے کے لیے نہ جانے کیسی کیسی شعبدہ بازیاں دکھاتا جو خود پڑھنے والے کے ذہن کو پراگندہ کر کے رکھ دیتیں۔ اور پھر بھی وہ اصلیت سے دور رہتے۔ سلینا نے جس سلیقہ کے ساتھ انور کی ذہنی گرہوں کو کھولنے کی پُرخلوص مسلسل کوششیں کیں، اس کو ہم آسمانی توفیق سے منسوب کر سکتے ہیں۔ کون جانے اس میں اس کا وہ جذبہ عقیدت بھی کارفرما ہو جو اس کو پاک کنواری مریم کے ساتھ تھا۔ وہ دل سے چاہتی ہے کہ انور اس کے ہاتھوں چنگا ہو جائے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی یادداشت پا کر ویسا ہی صحت مند و توانا ہو جائے جیسا کہ وہ پہلے رہا ہوگا۔

شاید یہ اس کا خلوص ہی تھا جس نے خود بہ خود اس کے لیے ایک مساعد اتفاق مہیا کر دیا۔ ایک صدمے نے انور کی یادداشت کھوئی تھی اور اگر وہ واپس آ سکتی تھی تو اس کے لیے ایک دوسرا صدمہ ہی ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمے سے بالکل مختلف تھا۔ انور، سلینا سے اس قدر خوش تھا کہ خود اپنی جگہ اپنے سارے ذہنی اختلال کے باوجود سلینا کی رضا جوئی اور اس کو خوش رکھنے اور دیکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہی محرک تھا جس نے اس کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ سلینا کی خواہش پوری کرنے کے لیے پہاڑی پر تفریح کے لیے

جائے۔

وہاں وہ ٹھوکر کھاتا ہے اور اس طرح گرتا ہے کہ اس کے سر میں شدید چوٹ آتی ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ سلینا بدحواس ہو جاتی ہے اور سب کے ساتھ اس کو واپس لے کر آتی ہے۔ اب وہ ایسا محسوس کرتی ہے کہ اس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ اور اب از سرنو اس کی تیمار داری کرنا پڑے گی جس کا نتیجہ یقینی بھی نہیں۔ وہ از سرنو انور میں منہمک ہو جاتی ہے۔ اس کو نئی تدبیریں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ مگر شاید ان ہی تدبیروں سے کام نہ چلتا اگر سلینا اس کے ساتھ ساتھ صلیب اور پاک مریم کے سہارے دل سے دُعا بھی نہ مانگتی رہتی۔ اس ناول میں ایک شفائی یا زخموں کے لیے ایک اندمالی طاقت (Healing Power) ہے جو شروع سے آخیر تک کام کر رہی ہے اور جس کا راز صرف یہ ہے کہ سلینا دوا اور دعا دونوں کی بہ یک وقت قائل ہے۔ اور دونوں سے ایک ساتھ کام لے رہی ہے۔

انور ایک خاص عالم میں پہنچ جاتا ہے جس کو بے ہوشی کہیے یا نیم شعور اور اس عالم میں اس کی یادداشت لوٹ آتی ہے اور وہ ساری سرگزشت خواب کی حالت میں بڑبڑاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ سلینا بہت غور سے اس کو سنتی ہے اور اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا مریض بہت جلد اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا۔ اور وہ اس پُر امید خیال سے خوش ہوتی ہے لیکن اس دوران سلینا کے شعور میں بے ساختہ ایک تبدیلی بھی ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ اب اپنے مریض کی صرف تیماردار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اپنے دل میں ایک مبہم مگر مستقل خلش بھی محسوس کرنے لگتی ہے۔ جس کو عام زبان میں محبت ہی کہہ سکتے ہیں۔

یہاں سے خود سلینا کے شعور میں ایک نہایت نازک لمحہ شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے دل میں ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا بظاہر کوئی حل معلوم نہیں ہوتا۔ خود وہ ڈیوڈ کے ساتھ منسوب ہو چکی ہے۔ منگنی کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پڑی ہوئی ہے۔ سلینا اب

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر

کی اندرونی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اور قرائن و آثار سے ناول کا پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کش مکش سے کبھی نجات نہ پا سکے گا۔ لیکن سلینا کش مکش کی ابتدا کے دوران ہی فیصلہ کر

چکی ہے اور اس کا یہ فیصلہ ایسا ہے جو کسی معمولی انسان کے بس کا نہیں۔ مگر اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اور وہ جس طرح اس فیصلے سے ثابت قدم ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس نے نہ کفر سے منہ موڑا ہے، نہ ایمان سے انحراف کیا۔ بلکہ دونوں کو کچھ ایسا کر دیا ہے کہ معمولی طبیعت کے لوگ سکتے کے عالم میں رہ جاتے ہیں۔ انور صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اس موقعہ پر جشن منایا جاتا ہے۔ جس میں سلینا بھی اپنی تمام کش مکش اور خلش کو اپنے اندر دبائے ہوئے ہموار پیشانی کے ساتھ شریک ہوتی ہے۔ کچھ دن اور قیام کر کے بالآخر وہ سب سے رُخصت چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے فرض سے بوجوہ احسن سبک دوش ہو چکی ہے۔ اور اب اس کو اپنے کام پر واپس جانا ہے۔ انور کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلینا چلی جائے گی تو اس کو دھکا لگتا ہے۔ اور وہ بے اختیار اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہوا اس کو روک لینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ لیکن سلینا استقامت کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم ہے۔ وہ انور کو ہر طرح سے سمجھاتی ہے اور جب انور اس سے کہتا ہے کہ وہ خود اپنے کو فریب دے رہی ہے اس کا سلینا جو جواب دیتی ہے وہ دل میں نقش چھوڑنے والا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ، "میرے ہاتھ میں ایک زہر بھرا پیالہ تھما دیا گیا ہے جس کو میں برابر گھونٹ گھونٹ پیتی رہی ہوں۔ اور اب اس پیالے میں صرف چند گھونٹ رہ گئے ہیں۔ جن کو میں پی جانا چاہتی ہوں تا کہ جن قدرتی اور معاشرتی عوامل نے مجھے پروان چڑھایا ہے، وہ شرمندہ ہوں۔"

آخر کار وہ انور کو اس کے حال پر چھوڑ کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ وہ قطعی طور پر یہ نہیں بتاتی کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ بس ایک اسٹیشن کا نام لیتی ہے اور گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہو جاتی ہے۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے معہ انور کے اس کو اسٹیشن پہنچانے آتے ہیں۔ انور سکتے کے عالم میں ہے۔ گاڑی آخر کار روانہ ہو جاتی ہے۔ اور انور کی نگاہیں ریل کی پٹڑیوں پر جمی ہوتی ہیں جو متوازی چلی جا رہی ہیں۔ انور تا حدِ نظر ان پٹڑیوں کو دیکھتا ہے۔ اور اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ متوازی پٹڑیاں بہت دور جا کر آپس میں مل گئی ہیں۔ اطہر اس کے اس التباس کو یہ کہہ کر پاش پاش کر دیتا ہے کہ یہ صرف نظر کا دھوکا ہے ورنہ یہ پٹڑیاں آپس میں دراصل کہیں نہیں ملتیں۔ اس صورتِ حال کے متوازی جب سلینا گاڑی سے اپنے اسٹیشن اُترتی ہے تو اس کی نگاہیں بھی دونوں متوازی پٹریوں پر پڑتی ہیں اور اس کو ڈیوڈ کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو اس نے اس سے

اسپتال میں اپنی بیماری کی حالت میں کہا تھا۔ وہ زندگی سے دل برداشتہ تھا اور سلینا اس کو تسلیاں دے رہی تھی اور ڈیوڈ نے اس سے یہ کہہ کر اپنے دبے ہوئے جذبے کا اظہار کیا تھا کہ "تم میری متوازی لکیر بن جاؤ" سلینا کو ڈیوڈ کا جملہ یاد آتا ہے اور اس کی نگاہیں بھی پٹڑیوں پر جم جاتی ہیں۔ اور اس کو بھی نظر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اور بہت دور دونوں متوازی پٹریاں باہم ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر اس کو فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ محض نظر اور حواس کا دھوکہ ہوتا ہے۔ لیکن اس التباس یا طیف کو جس طرح حقیقت بنا دیا گیا ہے وہ حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہے۔ اس کو ماہرین ریاضیات سے پوچھیے جن کا مقولہ ہے کہ یہ دو متوازی خطوط کبھی نہیں ملتے۔ لیکن جو یہ بھی مانتے ہیں کہ متوازیات لامتناہی میں جا کر مل جاتے ہیں۔ انور کا حال نہیں معلوم لیکن سلینا نے اس قول کو سچ بنا کر دکھا دیا۔ انور کا کردار بھی بڑا بلند ہے لیکن سلینا جس مقام پر پہنچ گئی ہے، انور شاید وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اپنی اسی توانائی کی بدولت سلینا پورے ناول پر چھائی ہوئی ہے۔

خطوط متوازی ناول میں ایک دُہری علامت بن گئے ہیں۔ پورے ناول میں چار کردار اہم ہیں۔ میبل اور انور، میبل اور بیڈن، سلینا اور انور، سلینا اور ڈیوڈ۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس کے باوجود کہ سلینا، انور سے کہتی ہے کہ میں میبل نہیں بن سکتی۔ لیکن انور کے لیے تو وہ دوسری میبل ہی رہی۔ لیکن یہ صرف پہلی نظر کا دھوکا ہے۔ میبل اور بیڈن جس عالم میں مل کر ایک ہوتے ہیں وہ خطوط متوازی کے ملنے کا عالم نہیں ہے جہاں متوازی خطوط میں انحراف پیدا ہوا ہے، وہ دونوں کے ملنے کا مقام ہے۔ سلینا کی حالت دوسری ہے۔ وہ پہلے سے ڈیوڈ کے ساتھ رفاقت کا پیمان باندھ چکی ہے۔ انور بعد کو اس کے راستے میں آیا۔ اس نے اپنے عہد کی لاج رکھی۔ ڈیوڈ سے اس نے شادی کر لی۔ مگر انور بھی اس کا اپنا رہا۔ اس لیے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ متوازی خطوط وہاں ملے ہیں جہاں ان کو فطرتاً ملنا چاہیے یعنی عالمِ لامتناہی میں۔ یہاں کسی قسم کا انحراف ممکن نہیں۔

اب میں اس ذاتی تاثر کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں جو ناول پڑھ کر مجھ پر ہوا۔ اور وہ یہ کہ ناقابلِ فتح پر فتح پالی گئی ہے۔ اور ممتنع الحصول حاصل ہو گیا۔

ناول مجھے اس مقام سے لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے جہاں غالب نے یہ حکم لگایا ہے "بھول جانا ہے

نشانی میری' یا جہاں سے بیدل ہم کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے ۔

حسن حقیقت رُوبرو، شمع فضول آئینہ جُو
بیدل چہ فرماید، بہ گو، اے یافتن نا جستند

میں اس کو ناول نگار کا کمال سمجھتا ہوں کہ اس نے پوری رُوداد کو ایسے آنسوؤں سے مشابہہ بنا دیا ہے جو پلک تک آ چکے ہیں لیکن ایک قطرہ بھی گرنے نہیں پایا۔

ناول میں بہت سے الفاظ، فقرے اور عبارتیں ایسے پیانے کی مانند ہیں جو اشکِ خونیں کی شراب سے لبریز ہوں۔ لیکن کیا مجال کہ چھلک جائیں۔

سلینا جس منزل پر پہنچ گئی ہے وہ ترکِ ترک کی منزل ہے۔ جہاں ترک بھی محو ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صبر ہے جو عام معنوں میں صبر نہیں ہوتا۔ یہ صبر کسی انفعالی حالت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک شدید فعال طاقت ہے جو اگر چاہے تو آسمان و زمین کو تہہ و بالا کر کے رکھ دے۔ یہ وہ صبر ہے جس کی تلقین الہام کے وسیلے سے انبیاء و رسل کو کبھی کبھی کی جاتی رہی ہے۔ اور جس کو وہ اپنا شعار بنائے رہے۔ سلینا اپنی تپکتی ہوئی یادوں پر قابو پا گئی ہے۔ اور اب وہ پاک مریم کے سامنے صومِ سکوت کا ایک پیکر بن گئی ہے۔

یہ ناول آرزو کا ناول ہے۔ لیکن ایسی آرزو جس کا انجام شکست سے پہلے متعین ہو۔ غالب نے کہا تھا

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزوِ خرامی!

لیکن سلینا آرزو کی شکست، آرزو کو زندہ رکھ کر صرف اسی کو حاصل سمجھنا اپنا شعار بنا چکی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ شعر میں تو حسرت بڑے مزے سے کہہ گئے ہیں

بہم رہنے لگے دونوں تمنا اور مجبوری

مگر زندگی میں اس نکتے کو پانا معمولی انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ سلینا نے تمنا اور مجبوری کو مجبوری رہتے ہوئے بھی دونوں کو ایک راگ میں تبدیل کر دیا۔

تاثر اور تامل، تخیل اور تعقل، بے لاگ خارجیت اور تہہ گیر دور بینی، امر واقع اور صورت حال کے صحیح شعور اور معنوی مضمرات کا مکمل ادراک کیا ہے۔ جس نے مبہم یا واضح وجود کا صلیب کے زخم

میں جا بہ جا احساس نہ پایا جاتا ہو۔ لکھنے والی اظہار پر تو قدرت رکھتی ہی ہے لیکن ناول میں بہت سے ایسے مقام آتے ہیں جہاں وہ نیم اظہار اور اس سکوت کی بھی ماہر معلوم ہوتی ہے جس کو کارلائل سکوتِ بلیغ (Eloquent Silence) کہتا ہے۔

میں اس ناول کا اس لیے معترف ہوں کہ وہ المیہ نہیں بلکہ فوق الالمیہ (super tragic) کے نقطۂ عروج کو چھو لیتا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب و مشرق کی دُنیائے فکر و فن میں جتنے جدید میلانات اور جتنی پے در پے نئی تحریکیں ہوئی ہیں ان سب سے نوشابہ صدیق شعوری یا غیر شعوری طور پر صحت مند اثر قبول کرتی رہی ہیں۔ کیا رومانیت، کیا واقعیت، کیا نفسیاتی میلانات، کیا زندگی کا حکیمانہ ادراک، کیا لاشعور کیا شعور کی رو، کیا وجودیت اور کیا وہ غیر موسوم میلان جس کو میں ماورائے وجودیت کہوں گا۔

ان تمام میلانات و محرکات کے ارتعاشات ناول میں محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن شاید نوشابہ صدیقی ان میں سے کسی ایک سے بھی اندھی عقیدت نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسا ناول لکھ سکیں جس کو میں بہت بڑا ناول سمجھتا ہوں۔ لیکن جس کی نوعیت متعین نہیں کی جا سکتی۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد مجھے مغرب و مشرق کے بہت سے قصے یاد آ رہے ہیں جنہوں نے میرے ذہن پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں اور جن میں عورتوں ہی کے کردار شروع سے لے کر آخیر تک برتری کے ساتھ غالب رہے ہیں۔

ان میں ایک تو "زہرِ عشق" والی مہ جبیں ہے جو اپنی موت کا پورا نقشا درست کر کے عاشق سے آخری ملاقات کرنے آتی ہے اور اپنے اندر اتنی توانائی لیے ہوئے ہے کہ عاشق کی سچی یا جھوٹی دِگرگوں حالت کو بھی سنبھال لی جاتی ہے۔ اُس کا وصیت نامہ، آدمیت کا ایک مکمل کورس ہے اور اس کے یہ آخری الفاظ:

دل میں لے کر تمہاری یاد چلی
باغِ عالم سے نامراد چلی

کسی طرح ہمارے اندر نامرادی یا ناکامی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے۔ دوسری عورت

ہیسٹر پرائن(Hester Prynne)ہے جوNathanniel Hothon کے مشہورِ روزگار ناولThe Scarlet Letter کی ہیروئن ہے۔ وہ ایک پادری کے ہاتھوں غارت ہوکر جیل جاتی ہے۔اور جب جیل سے باہر آتی ہے تو اُس زمانے کے دستور کے مطابق وہ قانوناً مجبور ہے کہ اپنے کُرتے کے سینے پر ایک سرخ نشان لگائے رہے گی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اچھوت ہے۔ اُس کی گود میں ایک بچی ہے جو اس انداز میں رہ رہ کر سرخ نشان کو دیکھتی ہے کہ جیسے اس پر اس کے متعلق وحی نازل ہو رہی ہو۔ اس سے بار بار پوچھا جاتا ہے۔لیکن وہ اپنے بہکانے والے کا نام نہیں لیتی۔اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس پادری کو بار بار اس کے سامنے آنا پڑتا ہے،اُس کو دُعائیں دینے کے لیے۔آخر کار پادری کا ضمیر جاگ اُٹھتا ہے اور وہ خود اپنی لغزش کا اعلان کر دیتا ہے۔ لیکن ہیسٹر پرائن، پھر اس کے پاس نہیں جاتی اور ایک پندار کے ساتھ اس سے الگ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔

تیسری عورت ٹالسٹائی کے شاہ کار ناول کی ہیروئن اینا کیرینینا (Anna Karenina) ہے۔ وہ ایک امیر گھرانے کی شادی شدہ عورت ہے اور ایک دوسرے نوجوان امیر زادے کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کا شوہر نہایت میکانکی انداز میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کو اپنے سے الگ بھی نہیں کرتا۔ اور وہ اوباش مزاج ولانسکی کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہے۔ وہ اس سے ایک بچے کی ماں ہو چکی ہے۔ اور ولانسکی اس مزاج کا ہے جو روز رات کو ایک نئی عورت کو بت کی طرح پوجتے ہیں۔ اور صبح ہوتے ہوتے اس کو غلاظتوں کے ایک ڈھیر کی طرح ٹھکرا دیتے ہیں۔ ٹالسٹائی اس ناول میں جہاں تک المیاتی بحران کے حل (Resolution) کا سوال ہے میرے خیال میں کامیاب نہیں رہا۔لیکن اینا کرینینا اپنی تمام آلودگیوں اور افتادگیوں کے باوجود بہت بڑی شخصیت رہ جاتی ہے۔

چوتھی عورت تھامس ہارڈی کی اختراع فائقہ ناول کی ہیروئن Tess ہے۔ جو پے در پے معصوم لغزشوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی اتنی عظیم ومقدس ہے کہ خود اس کا مصنف اس ناول کا ذیلی عنوان ایک پاک عورت(A Pure Woman) لکھتا ہے۔

یہ عورتیں میرے دل میں چھپی ہوئی جراحتوں کی طرح اب تک خلش پیدا کرتی رہی ہیں۔

سلینا ان گنائی ہوئی عورتوں کے درمیان کسی قسم کی مناسبت یا مشابہت نہیں رکھتی ہے لیکن وہ مجھے ان سے زیادہ نہیں تو ان ہی کے برابر برتر اور پاک معلوم ہوتی ہے۔

واقعات کی ترتیب، کرداروں کی اندرونی تہوں کی عکاسی، نازک لمحات کا فطری ڈرامائی انداز میں بیان مختلف کرداروں کے مختلف موقعوں پر مکالمے، ہر اعتبار سے ناول معیاری ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ناول نفسِ مطلب اور رمزیہ (Allegory) دونوں کو ایک مزاج بنا کر پیش کرتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ناول تعریف سے مستغنی اور تنقیص سے بالاتر ہے۔

مجھ سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ناول میں کوئی نقص بھی نظر آیا یا نہیں۔ ہاں ناول میں صرف ایک نقص ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جس کا نقص سے بالکل پاک ہونا بڑا خطرناک ہے۔

مجھے ناول کا نام پسند نہیں۔ میں ہوتا تو کچھ اور نام دیتا۔ جس پر شاید مجھ پر ہر طرف سے ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگتی۔ لیکن یہ ناول کا کوئی نقص نہیں ہے۔ یہ یا تو واقعی نوشابہ صدیقی کی اپنی پسند ہے یا سماج اور ماحول کی مصلحتوں کا تقاضا ہے۔

نوشابہ صدیقی سے مجھے ایک بہت بڑی شکایت ہے۔ مگر پھر یہاں اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی بصیرت کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہیں درمیان میں میر کو مستِ الم یا یاس پرست شاعر کہا ہے۔ میر کی شاعری کو ہم قنوطیت کی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف غم کے شاعر نہیں۔ ان کی آواز میں صرف دُکھ کی آواز نہیں تھی۔ وہ اس نشاط کے شاعر تھے جو صرف غم سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس سرور کے شاعر تھے جو سارے دکھ کو اپنے ریشے ریشے میں جذب کر کے اور اس پر عبور پا کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں غم یا دکھ ایسے مقام پر پہنچا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کو سمجھنا یا ادراک کو تعقل کے احاطے میں لے آنا محالات سے ہے جس کے بارے میں ورڈز ورتھ کہتا ہے کہ وہ ازل تا ابد کی پہنائی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہ صرف میرا احساس ہو، اور غلط ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ اور بہت سے دوسروں کی طرح نوشابہ صدیقی ہی کا خیال صحیح ہو!!

مجنوں گورکھپوری

☆☆☆

منفرد تحریر

رفیع الدین راز

نوشابہ صدیقی کے ناول نہ صرف یہ کہ اردو ادب میں ایک منفرد تحریر ہیں بلکہ اس لیے بھی ان کے ناولوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ مصنفہ نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو کہ ایک اچھوتا موضوع ہوتے ہیں انہوں نے ماحول سازی کے ساتھ ناظر کو جزویات کے ساتھ اس طرح رقم کیا ہے کہ تمام مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزرتے محسوس ہوتے ہیں۔

آپ ناول "صلیب کے زخم" پڑھیئے تو سلینا اور انور آپ کو اپنے ساتھ چلتے محسوس ہوتے ہیں۔ ناول زندگی بھر کی بات تو ہر طالب علم کی اپنی کہانی ہے جو وہ اپنی درس گاہ میں چھوڑ آتا ہے مرکزی کردار عمرانہ آپ کو ہر ہر قدم پر یاد آئے گی۔ یہی نوشابہ صدیقی کی تحریر اور کردار سازی کا کمال ہے۔

☆☆☆

نوشابہ... میرے بچپن کی قلم دوست

عرفان عابدی

نوشابہ صدیقی افسانہ نگار ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ خاکہ لکھنے میں بھی مہارت رکھتی ہیں ۔ وہ ایک گداز دل رکھنے والی حساس شخصیت ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زبان کی انفرادیت واقعات کی جاذبیت اور طرزِ بیان کی خوب صورتی نے ان کی کہانیوں کو ادب کی زندہ دستاویزات میں تبدیل کردیا ہے۔

میں نے ان کی تمام کتابیں پڑھی ہیں اگرچہ وہ اپنی تحریریں چھپاتی ہیں اور کتاب پر کتاب آتی ہے جاتی کہاں ہے معلوم نہیں۔ مگر وہ میرے بچپن کی قلم دوست ہیں۔ کسی نہ کسی طرح کتاب حاصل کر ہی لیتا ہوں۔ اچھا لکھتی ہیں۔ اچھا سوچتی ہیں۔ شخصیات پر لکھنا انہیں اچھا لگتا ہے اسی لیے ان کے دو خاکوں کے مجموعے آچکے ہیں اور خوب ہیں۔

سرِ شام

صبیحہ اخلاق

یوں عہدِ قلم اپنا نبھاتی ہے سرِ شام
وہ طرزِ طرب سے بھی دلاتی ہے سرِ شام
اک ایک گراں مایہ وفا کیش کا قصہ
لکھتی ہے تو اک چھب سے سناتی ہے سرِ شام
وہ صورتیں جو خاک میں پنہاں ہوئیں ان کو
اشکوں کو چھڑک کر کے جگاتی ہے سرِ شام
گرچہ یہ مصور نہیں پر رنگ قلم سے
تصویر عہد خوب بناتی ہے سرِ شام
اشکوں کے طلاطم میں تبسم کی دھنک بھی
برسات میں اک دھوپ سی لاتی ہے سرِ شام
بے مثل حکایات کو یادوں سے چرا کر
انمول خزانوں کو لٹاتی ہے سرِ شام
اس شہرِ پُر آشوب کی آندھی کے مقابل
امید کی اک شمع جلاتی ہے سرِ شام
نسیاں زدہ بستی کو جگانے کی غرض سے
الفاظ کا سازینہ بجاتی ہے سرِ شام
جملوں میں ہیں پنہاں پیغام نئی نسل کی خاطر
تقریر کو تعلیم بناتی ہے سرِ شام

چشمِ حیراں

تبصرہ: ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

پیر، ۱۷فروری ۲۰۲۵

سال رواں کی تیسری کتاب پروفیسر نوشابہ صدیقی کی "چشم حیراں" رہی۔ مشتاق احمد یوسفی کا لکھا بھی یاد رہے، "اگر کوئی شخص ایک بار پروفیسر ہوجائے تو وہ ساری عمر پروفیسر ہی رہتا ہے۔ خواہ بعد میں وہ سمجھداری کی باتیں کیوں نہ کرنے لگے"

کتاب کے فلیپ پر پروفیسر صاحبہ کے better half نثار اختر صاحب نے اپنی تحریر بھی یوسفی کے اسی جملے سے شروع کی ہے۔ ان کی تحریر یوسفی کے بیان کی تائید کر رہی ہے مگر مثبت معنوں میں گویا ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مصنفہ کے اندر کا پروفیسر جوان وتوانا ہے۔

اکادمی بازیافت سے چھپی ہوئی اس کتاب کا افتتاحیہ "اپنی بات" پڑھا تو سوچا چلو غلطیاں ہم سے ہی نہیں اوروں سے بھی ہوتی ہیں۔ اپنی بات میں مصنفہ نے انکشاف کیا کہ کتاب کا مسودہ مع پیشگی زر اشاعت ایک پبلشر کو دیا اور جب معلوم کیا تو پبلشر کی طرف سے جواب آیا کہ مسودہ آپ کے گھر میں ہی کہیں ہوگا۔ اس پر پروفیسر صاحبہ دل تھام کے رہ گئیں۔

اب میں ہوتی تو اس بے ایمان پبلشر سے پوچھتی میاں اگر مسودہ میرے گھر میں ہی ہے تو آپ نے رقم کیوں ہضم کر لی، وہ بھی میرے گھر بھیج دیتے

بہر حال مصنفہ نے چونکہ مسودے کا عکس (فوٹو کاپی) نہیں رکھی تھی لہذا انہیں یہ سارے خاکے اور مضامین دوبارا لکھنے پڑے۔

یہ چوبیس مضامین سب کے سب خاکے نہیں ہیں بلکہ بعض مضامین اور خطوط بھی ہیں، سر سید احمد خان کو لکھے جانے والے یہ خطوط نہ کبھی پوسٹ ہوئے، نہ عدم آباد پہنچے، نہ انہوں نے پڑھے مگر مصنفہ کی کتھارسس ضرور ہوگئی۔

نوشابہ جو خاکہ لکھتی ہیں اس میں اپنی یادیں پروتی چلی جاتی ہیں قلم کی بے ساختگی ...... روزمرہ کے مکالمے ..... جزئیات نگاری ان مضامین میں سب کچھ مل جاتا ہے، ساتھ ہی مصنفہ سے بھی یہیں ملاقات ہوجاتی ہے۔ نوشابہ جتنا برجستہ بولتی ہیں، اتنا ہی برجستہ لکھتی بھی ہیں۔

کتاب کے بعض خاکے واقعی خاکے ہیں مثلاً جمیل جالبی، انور شعور، شفیع عقیل کے علاوہ اپنی والدہ کا خاکہ۔ بعض خاکے تاثراتی مضامین ہیں جن میں ممدوح کی شخصیت کا کوئی ایک پہلو ہی جھلکتا ہے مگر مایوسی وہاں بھی نہیں ہوتی۔ یہ کتاب رات دو بجے ختم کی، کراچی رات دو بجے تک جاگتا ہے یہ سوچ کر مصنفہ کو واٹس ایپ کیا کہ ابھی ابھی "چشم حیراں" ختم کی ہے۔ فوری جواب ملا "کیوں اپنا وقت ضائع کرتی ہیں"۔

اب اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

A heartful journey through tearful travels

Dr Aziz Ahsan

I was gifted this precious book (Moist- eyed, travelogue: translation of the book titled "chasm e num" in urdu) by Professor Naushaba Siddiqui, on Tuesday 9th July 2024, coinciding with the second of Muhram al Haram 1446AH.

Though I initially struggled to find time for its journey, by Monday, 24th Rabi us sani, 1446 AH, which was on October 28, 2024, I became engrossed in its captivating narrative. With deep sentiment and reflection, I completed the last page of the book on 26th of Rabi ul Sanni, 1446 AH, the 30th day of October 24, resonating with the author's emotions throughout.

In the foreword, Mr Nisar Akhtar, the author's husband, wisley advised to keep a handy supply of tissues nearby, as tears are inevitable while delving into this poignanat travelouge. his words proved prophetic as every page unfurled a tale of unspoken sorrow and heartful longing.

The story revolves around Naushaba Siddiqui, an orphan girl in search of her father's grave in Aligarh after a span of 60 years. Her poignant journey back to India, marked by bureaucratic obstacles and border tensions culminates in a soul stirring exploration of her roots. Amidst the ruins of her ancestral legacy and the fading memories of her forefathers, Naushaba's

quest unveils a narrative of loss, resilience and the enduring ties that bind.

The most emotional portion of the book depicts the struggle for searching for her father's grave, where she lost all composure in the depths of hopelessness, leading to tears. she vividly expressed her anguish saying, " I stood amidst the dead and addressed them out loud, this is not fair Baba, I came yesterday, I have returned again today. It seems like you donot wish to meet. I will leave the day after tomorrow. Is this fair? Since the time I could understand and recollect things, you have hidden here. I have waited for you all my life. and now that I am here, you are still not making it easy for me. This is not fair Baba. (P 16)

Continuing in a hysterical condition, she desperatley implored, "I have come from very far away. Please meet me baba. Please baba, please." (p16)

Then fortunately she found the compassionate caretaker, Rafiq, who aids her in locating her father's grave, a miraculous turn of events that transcends mere coincidence. Reflecting on the poignant moment of finding her father's grave, she wrote:

"As I tirelessly cleared the weeds and brushed off the tombstone throughout the day, I wondered if this was the grave that held immense siginificance for me. And it was! My father must have heard my voice and guided me to his resting place. Overwhelmed with relief, tears streamed down my face

continously, as I was beyond words. I'm certain you did not want me to leave without meeting you. Some say those in the graves can hear us and they even respond, but we cannot hear them." (p 166)

At this moment she found solace and expressed her gratitude to Allah, noting, "I was incredibly thankful to Allah Almighty. The 22nd of May marked the first day I met my late father within my living memory." (p19)

Professor Naushaba Siddiqui proudly details how her father, Hasan Abdullah, was appointed as a steward, against his aspirations to be a professor. She recounts Professor Rasheed Ahmed Siddique's discerning opnion, " It was challenging to dispute the logic of the univeristy's officials that while a professor in urdu could be found today, tomorrow, or later, finding a steward like Hasan Abdullah is impossible. (p40)

These reflections not only inspire the stewardship of Hasan Abdullah but also resonate with his descendants, particularly his daughter.

The travelouge meticulosly chronicles her journey through Aligarh, Delhi, Azamgarh,Ghazipur, Phetia, among other destinations. Each visit to these ancestral sites evoked profound sentiments of concern and sorrow for the deteriorating conditions of her forefather's legacy. She aptly describes her inward journey as "surreal", wherein she emotionally connects with the voices of her ancestors beckoning from various locations, guiding her

through the tumult of life.

Professor Naushaba finds comfort in the legacy left by her forefathers, which remain as eternal source of motivation and guidance during life's trials.

Even amidst deep sorrow, she finds moments of happiness that offer respite and solace, allowing her to occasionally enjoy the warmth of familial hospitality. For instance, during a Mushaira organized by Mr Ubaid in her honour in Ghazipur, she playfully remarked:

"My kalam had been stoled.... Allama Iqbal had stoled my kalaam and made it his own."

They all laughed. One poet said, "Well, you must remember the kalaam so do say something for it."

I read this couplet:

Delve into your soul to seek the clues for the purpose of life; if you cannot find me, atleast discover yourself. (p 105)

Amidst the backdrop of a divided past and a fractured present, Naushaba's unwavering pride in her Pakistani identity shines through. Her deep rooted connection to Karachi, her second birth place, underscores her enduring hope for a city steeped in history and resilience.

In conculsion, Moist- eyed Travelogue is a tapestary of intense nostalgia, intricate emotions and a poignant revelations. Professor Naushaba's narrative, a masterpiece of evocative storytelling, invites reader's to embark on a journey of

rememberence, refelection and the enduring power of familial bonds.

This book with its vivid portrayl of loss and resiliance, delicate balance of sorrow and solace, and unyielding hope for reconciliation stands as a timeless testament to the human's spirit's capacity for healing and forgiveness. I found the book to be a deeply moving and introspective exploration for loss, longing and the enduring ties that bind us to our past.

I am unable to access the original urdu script of the book which limits my understanding of the text.

However, I am confident that the English adaptation by the author's son, Asher Noor, effecivley captures the essence of the content. I take this oppurtunity to express my deep sense to congratulate the author, for having a son who dedicated his time and effort to undertake such a challenging task solely to bring joy to his mother.

Dr. Aziz Ahsan

Friday, 28th Rabii ul Sani, 1446 AH, 1st November 2024

☆☆☆

By Sheema Asher

I am so glad my dad translated my grandmother's book which was a travelogue about visiting her ancestral home after more than half a century. It allowed me to not only read a very moving story but also get great insights into my family history.

My grandmother is an inspiration to all of us in her and our family. As a college principal, a professor, an author and a mother and grandmother. she has excelled in all her roles. I have been lucky enough to have visited her college in Karachi as well in the past.

As somebody from the global citizen generation where there is such an ease of mobility across borders, the story in the book is so shocking as it talks of the artificial barriers built between Pakistan and India, restricting their citizen's cross- border movements. It took my grandmother over half a century to be able to legally make a short visit back to her ancestral home!

I love the urdu poetry couplets that I found in the book and with the English translations it makes it so much easier to really enjoy them.

This book is a priceless treasure for me that I will always cherish. Thank you Dadi!

Sheema Asher. from Australia

(Granddaughter), age 20 years.

By Tarab Farhan

Reading Moist-eyed was not just like reading a regular travelogue, it was an emotional journey helping me understand my roots and more about my family.

It brought me joy and emotion flipping through every page of the book, pondering on my grandmother's life and her journey to fulfill her wish to see her father's grave in India and remember her childhood.

I felt like I was travelling alongside her, starring her joy, happiness and sorrows. One of the most striking aspects of the book is the way the emotions, the essence of travel and reflective experience are captured, truly bring the words to life.

What I loved most about this book is the way it captures emotional moments, pride and joy creating a vivid picture of her experiences and memories of her life. This book has helped me understand my family background and has helped me become closer to her and to truly understand her in a way I've never before.

This book explores her life- long desires and dreams to visit India to visit her father's grave and reinstate her father's legacy as a university teacher. It explores her journey to India and cherish and remember her childhood memories bringing tears of

joy and reflection.

This book isn't just about travel, its about legacy, about the way memories shape us, and about how deeply human connections and experiences are passed on from one generation to another.

For anyone who enjoys travel writing that goes beyond sight seeing and into the realm of soul, this book is a must- read. But for me, it was something even more, time travelling to my grandmother's past, seeing her life through my own eyes and a reminder of how powerful and emotional stories can be in keeping history, love, connections and emotions alive.

Granddaughter, (Bahrain.)

Age 12 years

☆☆☆

Moist-eyed

By Maryam Jabran

My grandmother wrote a travelogue about her journey to India, in which she recounted ancestors who were among the founders of Aligarh Muslim University. Her grandfather was an IES Officer and a close friend of Dr. Ziauddin Ahmed. From this travelogue, I also learned that Sir Syed Ahmed Khan had a personal friendship with her great grandfather. Their home was a place where scientific thought and intellectual discourse was part of daily life.

The book entitled "Chashm- e - nam" is originally written in urdu. I am deeply grateful to my elder uncle (Asher Noor) for translating it into English under the title "Moist- eyed". Through this book, I have been introduced to my ancestors- an honor for me, as I discovered how truthful, upright and sincere my forebearers were. There are also some photographs inculded, each telling a story of its own.

I live in Australia and my knowledge in urdu is

modest, so it brought me a great joy to finally read and understand this work in english. I truly believe this book will be a source of pride for all of us and for generations to come.

Long live my Dadi (grandmother)

Age 16 years

from Australia

☆☆☆

نوشابہ صدیقی

انہیں اپنے فن، کرداروں اور ماحول پر مکمل گرفت حاصل ہے

نقد و نظر: تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

اردو ادب کی دیگر اصناف میں ناول ایک اہم صنف ہے، جو زندگی کو بہت خوبصورتی اور صحیح انداز سے اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ بے نقاب بھی کرتی ہے۔ کیونکہ ناول کی بنیاد انفرادی تجربات پر رکھی جاتی ہے اور کہانی کی مدد سے زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ ناول میں تمام واقعات کو ایک قاری محسوس کرتا ہے۔ یہی ناول کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ قاری ان واقعات اور حادثات میں خود کو الجھا ہوا پاتا ہے۔ بعض ناول ہمیں روزمرہ کی زندگی سے نکال کر منطق کی دنیا میں لے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی ادبی ناولوں کے دائرے میں رہتے ہیں۔ حالانکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہت خشک ہوتے ہیں۔

ہم نے بھی چند روز قبل نوشابہ صدیقی کا نہایت ہی اہم، دل پزیر، فکر انگیز، واقعاتی اور نفسیاتی تجزیاتی ناول "زندگی بھر کی بات" ختم کیا ہے جو ایک مخصوص دور، زمانے، ماحول اور حلقے کے افراد کی نصابی غیر نصابی اور عملی زندگی کی سرگرمیوں اور باہمی تعلقِ خاطر روابط کی تصویر کشی کرتا ہے۔ جامعہ کراچی ہمارے زمانے میں (اور جب ہم ہمارا زمانہ کہتے ہیں، تو یقیناً وہ ۱۹۶۰ء کی دہائی ہے) ایک البیلی بستی کہلاتی تھی۔ نوشابہ صدیقی نے خود کو شامل کرتے ہوئے ناول کے انداز میں اُسی دور اور بعد کی عملی زندگی کی کہانی لکھی ہے۔ جس کو پڑھ کر ہماری طرح دیگر نے بھی خود کو اس کا کردار سمجھا ہے۔ اور ایک دوسرے کو پہچان بھی لیا ہے۔ اور متفقہ طور پر اس ناول کو لائق مصنفہ کی سوانح عمری قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوانح عمری کو ناول کے انداز میں لکھنے کا یہ ایک نہایت کامیاب تجربہ ہے۔ اور یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ممتاز مفتی نے "علی پور کا ایلی" لکھ کر کیا تھا۔ ناول کا کینوس چونکہ بہت وسیع ہوتا ہے اس لیے اس میں تخلیق کار کا فن کھل کر سامنے آتا ہے اور وہ

فن کی گہرائیوں کے ساتھ اپنے جذبات کو پیش کرتا ہے۔"زندگی بھر کی بات"کی بھی یہی مثالی خوبی ہے کہ اس میں فن کار پوشیدہ رہتا ہے اور اس کے کردار بولتے ہیں اس طرح وہ اپنے سارے جذبات کرداروں کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔ یہاں ہم نوشابہ کی ایک اور خوبی کی نشان دہی کریں گے کہ وہ کس طرح اپنے فن سے اپنے کرداروں کو ابھارتی ہیں۔اور اپنے اس ہنر میں وہ حد درجہ کامیاب رہی ہیں۔۔کہ ان کے کردار نہ صرف اپنی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے طبقہ کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ یہ ان ہی کا کمال ہے۔۔کہ انہیں اپنے فن اور کرداروں اور ماحول پر کس قدر گرفت حاصل ہے۔

ایک کامیاب اور معیاری ناول کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پلاٹ حقیقی واقعات پر مبنی ہو۔ اس طرح ناول میں پلاٹ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ پلاٹ جتنا گٹھا ہوا ہوگا، ناول اتنا ہی جاندار ہوگا۔اگر پلاٹ ڈھیلا ہوتا ہے تو کردار پھیکے پڑ جاتے ہیں اور قاری کو پڑھنے میں لطف نہیں آتا۔ پلاٹ کی کمزوری دراصل ناول کی کمزوری بن جاتی ہے۔اس طرح بہت سے ناقدین کی رائے یہ بھی ہے کہ کسی ناول کو پرکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر ایک چیز کو الگ الگ دیکھا جائے اور تب کہا جائے کہ ناول کیسا ہے؟ کیا وہ حقیقی ہے؟ یا ہم کو کسی طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے یا محبت کی دنیا آباد کر کے ہمیں تاج محل بنانے کی رائے دیتا ہے۔ایسے ناول معیاری اور ادبی نہیں ہو سکتے ہیں۔ ناول کو پرکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جہاں اس کو الگ الگ دیکھا جائے وہاں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس نے قاری پر مجموعی تاثر کیا چھوڑا ہے اور اس میں ہمیں زندگی کی حقیقتوں کو ضرور تلاش کرنا چاہیئے۔"زندگی بھر کی بات" چونکہ حقیقی واقعات پر مبنی ہے اور اس کے تمام کردار ہمارے درمیان موجود ہیں۔لہٰذا ہمارے عہد کے اہلِ نقد ونظر نے اسے ایک اہم اور کامیاب ناول قرار دیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ناقدین نے اپنے یہاں کے ناولوں کو تکنیک کے اعتبار سے خانوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے،لیکن جو بات موضوعات کے سلسلے میں درپیش آتی ہے، وہی تقریباً تکنیک پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ تکنیک کا بھی کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے۔کوئی بھی ناول نگار کوئی بھی طریقہ جو اس کے مواد اور حالات یعنی ماحول کے مطابق مناسب سمجھے استعمال کر سکتا

ہے۔ وہی تکنیک ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نوشابہ صدیقی کے ناول "صلیب کے زخم" میں دیکھتے ہیں۔ مصنفہ کا یہ معیاری ناول زندگی کی حقیقتوں سے قریب ہے۔ ایسے ناول ہی ادب میں مقام پاتے ہیں، جن کا اسلوبِ بیان، پلاٹ، کردار، منظر نگاری، واقعہ نگاری اعلیٰ معیار کے ہوں۔ زبان سادہ، عام فہم اور کرداروں سے مطابقت رکھتی ہو۔ ایسے ہی ناول اردوادب کے لیے ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نوشابہ صدیقی کا کوئی بھی فن پارہ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ان کی تخلیق کے رموز، اس کے اسرار، فکر و احساس کے اتار چڑھاؤ، جذبات کی شدت وحدت، انسانی رشتوں کی تقدیس وتاثیر، الفاظ وبیان کی حرمت، اظہار کی توانائی، زبان کی نزاکت، رمز وکنایہ کی معنوی وسعتوں اور تشبیہ واستعاروں کی سحر انگیزیوں سے ان کی تخلیق کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ نوشابہ کے ناولوں اور کہانیوں میں ایک مربوط، منضبط اور تحریری فلسفہ حیات ملتا ہے۔ ان کی آگہی اور دانشوری اپنے عہد کے سماجی، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی حالات سے وابستہ ہوتی ہے۔ فکر وخیال کی عظمت، فلسفۂ حیات پر ایمان وایقان، اپنے عہد اور عہد ماقبل کے مکمل شعور انسانی معاشرے کی بہتری کے لیے ایک نا تمام تڑپ اور بنی نوع آدم سے سچے پیار کی پائیدار لگن نوشابہ صدیقی کی پہچان ہیں۔

سرِ شام نوشابہ صدیقی کے لکھے ہوئے شاہکار خاکوں اور مضامین کا متاثر کن ضخیم مجموعہ ہے۔ خاکہ کے ضمن میں کہا جاتا ہے کہ ایک کامیاب خاکہ نگار اپنے مطلوبہ خاکہ (شخصیت) کے تمام خدو خال نمایاں نہیں کرتا بلکہ مخصوص الفاظ اور مخصوص انداز میں اس شخصیت کے انہیں خدو خال کی تصویر پیش کرتا ہے، جس سے اس کے مخصوص اور مطلوبہ ظاہری اور باطنی نقوش موثر انداز میں ابھر کر سامنے آجائیں۔ حلیہ نگاری اور مرقع نگاری اور مختلف واقعات کا ذکر خاکہ نگاری کے جملہ خصوصیات میں آتے ہیں۔ خاکہ نگار کو کس قسم کے واقعات کو اپنے خاکوں میں پیش کرنا چاہیئے اس سلسلے میں کوئی واضح اصول متعین نہیں ہے۔ انسان، آدمی ہونے کی بنا پر اپنے اندر کچھ کمزوریاں رکھتا ہے۔ خاکہ نگار اپنے ممدوح کو ایک فرشتہ بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ سرِ شام کو پڑھنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ نوشابہ نے اپنے تمام خاکے بیانیہ انداز میں قلم بند کیے ہیں اور ان شخصیتوں کی ایسی کامیاب، پراثر اور دل نشیں تصویر بنائی ہے کہ ان میں جان ڈال دی ہے۔ ان کی یہ تصویریں

ہمیں چلتی پھرتی یعنی متحرک نظر آتی ہیں۔اور قاری چند جملوں یا چند الفاظ میں اپنی پسندیدہ شخصیت کی خصوصیات اور ان کے اوصاف کی ایسی واضح اور مکمل تصویر دیکھتا ہے کہ اس کے سامنے اس شخص کا واضح تصور آجاتا ہے اور وہ اپنی چشم باطن سے ایسی شخصیتوں کو چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔

ایک کامیاب خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیرِ تحریر شخصیت کے کردار کو بخوبی سمجھتا ہو، بظاہر یہ کام جتنا سادہ نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے۔جب تک خاکہ نگار اپنے موضوع کے داخلی اور خارجی عوامل سے کما حقہ واقفیت نہ رکھتا ہو یعنی جب لکھنے بیٹھے تو زیرِ مطالعہ شخصیت کو تہہ درتہہ دیکھ سکے۔اور ایک خاص بات کہ خاکہ نگار کو انسان شناسی کا احساس ہو۔اس نے شخصیت کو قریب سے دیکھا ہو۔سمجھنے اور برتنے کا پورا پورا موقع ملا ہو۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نوشابہ صدیقی نے چند خاکے ایسی شخصیات پر بھی لکھے ہیں کہ جن سے وہ کبھی نہیں ملیں۔۔جن کا تعلق ان کے عہد سے بھی نہیں تھا۔اور نا ہی انہوں نے کبھی ان کی حیات و کارناموں پر نظر کی۔لیکن جب جب ایسی شخصیات کے لواحقین نے محض چند نشستوں میں لائق ادیبہ کو ان شخصیات کی عادات،اوصاف،علمی منزلت،تخلیقی سفر اور تصنیفی مطبوعات سے متعلق معلومات فراہم کی۔نوشابہ نے نہایت مشاقی کے ساتھ اس شخصیت کا ایسا قلمی خاکہ تخلیق کیا جس کو پڑھنے کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے موصوفہ اور اس شخصیت کا تعلقِ خاطر رہا ہو۔

نوشابہ صدیقی صاحبہ اپنی پہلی تخلیق سے لے کر آج تک اپنے معاصرین کے درمیان اسلوب کی ندرت،فکر کی رفعت،جذبات کی شدت اور ایک مخصوص آئڈیولوجی سے کمٹمنٹ نیز اظہار و بیان کی دلکشی کی وجہ سے منفرد اور ممتاز سمجھی جاتی ہیں۔

(اخبار ویکلی جیو پاکستان۔کینیڈا میں چھپا۔)

☆☆☆

چشمِ حیراں

ظفر اقبال، لاہور

(کالم دال دلیا) روزنامہ دنیا نیوز

پروفیسر نوشابہ صدیقی کی یہ کتاب خاکوں پر مشتمل ہے۔ مشاق احمد یوسفی کا یہ قول بھی شروع میں درج کیا گیا ہے کہ "اگر کوئی شخص ایک بار پروفیسر ہو جائے تب وہ ساری عمر پروفیسر ہی رہتا ہے خواہ بعد میں وہ سمجھداری کی باتیں کیوں نہ کرنے لگے" اسے اکادمی بازیافت کراچی نے عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ چھاپا ہے۔ انتساب ابا اور اماں کے نام ہے۔ اندرون سرورق کی تحریر نثار اختر کے قلم سے ہے۔ جن مشاہیر کا خاکہ لکھا گیا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں: جمیل جالبی، حسن مثنی ندوی، انجم اعظمی، ابراہیم جلیس، شفیع عقیل، جوش ملیح آبادی، حسنین کاظمی، مشتاق احمد یوسفی، عصمت چغتائی، سر سلطان آغا خان، مختار مسعود، انور شعور، نجم الحسن رضوی اور دیگران۔ ان میں سب سے دلچسپ مضمون/ انٹرویو مشتاق احمد یوسفی کا ہے جس میں سے چند اقتباسات پیش ہیں: اس سوال پر کہ بینک کا پہلا دن یاد ہے؟ فرمایا: "جی ہاں روز اول کی طرح آج بھی حفظ ہے۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ واسکٹ کی جیب میں نہایت قیمتی سونے کی گھڑی تھی جو ہماری پرسنیلٹی کے پس ماندہ حصوں سے جو سوٹ سے باہر نکلے تھے، قطعی لگا نہیں کھاتی تھی"

اب نثار اختر صاحب کی تحریر ملاحظہ ہو:

حیرت یہ ہے کہ خود معاشیات کی استاد ہونے کے باوجود آمدنی میں دلچسپی رکھنے کی بجائے خرچ میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ بچت کی تھیوری پر قطعی یقین نہیں۔ ان کا اپنا نظریہ یہ ہے کہ روپیہ اپنی حیثیت میں کاغذ اور دھات کا حقیر سا ٹکڑا ہے۔ اسے اشیا کی شکل میں فوراً تبدیل ہو جانا چاہیے اور وہ اشیاء کیا ہو، کپڑے، کتابیں اور کراکری۔ پروفیر صاحبہ نے صحافت سے آغاز کیا تھا۔ تدریس میں زندگی گذاری اور اب آخر میں پھر صحافت کی جانب آ گئی ہیں۔ سر سید احمد خاں کا رسالہ تہذیب

الاخلاق جوعلی گڑھ سے سفر کرتا ہوا کراچی آ گیا اور تہذیب کے نام سے ہر ماہ نکلتا ہے، اس کی مدیر ہیں۔ شاعر کی بہن، شاعر کی بیٹی، شاعر کی پڑپوتی۔ آگے تک شجرۂ نسب کھنگا لیے تو شاعری سے جان نہیں چُھوٹے گی، لہٰذا شاعری زیادہ پڑھتی ہیں لیکن خود کو نثر کا پابند کیا ہوا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد کالج کی تدریس میں چالیس سال گم ہو جانے کا ارادہ ہے۔ اپنی کتاب پر کسی سے مقدمہ لکھوانا پسند نہیں اور تعارفی تقریب سے بھی گریز کرتی ہیں کہ دو گھنٹے چار پانچ مقررین کی تعریف سے بھرپور باتیں، بغیر منہ چھپائے سننا مشکل ترین کام ہے۔ یوں تو پروفیسر صاحبہ پر میں خود بھی ایک ضخیم کتاب لکھ سکتا ہوں، مگر یہ کام تو جان کی امان پانے کے بعد ہی ممکن ہے"۔

پسِ سرورق مصنفہ کی تصویر ہے اور دیگر تصنیفات، جن میں صلیب کے زخم (ناول)، افکارِ حسن (مُرتبہ والد کی شاعری)، سرِشام (خاکے، مضامین)، زندگی بھر کی بات (ناول)، کلامِ اشرف، کمالِ حُسن (ترتیب وتدوین) دلِ شوریدہ (مُرتب) چشمِ نم (سفرنامہ) شامل ہیں۔

☆☆☆

چشمِ نم

محمد سلیم الرحمٰن ۔ لاہور
سابق اڈیٹر سویرا (ادبی جریدہ)
شاعر، افسانہ نگار، مترجم۔

یہ ایک سفرنامہ ہے جسے مصنفہ نے سادہ اور بیانیہ زبان میں تحریر کیا ہے اور یہ جذباتیت سے بھرپور ہے۔ کتاب میں "کاش سرحدیں نہ ہوتیں"، جیسے جملے جذباتیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ مصنفہ نے اس میں اپنی ذاتی زندگی اور مشاہدات کو بھی شامل کیا ہے جیسے ان کے بچے ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ جس پر وہ افسوس کا اظہار کرتی ہیں۔

☆☆☆

ایم یوسف بھٹی

روز نامہ اوصاف

کالم زیرِ آسمان ۔ دبئی

دنیا بھر میں کتابوں کے مترجمین کو بدیسی زبانوں کی کتب کا ترجمہ کرتے وقت متن کا اصل مفہوم ولطف برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ کسی بھی کتاب، مقالے یا مضمون کا اپنی ملکی زبان میں ترجمہ تو آسانی سے کیا جاسکتا ہے مگر تحریر کی بنیادی روانی اور سلاست کو قائم رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ گزشتہ ہفتے دو کتابیں زیر مطالعہ رہیں اور یہ کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ حسن اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتب مصنفین کے انڈیا یاترا کے تاثرات ہیں۔ پہلے پہل سفر نامے بڑے شوق سے لکھے اور پڑھے جاتے تھے جن میں مستنصر حسین تارڑ کی سفری روداد یں "ٹاپ آف دی لسٹ" ہیں۔ تارڑ صاحب وہ دلکھاری ہیں۔ ان کے بارے میں ازراہ تفنن کہا جاتا ہے کہ وہ غیر ملکی سیر و سیاحت کے دوران کسی ہوٹل میں ایک رات گزارتے ہیں تو وہ اس کا احوال بیان کرنے میں ایک پوری کتاب مکمل کر لیتے ہیں۔ لیکن تارڑ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ان کے سارے سفر نامے سلیس اردو زبان میں ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو پڑھنے سے ہندوستان، وہاں کے مقامی کلچر، لوگوں کی عادات، رویوں اور سیر گاہوں وغیرہ کے بارے میں میری معلومات میں تو کافی اضافہ ہوا ہے مگر سچی بات ہے کہ ان انگریزی زبان میں لکھی کتب پر اردو میں تبصرہ کرنا میرے لئے کافی مشکل تجربہ رہا۔

ایک کتاب کا اردو سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اردو میں اس کتاب کا نام "چشم نم" ہے جس کا انگریزی ٹائٹل "موئسٹ آئیڈ" Moist- eyed ہے۔۔ حالانکہ چشم نم کا انگریزی ترجمہ "برننگ آئیز" Burning-Eyes بھی کیا جا سکتا تھا۔ اردو زبان کے عظیم انشا پرداز مولانا محمد حسین آزاد آنسوؤں کو "آب حیات" کہا کرتے تھے اور پھر اسی کو عنوان بنا کر انہوں نے یہ کتاب

لکھی ۔ یہ کتاب (آب حیات) مولانا محمد حسین آزاد کی وہ تصنیف ہے جسے کلاسیکی شاعروں کا جدید تذکرہ شمار کیا جاتا ہے ۔چشمِ نم کی مصنفہ پروفیسر نوشابہ صدیقی ہیں اور اس کے مترجمین نثار اختر اور اشعر نور ہیں ۔ موصوف مصنفہ ابھی نوعمر تھیں جب قیام پاکستان کے وقت الگ اور آزاد وطن کی محبت میں (اور یتیمی کی حالت میں) وہ زندگی کا سب کچھ بھارت چھوڑ کر پاکستان آگئیں جہاں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے اکنامکس، ماس کمیونیکیشن اور اردو میں تین ماسٹر ڈگریز حاصل کرنے سے اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر درس وتدریس کے شعبہ سے منسلک ہوگئیں ۔ وہ ایک کالج کی پرنسپل کےطور پر فرائض انجام دیتی رہیں ۔انہوں نے پاکستان کراچی میں بطور پروفیسر اور پرنسپل پوری تین نسلوں کوتعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کیا۔ وہ متعدد دیگر کتابوں کی مصنف ہیں، بہت سے ایوارڈز حاصل کیئے اور پاکستان ریڈیو وقومی ٹیلی ویژن پر سیکڑوں پروگراموں کی کمپیئرنگ بھی کی ۔موصوفہ مرنجان مرجان شخصیت ہیں اور استادوں کی استاد ہیں ۔ایک استاد جب طلبا کو لیکچر دیتا ہےتو خوداس کا علم اور یادداشت بھی بڑھتی ہے ۔دراصل تعلیم وتربیت ایک ایسا تخلیقی عمل ہے کہ انسان کا علم جوں جوں بڑھتا ہے اس کی علمی تشنگی میں بھی توں توں اضافہ ہوتا ہے ۔ انسان میں جتنی بھی علمی وادبی وسعت آجائے وہ احساس تشکر کی وجہ سے اپنی مٹی یعنی" جنم بھومی" کو کبھی نہیں بھولتا ہے ۔نوشابہ صدیقی کو واپس بھارت جا کر اپنی آبائی پیدائش کو دیکھنے کے لیئے چھ دہائیوں یعنی 60 سال کا عرصہ لگا۔اس کے بعد 2014ء میں وہ دن آیا جب نوشابہ صاحبہ کو دو ہفتوں کے لیئے انڈیا جانے کا موقعہ ملا ۔ یہ لمحہ کتنا عجیب وغریب اور کیسی جذباتی کیفیات سے بھرپور ہوگا جب انھوں نے پاکستان اور بھارت کی تقسیم اور ہجرت کے 60 برس بعد دوبارہ ان بازاروں،گلیوں اور مکانوں کو دیکھا ہوگا جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی ۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بالخصوص ان کے بیٹے اشعر انور نے کیا ہے۔

☆☆☆

قدردانیِ عالمِ بالا.....

رشید بٹ۔ کراچی

فون کی گھنٹی بجی۔ نمبر کچھ نامانوس سا تھا۔ کون ہوسکتا ہے؟ میں سوچ رہا تھا اور گھنٹی تھی کہ بجے چلی جارہی تھی۔ میں نے فون اٹھالیا۔

"میری نئی کتاب کا ٹائٹل بنادو فوراً" نسوانی آواز میں کسی تھانیدارنی یا ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹرنی کا سا کھڑکا تھا۔ میں سمجھ گیا یہ کون ہوسکتی ہے۔

"سلام نہ دعا۔ چھوٹتے ہی حکم لگا دیا۔ تمہاری کئی کتابیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں بھی یہی گھاس کھودتا ہوں، مسودہ بغل میں دبا، مجھ ایسے گئے گزروں کی آنکھ بچا، پتلی گلی سے درشنی پبلشروں کی طرف نکل جاتی ہو۔ میرے حسابوں تو تمہاری نئی کتاب کوئی چھ مہینے پہلے چھپ جانی چاہیے تھی۔ اب کیا باڑھ بندھ گئی؟"

"دیکھو! بہت بول چکے۔ میں جو کہہ رہی ہوں بس وہ سنو۔ سمجھے! بس میں کل آرہی ہوں تمہارے دفتر۔۔ سر پر سوار ہو کے بنواؤں گی ٹائٹل۔ اب اگر کچھ بولے تو ابھی آ کے اتنا چیخوں گی کہ تمہارا "ماتحت عملہ" بھی گڑبڑا جائے گا۔ مت بھولو کہ پینتالیس برس سے تم میرے جونیئر ہو، عمر میں بھی اور یونیورسٹی میں بھی۔"

یہی تڑپ کا پتّا تو ہے تمہارے پاس کہ ڈھیر کر کے اپنے لیے ادب واحترام کا پھریرا لہرا دیتی ہو۔ ہاں بھئی، تو تڑاک کے باوصف تمہارا ادب اور احترام سرآنکھوں پر۔ دیکھو کل آنا تو لوڈ شیڈنگ کا شیڈول سامنے رکھ کر۔ ہمارے ہاں سہ پہر میں بجلی ہوتی ہے۔ اگلے روز دونوں میاں بیوی آ گئے۔

میں نے انہیں کمپیوٹر پر ڈیزائنر کے ساتھ بٹھا دیا۔ گھنٹے بھر میں اُن کی مرضی کا ٹائٹل تیار ہو گیا۔ کلر پرنٹ کے ساتھ CD میں کاپی کر دیا کہ اب لے جاؤ۔ "یہ تمہاری نئی زیرِطبع کتاب" کا "نا

خدا" ہے۔اب تو کشتی کنارے لگ جانی چاہیے۔"

یہ نوشابہ صدیقی تھیں (بلکہ ہیں)۔نوشابہ میری سینئر یوں بنیں کہ جب میں نے 1966ء میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں داخلہ لیا تو وہ ایک ایم اے کر چکی تھیں اور دوسرے کے لیے مجھ سے چندروز پہلے شعبہ صحافت میں داخلہ لے چکی تھیں۔ میں چوں کہ روزنامہ جنگ کراچی میں سٹی پیج کے انچارج کی حیثیت سے با قاعدہ ملازمت کر رہا تھا لہٰذا کچھ دن اس سوچ بچار میں گزر گئے کہ یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لوں یا ایکسٹرنل اسٹوڈنٹ کے طور پر۔اس وقت پاکستان بھر میں کراچی یونیورسٹی ہی واحد یونیورسٹی تھی جہاں ایکسٹرنل داخلے کی سہولت موجود تھی اور اسی سہولت سے فیض یاب ہونے کے لیے میں نے راولپنڈی سے کراچی "ہجرت" کی تھی۔اس سے قبل تین یا چار سال کی عمر میں،خواب کی مانند یاد ہے کہ جموں سے سیالکوٹ تک لگ بھگ 27 میل کا ایک پل صراط،جس کے نیچے خون کا دریا بہہ رہا تھا، پار کرتے ہوئے پہلی ہجرت کی تھی۔ یہ طویل جملہ معترضہ بیچ میں کہاں سے آن ٹپکا؟ میں تو بات کر رہا تھا سنیارٹی کی۔ میں نے نوشابہ کو ہمیشہ سینئر اور محترم جانا اور اُس نے بھی اپنے بڑے پن کے دُلار میں کمی نہیں آنے دی۔ویسے اس کے دلار میں تیرے میرے کی کوئی تخصیص نہیں۔ وہ 45 سال پہلے بھی بنی بنائی "اماں" تھی اور آج بھی ہے۔ کسی کا کوئی مسئلہ ہو،کوئی اُڑ چن ہو۔اُس سے نمٹنے یا نمٹانے میں ہمیشہ آگے آگے۔ میں اُس زمانے میں پاکستان کے "دوست" کمیونسٹ ملک چین کے لیے یہاں ترجمے کا کام کرتا تھا۔کسی کمیونسٹ ملک سے رابطہ رکھنے کے "جرم" کی "پاداش" میں نگراں امتحان نے کسی "بڑے" کے بنے بنائے پلان کے تحت میری کاپی چھین لی۔تب سارے ہی کلاس فیلو میری حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ اُس وقت طاہرہ اور نوشابہ نے شیخ الجامعہ تک پہنچ کر میری بے گناہی کیسے کیسے نہ ثابت کی۔ یہ وہ لمحہ تھا جو میری طالب علمی کے زمانے کا نہ بھولنے والا واقعہ بن گیا،آج تک اپنے پن کا یہ احساس مجھے سرشار رکھتا ہے۔نوشابہ سے جلدی جلدی ملاقات نہ بھی ہو مگر جب بھی ہم ملتے ہیں وقت سمٹ جاتا ہے۔قربت بڑھ جاتی ہے اور محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ مجھے یونیورسٹی سے دوسال کے لیے نکال دیا گیا تو چینی یہاں سے اٹھا کے پیکینگ

(بیجنگ) لے گئے اور میں نے وہاں آتے جاتے لگ بھگ 16 سال بِتا دیئے۔

دوسرا فون مہینہ بھر پہلے آیا۔ اُسی چیخ پکار کے ساتھ۔

"اب کیا ہوا۔" میں نے ہمیشہ کی طرح دھیرج سے پوچھا۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح نامہربانی کے سے انداز میں بولی "تم پر احسان کرنے آ رہی ہوں۔ اپنی نئی پرانی ساری کتابیں تمہیں دوں گی۔ تمہیں بھی کیا؟ بھاوج کو دینی ہیں۔ پڑھنا لکھنا آتا تب تمہیں بھی دے دیتی۔"

اس سے پہلے کہ میں احتجاج کرتا، اُس نے فون بند کر دیا۔

ایک بات کہوں۔ نوشابہ رشتوں اور دوستیوں کی پیاسی ہے۔ میری بیوی حمیرا اطہر خود ایک معروف صحافی ہے اور دونوں میں پرانی شناسائی بھی ہے۔ لیکن نوشابہ اسے کبھی نام سے نہیں پکارتی۔ ہمیشہ بھاوج کہتی ہے۔ اُسے یہ رشتہ اچھا لگتا ہے۔ اُس کی تحریریں دیکھیں تو ایسی بات بھی نہیں ملتی کہ اُسے ددھیالی ننھیالی رشتوں سے کوئی زک پہنچی ہو۔ بس یوں لگتا ہے اس ناتے سے اُس کی پیاس گویا چھلنی کی پیاس ہے۔ حمیرا اطہر کے فکاہیہ کالموں کی کتاب "بات سے بات" چھپی۔ اُس کی تقریبِ پذیرائی ہوئی۔ کچھ عرصے بعد اکادمی ادبیات پاکستان کے آغا نور محمد پٹھان کی طرف سے فکاہیہ نثری اور شعری تخلیقات پر انعامی مقابلے کا اعلان ہو گیا۔ حمیرا نے بھی اپنی کتاب بھیج دی۔ مہینوں بیت گئے۔ سب بھول بھال گئے تھے کہ اکادمی کی طرف سے نتائج کے حوالے سے تقریب کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ باسی کڑھی میں گویا اُبال تھا۔ بہت ہڑک اٹھی نتائج جاننے کی لیکن ناکامی ہوئی۔ تقریب میں گئے تو اعلان ہوا کہ "بات سے بات" کو بہترین تخلیق قرار دیا گیا ہے۔ ججوں میں ذاکر علی خان، کلیم چغتائی اور نوشابہ صدیقی شامل تھے! اوّل تو اُن ناموں تک ہماری پہنچ ہی نہ تھی، دوسرے، یہ گمان تک نہ تھا کہ نوشابہ بھی ایک جج ہوں گی۔ یہ اس کی فرض شناسی، احساسِ راز داری اور راست بازی کا منہ بولتا ثبوت تھا ورنہ اعزاز تو دُور کی بات ملتا نہ ملتا مگر احسان لادلا دکر ادھموا کر دیا جاتا۔ اور شہر میں ڈھنڈورا الگ پیٹا جاتا۔ اردگرد تو ہم نے ایسا ہی ہوتا دیکھا ہے۔ مگر یہاں تو نہ پہلے نہ آج تک ایسا ہوا کہ اس واقعے کو کسی ملاقات میں بھی اُس نے دہرایا ہو۔ یہ بھی نوشابہ کے مزاج کا بڑا مثبت پہلو ہے۔

اگلے روز بھاری بھر کم "جہازی" سائز کا ایک لفافہ اٹھائے نوشابہ واقعی میرے دفتر آ گئی۔ اُس کے ہمزاد نثار اختر بھی ساتھ تھے اور اُنہوں نے دوسرا لفافہ سنبھال رکھا تھا۔ پہلے تو اُس نے اپنی چاروں کتابیں میرے اور حمیرا کے نام آٹو گراف کے ساتھ دیں اور پھر بھاری بھر کم لفافے سامنے رکھ دیے۔ اُن میں نوشابہ کی دادی اشرف النساء کا کلام تھا۔ دو ڈھائی سو صفحات پر پھیلا حمد و نعت اور منقبتوں کا مجموعہ، جسے بڑے اہتمام کے ساتھ صاف ستھری تحریر میں نقل کیا گیا تھا۔ میں مسودے کی ورق گردانی کر رہا تھا اور وہ تھی کہ کسی کاما، فل اسٹاپ کے بغیر مسلسل بولے جا رہی تھی۔ ہدایات اور احکامات کا دریائے پرشور، جھاگ اڑاتا بہہ رہا تھا۔ "کوئی کاغذ ادھر اُدھر نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ کھو نہ جائے۔ کمپوزنگ میں اُلٹ پھیر ہوا تو سمجھو پٹ جاؤ گے میرے ہاتھ سے..."

ایک تو اُسے پیٹنے کا بہت شوق ہے۔ ماسٹرنی جو ٹھہری۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا، "پر یہ تو بتاؤ کہ اب تک جن سے یہ کتابیں چھپوائی ہیں، اُن ہی کے ہاں یہ نیا مسودہ کیوں نہ لے کے گئیں؟"

"ایک تو تم غیر ضروری بات ضرور کرتے ہو۔" وہ غرائی "میں جو کہہ رہی ہوں وہ سنو اور جو کہہ رہی ہوں وہ کرو ورنہ......"

"ورنہ پٹو گے میرے ہاتھوں۔" اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں۔ نے بات اُچک لی۔

اور وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "کچھ کچھ سمجھدار ہو گئے ہو۔"

"اس کی کمپوزنگ کب تک ہو جائے گی۔ کچھ اور میٹر بھی ہے۔" اب سوال میں مبہم سا گریز بھی تھا۔

"میں پہلے مسودہ اچھی طرح دیکھ تو لوں۔ جب کمپوزنگ ہو جائے گی تو تمہیں فون کر دوں گا۔ پیٹنے کی تڑی اتنی بار لگا چکی ہو کہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑیں گے ورنہ لوگ تو یہی دیکھیں گے ناں کہ ایک بوڑھا آگے آگے دوڑے جا رہا ہے اور ایک بڑی اماں لٹھیا لیے پیچھے پیچھے ہے۔ ہاں دوڑنے پر یاد آیا کہ جب سے سرجنوں نے میری بائیں ٹانگ سے جسم کا ایک "فاضل پرزہ"،

یعنی نس نکال کے دل کی نسوں کو "رفو" کیا ہے، میں اچھی طرح دوڑ بھی نہیں لگا سکتا۔ اس سارے مکالمے کے دوران نثار اختر مسکراتے جا رہے تھے اور حسب ضرورت اور حسب توفیق " آگ لگاتے نہ چلو" ایسی کیفیت میں لقمے دیتے جا رہے تھے۔

"اچھا بہت ہو گیا اب مجھے کام کرنے دو۔ اگر دادی کی کتاب چاہیے تو"

مسودہ خواہ کتنے ہی بڑے لکھاری کا ہو۔ ہر مشکوک لفظ پر اٹک کر لغت کھنگالنا شروع کر دیتا ہوں۔ دیر تو پھر ہوگی ہی۔ نوشابہ میری اس عادت سے خوب واقف ہے۔ جب ہی تو اُس نے میرا نام "کیڑا" رکھا ہوا ہے۔ محفل ہو یا محض آمنے سامنے والی ملاقات مجھے بس یوں ہی پکارتی ہے۔ "کیڑے" میں جا رہی ہوں۔ وہ ایک دم سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ساری لغت کو آگ لگا دینا۔ اور جو مسودہ میں نے دیا ہے جوں کا توں چھاپ دینا۔ دیر ہوئی تو دیکھ لوں گی۔ وہ یہ جا اور وہ جا۔ میں پھر بھی حسب عادت مسودہ لے کر بیٹھ گیا اور اب تک بس اُسے ہی لیے بیٹھا ہوں۔ لغت بھی سامنے ہے۔ ہاں جب وہ آتی ہے لغت چھپا دیتا ہوں۔

میں نے دادی اشرف النساء کا کلام جو کھنگالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ اشرف النساء تو "چیزے دیگری"۔ یہ کلام کی زبان، اُردو، پوربیا بولی، آج متروک اور قدیم سمجھے جانے والے الفاظ کا بے دریغ استعمال، رواں بحریں، مترنم ردیف قافیے، اسالیب، صنعتِ لفظی اور رعایتِ لفظی، ضرورتِ شعری سب کے ڈانڈے بیسویں صدی کے زمانۂ اوائل سے جا ملاتے ہیں۔ اُس دور کی ایک نیم پڑھی لکھی گھریلو خاتون کا ذخیرہ الفاظ، صنائع بدائع، اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی الفاظ کا برمحل، باموقع اور بامعنی استعمال ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ انگریزی میں اتنی شد بد تھی کہ حروف ملا کر تار پڑھ لیتی تھیں کہ اُس زمانے کا یہی تیز ترین وسیلۂ اظہار تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بسا اوقات جذب وارادت کے تصرف نے انہیں بحر، وزن اور الفاظ کی جکڑ بندیوں سے ماوراء کر کے پٹری سے اتار دیا۔ کہیں تو یوں لگتا ہے گو یا کوئی پٹھانی یا پٹھان اُردو میں نعت کہہ رہی یا کہہ رہا ہے۔ مثلاً

بخت خوابیدہ میرا سوتا تھا
آج بگڑی بنا دیا کس نے؟

اشرف النساء کے حمدیہ، نعتیہ اور مدحیہ مجموعۂ کلام پر ایک نظر ڈالنے کے لیے مذکورہ طولانی تمہید اٹھانا ضروری محسوس ہوا کہ اُن کے کلام میں جا بجا یہی کیفیات ملتی ہیں لیکن اک گونہ ندرت کے ساتھ۔ ہاں ایک بات اور ذہن میں رکھنا پڑے گی کہ اُن کا کلام، اُن کی زندگی میں یا اس کے بعد کبھی بھی کہیں چھپا یا شائع نہیں ہوا کہ کوئی پڑھ کے اُس پر اظہار رائے کرتا۔ اُن کی بیاضیں بند ہوئیں تو بس بند ہی رہیں۔ ہاں سننے میں یہ آیا ہے کہ وہ محافل میں پڑھتی ضرور تھیں۔ ان کے میاں مولوی ابوالحسن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انڈین ایجوکیشن سروس (IES) کے رکن تھے۔ اس حیثیت میں نہ صرف محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے بلکہ کچھ عرصہ ریاست جموں و کشمیر میں ڈیپوٹیشن پر ڈائریکٹر تعلیمات کے طور پر بھی گزارا۔ ریاست کشمیر میں وہ زمانہ مہاراجہ ہری سنگھ کے اقتدار کا تھا۔ اور وہی اہم دور تھا جس کے دوران ریاست جموں و کشمیر میں حریت کا شعلہ بھڑکا۔ لیکن اس حوالے سے یا جس زمانے میں مولوی ابوالحسن وہاں تعینات رہے، اُن کی کوئی یادداشتیں نہیں ملتیں۔ پاکستان ہجرت کے بعد بھی اُنہوں نے کوئی ایسی تحریر نہیں چھوڑی جس کا تعلق اُن کے قیامِ کشمیر سے ہو۔ یا چھوڑی بھی ہو اور نوشتہ تک نہ پہنچ سکی ہو۔ حالانکہ اُنہوں نے یہیں (کراچی میں ہی) 1965ء میں انتقال کیا۔ میں نے اُن کے قیامِ کشمیر کے حوالے سے اُس دور کی کچھ کتابیں بھی کھنگالیں۔ یہاں تک کہ شیخ محمد عبداللہ کی سوانح "آتشِ چنار" تک (اس مخصوص حوالے سے لگ بھگ دسویں بار) دیکھ ڈالی لیکن کوئی حوالہ نہ ملا۔ واضح رہے کہ شیخ عبداللہ کو اپنے تعلیمی مدارج طے کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور دھن کے پکے اس فرزندِ کشمیر کو علی گڑھ تک جانا پڑا، جہاں سے ایم ایس سی کیا۔ اور اشرف النساء اور مولوی ابوالحسن کا کنبہ بھی تعلیمی اور علمی حوالے سے علی گڑھ ہی کے گرد گھومتا ہے۔

بہر حال اندازہ یہی لگایا جا سکتا ہے کہ اشرف النساء اپنا مجموعہ کلام چھپوانے سے از خود احتراز کرتی رہیں۔ اس میں اُن کے شوہر مولوی ابوالحسن کا کوئی دوش نظر نہیں آتا۔ انہوں نے تو خود اپنے

ابا یعنی اشرف النساء کے سسر حافظ محمد علی قاری کا فارسی مجموعہ کلام "کلیاتِ قاری" اُن کے انتقال کے بعد 1931ء میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے چھپوا کر شائع کیا۔ اپنی بیوی کا کلام چھاپنے اور شائع کرنے میں انہیں عار کیا تھی؟ نوشابہ کی زبانی مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے مطابق تو اشرف النساء جوشِ آمد میں اکثر ایسے الفاظ بھی استعمال کر جاتی تھیں جن کا مطلب خود انہیں معلوم نہیں ہوتا تھا اور اصلاح اور مسودہ صاف کرتے وقت ایسے الفاظ کا مطلب اپنے شوہر مولوی ابوالحسن سے پوچھا کرتی تھیں۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ ایک بڑے علمی گھرانے کی فرد تھیں اور اپنے تئیں اپنی کسی غلطی پر شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھیں۔

اشرف النساء کے زمانۂ حیات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اُن کے کلام میں قدماء، ان دنوں بلکہ دورِ حاضرہ کے بھی حیرت انگیز حد تک مانوس، معروف اور قبول عام کا درجہ رکھنے والے مترنم شعری بول، ردیفیں اور قافیے ملتے ہیں۔ اُن میں بعض جگہ تو لوک دھنوں کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ اُس کا تجزیاتی نتیجہ تو یہ بھی نکلتا ہے کہ اُنہوں نے ماقبل کے معروف شعرا کا کلام نہ صرف پڑھا بلکہ سنا بھی۔ علاوہ ازیں، اُس وقت جن بولوں کی گونج سنائی دیتی تھی، اشرف النساء کے کان اُن سے بھی آشنا ہوتے رہے۔ اُنہوں نے حمد و نعت اور منقبت وغیرہ میں جو بول استعمال کیے، آپ اگر حمد، نعت، مناجات، نذرِ علی، شہیدانِ کربلا یا متفرقات کے عنوانات کے تحت فہرست پر نظر ڈالیں تو پتا چلے گا کہ اُن میں بہت سے بول ایسے ہیں جو پچاس ساٹھ برس گزرنے کے باوصف آج بھی مانوس اور کانوں کو بھلے لگتے ہیں۔ اب سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان کا مطالعہ واقعی اتنا وسیع تھا؟ اگر نہیں تو پھر یہ سر بسر آمد اور جوشِ حبِ رب العالمین اور نبیٔ مکرم ﷺ کا پرتو تھا جو اُن سے اتنا کچھ کہلوا گئے۔ اشرف النساء کے کلام کے مطالعے میں جوں جوں آگے بڑھتے جائیں، وہ ربِ جلیل کے معاملے میں "من تو شدم تو من شدی" کے مراحل سے گزرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور پھر ایک دور ایسا بھی ملتا ہے جس میں اُن کا کلام آیاتِ قرآنی کے منظوم ترجمے یا مفہوم کے سوا کچھ نہیں!

ایک حمد میں اشرف النساء جب کہتی ہیں "تو میرا ہے میں تیری ہوں" تو سورۂ البقرہ کی آیت

138 سامنے آجاتی ہے جس کا ترجمہ ہے "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا"۔ اسی طرح اُن کے کلام میں قرآن پاک کی سورۃ تحریم، سورۂ ھود، سورۂ الحدید، سورۂ الزخرف سورۂ المنافقون، سورۂ الرعد سورۂ التوبہ، سورۂ یوسف، سورۂ ابراہیم، سورۂ النور، سورۂ النمل، سورۂ المؤمن، سورۂ الشوریٰ، سورۂ الممتحنہ، سورۂ الفجر، سورۂ الاعراف، سورۂ النحل، سورۂ آلِ عمران، سورۂ یونس، سورۃ الانبیاء اور سورۂ محمد کی آیات کا واضح یا متشابہات کی صورت میں منظوم اظہار و مفہوم ملتا ہے۔ یہ میں اس سند کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اِس کبرسنی میں مجھے یہ توفیق دی کہ پچھلے تین چار برس سے قرآن پاک کی آیات مبارکہ کا اُردو اور انگریزی ترجمہ ہی میرا سرمایۂ حیات بنا ہوا ہے۔ اور اسی سرمائے کی بدولت مجھے احساس ہوا کہ اشرف النساء کا مدحیہ کلام قرآنی آیات کے مفاہیم دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اشرف النساء کے کلام میں ایک اور اہم کیفیت سامنے آتی ہے کہ وہ حمد باری تعالیٰ سے آغاز کرتی ہیں اور تصوف کے پائیدان پھلانگتی ہوئی وحدت الوجود، وصلِ شہود اور یہ کہتی ہوئی کہ

ع ہر اک رنگ میں رنگ تیرا ہے پنہاں

"ہمہ اوست" کے درجے پر فائز نظر آتی ہیں۔ واعظوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں۔ خود مولویوں کے گھرانے سے ناتا ہونے کے باوصف اپنے اشعار میں مولویوں اور واعظوں کو جھاڑ پلا دیتی ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ الزہراؓ، اہلِ بیت، قافلۂ کربلا اور شہدائے کربلا کے مرثیے کہتی ہیں تو کہیں تفاوتِ مسلک کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ ہر تان بہرحال ذاتِ باری تعالیٰ کی الوہیت پر جا کر ٹوٹتی ہے اور "ہمہ اوست" کا رنگ سر چڑھ کے بولتا ہے۔ مولویوں کو جھاڑ پلانے پر یاد آیا کہ تاریخِ حکمرانی یا اقتدار ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دور تھا جب مولوی یا ملّا علمائے دین کا ایک معزز عہدہ، لقب یا خطاب ہوتا تھا اور موروثیت میں چلتا تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب مسلمانوں پر اپنے کیے کی سزا میں زوال آیا تو مقتدر قوتوں نے اس، یا اس جیسے دوسرے باوقار القابات کی بھد اُڑا کے رکھ دی۔ مولوی اور ملاّ، بھک منگے اور ملوٹے بن کر رہ گئے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے جب سازشیوں کی مدد سے شیرِ میسور ٹیپو سلطان پر فتح پائی تو اس فتح

کی "خوشی" میں جشن کا اہتمام کیا گیا۔ رقص وسرود کی محفل سجائی گئی جس میں بیروں،، خانساماؤں اور خدمت گاروں کو بالالتزام، ٹیپو سلطان کے شاہی لبادے سے مماثل وردیاں پہنائی گئیں۔ مقصد ٹیپو سلطان شہید کو ایک طرح سے بعد از مرگ بے توقیر کرنا تھا۔ ایسا ہی گھٹیا برتاؤ محترم اور معزز عہدوں اور القابات کے ساتھ کیا جاتا رہا۔ اور جو آج تک جاری ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، وہ ہندوستان سے نکلنے کی ہڑک، مکہ ویثرب میں رہنے کی حسرت اور حجِ بیت اللہ کی للک کا واشگاف الفاظ میں اظہار کرتی تھیں۔ ساتھ ہی وہاں کے حکمراں خانوادے کے بارے میں تحفظات کا برملا ذکر کہ انہوں نے جنت البقیع میں قبروں کے نشان تک مٹادیئے تھے۔ حضرت فاطمہ الزہراؓ کی قبر کے ساتھ ایسا سلوک انہیں شاق گزرا۔ کہا:

جس کو عزت خود خدا نے دی وہ مٹنے کی نہیں

جو مٹانا چاہے گا خود اُس پر آئے گا وبال

جس سال حجِ بیت اللہ سے سرافراز ہوئیں، کہتی ہیں کہ 9 لاکھ حاجی تھے۔ حاجیوں کی حالت زار پر ایک نظم میں آنسو بہاتی نظر آتی ہیں۔ حکمراں خانوادے کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ ملاحیاں سنائیں۔ ایسا بیشتر کلام بقول نوشابہ "خوفِ فسادِ خلق" کے سبب تدوین کی زد میں آگیا۔

اشرف النساء کے ذخیرہ الفاظ کا پہلے بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک بات اور ذہن میں آتی ہے کہ یہ علم ایک گھریلو، خانہ دار خاتون کے لیے وہبی، مبدءِ فیاض سے ودیعت اور عطائے ربی ہی ہوسکتا ہے۔ کوئی دوسرا پہلو سجھائی نہیں دیتا۔ اس پر یہ مثل بھی صادق آتی ہے:

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

اشرف النساء کے ہاں ہندی، پوربی اور لوک الفاظ کا ذخیرہ بھی ہے اور کلام میں ایسا رنگ بھی ملتا ہے جو بظاہر میرابائی کے بھجنوں کا اثر لیے ہوئے ہے۔

اُن کے "جذبۂ دل" اور "ہر چیز مقابل آجائے" کی ارفع کیفیت میں ایسا زمانہ بھی آتا ہے جب وہ رات میں سوتے سوتے اچانک اٹھ جاتیں اور آمد کا آغاز ہوجاتا۔ ایسے میں لکھتا کون جائے؟

یہ ذمہ داری اُن کی ایک "خاتون غنچہ" پر عاید ہوئی۔ یہ خاتون غنچہ کون تھیں؟ غنچہ کون تھا؟

سودا کا مشہور و ممتاز کردار غنچہ.... وہ بے چارہ تو سودا کی ہجو گوئی کے حوالے سے بدنام ہو کے رہ گیا تھا

اشرف النساء کے دورِ تخلیقِ کلام میں بھی، اچھائی کا پہلو لیے، ایک "خاتون غنچہ" کا سراغ ملتا ہے۔ غالباً ان کے "ہمہ اوست" والے دور میں عموماً رات گئے یا جب بھی اُن پر آمد کا جلال طاری ہوتا تھا تو ورودِ شعر اور آبِ رواں میں کوئی فرق نہ رہتا تھا۔ ایسے میں اُنہیں قلمبند کون کرے؟ یہ قرعۂ فال اُن کی بہو (نوشابہ کی اماں) کے نام نکلا۔ وہ اسکول کی پڑھی ہوئی تھیں۔ املا لے لیتی تھیں۔ اشرف النساء نے اُن پر یہ پابندی لگادی کہ وہ کاغذ قلم تکیے تلے رکھ کے اُن کے ساتھ والے بستر پر سوئیں۔ اور جب بھی آمد کا آغاز ہو وہ کاغذ قلم نکال، لکھنا شروع کر دیں۔ اور عرصے تک یہی ہوتا رہا۔ اگلے روز صبح وہ کاغذ لیتیں اور اپنے کہے ہوئے اشعار کی حسبِ ضرورت اصلاح کرتیں۔ تحقیق کی حد تک یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اُنھوں نے کبھی کسی مستند شاعر یا استاد سے اصلاح نہیں لی۔ اردو کے قدیم اور متروک الفاظ کا جا بجا برمحل استعمال مثلاً "ہووے گا"، "کبھو" ان کے اشعار میں ملتے ہیں۔ لفظ "چریا" کے بارے میں جو پاگل یا سودائی کے معانی دیتا ہے، عام تاثر یہی ہے کہ زبانوں اور تہذیبوں کے ملاپ یا پچھاڑ کے نتیجے میں یہ ایک حالیہ اختراع ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ لفظ اخبار میں پہلے پہل معروف صحافی انعام عزیز نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں استعمال کیا۔ اُس وقت لال بہادر شاستری بھارت کے وزیراعظم تھے۔ انعام عزیز صاحب نے یہ کھوج نکالا کہ شاستری جی بچپن میں "ننکو" کہلاتے تھے۔ اُنھوں نے ایک کردار "ننکو" گھڑا اور پاک بھارت جنگ، شاستری اور بعد از جنگ کے حوالے سے روزانہ ایک دلچسپ خبر Box Item کے طور پر لگا دیتے۔ میں تب جنگ کے ڈسٹرکٹ پیج پر ہوتا تھا۔ یوں مجھے یاد ہے کہ انعام عزیز صاحب نے ایک روز Box میں سرخی لگائی "ننکو چریا ہو گیا"۔ یہ لفظ "چریا" سے میرا پہلا واسطہ تھا۔ لیکن اشرف النساء کے کلام میں ہمیں دو جگہ چریا کا لفظ ملتا ہے۔ اور زمانہ 1930ء سے 1940ء تک کا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ لفظ چریا

بھی استعمال کے لحاظ سے خاصا پرانا ہے۔ بعض لوگ اس لفظ کو یو پی کے قصبے "چریا کوٹ" سے بھی نسبت دیتے ہیں۔

اشرف النساء کا یہ گم گشتہ مدحیہ کلام پہلی بار منظرِ عام پر لانے کا اعزاز اُن کی پوتی نوشابہ صدیقی کو حاصل ہو رہا ہے۔ یہ کلام افتادِ وقت کے ہاتھوں شاید تلف ہو جاتا لیکن نوشابہ نے اُسے جریدۂ وقت پر ثبت بخش دیا ہے کہ آنے والی نسلوں میں سے کوئی اگر اپنے آباء کے فن وفکر کے بارے میں جاننا چاہے تو شیلف پر رکھی یہ کتاب اٹھالے۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر نوشابہ نے اپنی دادی کے منتشر اور برسوں سے گم کلام کو ڈھونڈ کر اتنا بڑا کام کر ڈالا جو کسی بھی خاندان کے کسی بھی فرد کا سب سے بڑا کارنامہ ہوسکتا ہے۔ پھر جن حالات کا سامنا نوشابہ کو رہا وہ بھی گویا "بادِ مخالف" کی ذیل میں آتے ہیں۔ جب وہ اُن کے ساتھ ہندوستان میں رہی تب بہت چھوٹی تھی۔ اور جب ہجرت کر کے پاکستان آ گئی تب اُس کی دادی اشرف النساء عالمِ بالا کو "ہجرت" کر چکی تھیں۔ یہاں بھی اُن کی عمر آڑے آئی۔ اور جب بہت سا پانی پلوں تلے سے گزر چکا تھا اور اُن سے متعلق تمام رشتے بھی دنیا چھوڑ چکے تھے، یہ کام نہ صرف یہ کہ مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ جب نوشابہ نے عزم کیا تب اُس سے چھوٹی عمر کے لوگ خاندان میں باقی رہ گئے تھے۔ اُس نے اُن بچوں سے رجوع کیا۔ اظہارِ تشکر پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ نوشابہ کی خاندان میں بہت توقیر اور وقعت ہے کہ ہر ایک نے اُس سے تعاون کیا اور وہ کچھ فراہم کیا جو خود ان کی نظروں میں بھی بے وقعت بنا، کہیں ادھر اُدھر پڑا تھا یا مارے عقیدت کے وہ تعویذ کی صورت کسی صندوق یا الماری کے خانے میں بس تبرکا رکھا ہوا تھا۔

نوشابہ اپنی ذات میں کسی کباڑن سے کم نہیں۔ پرانی تحریریں، پرانی چیزیں، پرانے دوست، پرانی محفلیں، پرانی یادیں اُس کی پسندیدہ ہوتی ہیں۔ اُس نے اپنے ابا، دادا، دادی کے علاوہ پردادا تک کے پرزے پرزے سنبھال رکھے ہیں۔ فی زمانہ یہ عادت متروک ہو چکی ہے اور قابلِ تحسین سمجھی بھی نہیں جاتی۔ مگر جو لوگ روایات کی قدر کرتے ہیں اور شجرۂ نسب سے منسلک رہنا پسند کرتے ہیں، وہ نوشابہ جیسے ہی ہوتے ہیں۔

اب بات آتی ہے مولوی محمد علی قاری کی۔ نوشابہ صدیقی کے پردادا اپنے زمانے کے نامی وکیل

ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ قدیم فارسی میں دستگار رکھتے تھے۔ سچ پوچھیں تو ہماری فارسی "گاؤ آمد وخر رفت" پر بقول شخصے "مُک" جاتی ہے۔ اور اُتنی ہی فارسی سمجھ سکتے ہیں جتنی آج سے پینتالیس پچاس برس پہلے بی اے تک کے نصاب (لازمی) میں شامل تھی اور اساتذہ کرام ہم جیسے غبی شاگردوں کے مغز میں ٹھونس سکتے تھے۔ آج اگر کچھ تھوڑی بہت حروف شناسی ہے تو اس کا اعزاز بھی ہمارے ان اساتذہ ہی کو جاتا ہے جو اپنے علم میں یکتا تھے۔ بقول مشتاق احمد یوسفی، اپنے شاگردوں میں علم کی جوت "بھنگ کی طرح ایک ہی ہلے میں نہیں بلکہ افیون کے اثر کی مانند دھیرے دھیرے جگاتے تھے"۔ اور ہمارے یہی اساتذہ رہی سہی کسر دو انگلیوں کے درمیان سرکنڈے کا قلم توڑ کر پوری کر دیتے تھے۔ ایک بار جو مغز میں بٹھا دیا پھر اُسے نکلنے کے لائق نہ چھوڑا۔

مولوی محمد علی قاری کا فارسی دیوان 1931ء میں شائع ہوا۔ اُس میں سے چنیدہ حصے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں تاکہ آغاز اور تسلسل میں رخنہ نہ آنے پائے۔

حاجی مولوی ابوالحسن کا تذکرہ بھی گاہے گاہے آتا رہا ہے۔ اُن کی کچھ علمی، سرکاری اور غیر سرکاری سرگرمیوں کی روداد شاملِ کتاب ہے۔ اُن کے حوالے سے دستاویزات کی عکسی نقول اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہندوستان میں سیاسی ابتلا کے سبب مسلمان تعلیم کے میدان میں پچھڑ چکے تھے۔ مسلمان زعماء نے اس صورتِ حال کی سنجیدگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس کا ڈول ڈالا جس میں حاجی مولوی ابوالحسن پیش پیش رہے اور "کمال یار جنگ کی تعلیمی رپورٹ" منظرِ عام پر آئی جو مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس رپورٹ کی مختصر روداد بھی ریکارڈ کے لیے کتاب میں شامل کی گئی ہے۔

اشرف النساء کے بعد دوسرا اہم تر حصہ نوشابہ صدیقی کے والد حسن عبداللہ حسن کے مزید افکار اور سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مزید یوں کہ نوشابہ صدیقی 2007ء میں "افکارِ حسن" کے نام سے، منجملہ اسناد و مراسلت کی عکسی نقول، اُن کا مجموعۂ کلام شائع کر چکی ہیں۔ اُس وقت جو چیزیں رہ گئیں یا بعد میں نوشابہ کی دسترس میں آئیں، انہیں اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

"افکارِ حسن" میں مطبوعہ تحریروں میں جو خامیاں یا غلطیاں رہ گئی تھیں، اُنہیں بھی اصلاح کے بعد زیرِ نظر کتاب میں دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔

حسن عبداللہ حسن کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا، نابغۂ وقت رشید احمد صدیقی کا تحریر کردہ خاکہ "حسن عبداللہ" سب پہ بھاری ہے۔ گویا ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں آ گیا ہے۔ لیکن نوشابہ نے وہ خاکہ غالباً کسی ایسی کتاب سے اٹھایا جس میں نہ صرف پروف کی بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں بلکہ بعض جگہوں پر پورے پورے فقرے یوں چھوڑ دیئے گئے تھے کہ مفہوم ومطلب خبط ہو گیا تھا۔ وہی خاکہ اب رشید احمد صدیقی کی کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" کے 1967ء کے اُس ایڈیشن سے لیا گیا ہے جو آئینۂ ادب، لاہور نے شائع کیا تھا۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ اس میں کوئی غلطی یا بے ربطی نہ رہ جائے۔ حسن عبداللہ تاریخ کہنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے جتنی بھی تاریخیں کہیں یا مادۂ تاریخ نکالا، سب اس کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔

ایک تاریخی نوعیت کا تعارفی خط جو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور پرووائس چانسلر اے بی اے حلیم نے حسن عبداللہ کی ایک درخواست کے ساتھ منسلک کر کے سندھ مدرسہ کالج، کراچی کے سیکریٹری بورڈ قاضی خدا بخش کے نام بھیجا تھا، نوشابہ صدیقی نے اس کی تاریخی اہمیت پر غور کیے بغیر "افکارِ حسن" میں چھاپ دیا۔ اس پر تاریخ ہے نہ کوئی وضاحتی نوٹ یا ہو تو شاید طویل وقت گزر جانے کی وجہ سے ماند بھی پڑ گیا ہو۔ یہ خط اور درخواست جو سندھ مدرسہ کالج میں اُردو لیکچرار کے لیے تھی، اپنے اندر ایک تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ سندھ مدرسہ کراچی میں لگ بھگ جون 1943ء کے دوران قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر کالج قائم کیا گیا، کیوں کہ قائداعظم نے اُن ہی دنوں اپنی اس مادرِ علمی کا دورہ کیا تھا۔ میں نے سندھ مدرسہ کے آرکائیوز میں اس عرصے کا ریکارڈ چھاننے اور جاننے کی کوشش کی کہ آیا یہ خطوط اور درخواست سندھ مدرسہ میں پہنچے بھی تھے یا نہیں۔ لیکن ایسا کوئی ریکارڈ دستیاب نہ ہو سکا۔ اس سعیٔ لاحاصل کے دوران قاضی خدا بخش کے بارے میں کچھ دلچسپ معلومات ضرور ہاتھ لگ گئیں۔ اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہ رہا کہ آخر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور "ابا" (ABA) حلیم نے کس برتے پر تعارفی اور سفارشی خطوط

قاضی خدا بخش کو لکھے تھے۔

قاضی خدا بخش سندھ کے ایک نامور سپوت تھے۔ انہوں نے 1908ء میں سندھ مدرسہ میں داخلہ لیا اور ثانوی اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ اور پھر جہاں رہے، جہاں جہاں بھی گئے، اپنی مادرِ علمی کی ترقی کا خیال رکھا۔ میٹرک کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں اپنی ذہانت اور فطانت کے بل پر بحیثیت طالب علم ناموری پائی اور اسٹوڈنٹ یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنی تمام تر سیاسی، قانونی اور عدالتی سرگرمیوں کے باوصف اپنی مادرِ علمی سندھ مدرسہ کراچی سے ناتا قائم رکھا۔ کراچی کے پہلے مسلمان میئر منتخب ہوئے اور سندھ مدرسہ بورڈ کے سیکریٹری رہے۔

یہی زمانہ تھا جب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور اے بی اے حلیم نے قاضی خدا بخش کے نام تعارفی خطوط بھیجے تھے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی کہ تقسیمِ برصغیر سے پہلے حسن عبداللہ ملازمت پر کراچی نہ آ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس سے پہلے ہی اُنہیں اپنے پاس بلا لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ وہ تقسیم سے قبل ہی 1946ء میں علی گڑھ میں پیوند خاک ہو گئے۔ اور اُن کی اولادیں مہاجر بن کر اس شہر میں آ گئیں جہاں وہ ملازمت کے سلسلے میں آنے والے تھے۔ میں نے نوشابہ سے کہا بھی کہ اگر ایسا ہو جاتا تو تم لوگ فرزند و دخترِ سرزمین ہوتے۔ "مہاجر" نہ کہلاتے!

نوشابہ نے اس کتاب کی ترتیب میں اپنی پھوپھیوں اور پھوپھاؤں کو بھی جگہ دی ہے۔ اُن کا کلام اُن کے جذبات و احساسات کا اظہار ہے۔ اور سب سے بڑھ کر نوشابہ نے اپنی اماں کا حق ادا کیا ہے۔ اس کے بعد تو اسے چاہیے کہ اپنا قلم توڑ دے۔

اس وقت میرے سامنے کم و بیش (بیتے) 120 سال رکھے ہیں۔ ایک ہی خاندان کی چار پیڑھیاں۔ اپنا اپنا رنگ لیے۔ یہ لوگ کہاں کہاں رہے۔ کہاں کہاں اُن کا خمیر اٹھا۔ اور وقت کے دھارے نے انہیں کہاں کہاں پہنچا دیا۔ اپنے اپنے وقت اور طلبی پر بہت سے ابدی مسافر ہو گئے۔ وہ ہوں یا رختِ سفر باندھنے والے، ہر کسی کی ہتھیلی پہ علم و ادب کی روشن شمع رکھی ہے۔ پانچویں پیڑھی کے بارے میں نوشابہ خود لکھتی ہیں کہ وہ اس سارے علمی اور ادبی اثاثے اور ورثے سے نابلد ہے۔ اور شاید نابلد رہے گی کہ اکثریت اپنی زبان سے، اپنی تہذیب سے ناتا ختم

کر چکی ہے۔ پھر بھی اُسے ایک اُمید موہوم آسرا دیے ہوئے ہے کہ اس پانچویں یا بعد کی کسی پیڑھی سے اس "دادی" کا کوئی پوتی پوتا اُٹھے گا۔ بک شیلف سے یہ کتاب نکالے گا اور پڑھنا شروع کر دے گا۔ شاید!

اور یہ سب کچھ کہتے لکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ میں کون ہوں؟ اور کیا ہوں؟ نوشابہ نے ایک جگہ کہا ہے کہ "سرسید نے حالی سے "مدوجزرِ اسلام" لکھوا کر جنت میں جانے کی سند حاصل کر لی۔ میں نے اپنی تمام تدریسی زندگی میں طالب علموں کو طالب علم بنانے کی جدوجہد کی، لہٰذا اللہ سے اس کا صلہ جنت سے کم نہیں مانگوں گی۔"

اور اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ہاتھ بٹانے کے بعد میں؟ اس پر مجھے اپنی ذات کے حوالے سے ایک قصہ یاد آ گیا۔

فیضی بہت بڑا عالم، شاعر اور دربارِ اکبری کے نورتنوں میں سے تھا۔ اُس نے سنا تھا کہ جب سعدی نے یہ شعر کہا،

برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار
(سبز درختوں کا ہر پتّا خدا کی معرفت کا دفتر ہے)

تو آسمان سے فرشتے اُس کے لیے خلعت لے کر اُترے۔ تب فیضی نے بھی ایک شعر کہا،

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہ لا شریک لہٗ گوید
(گھاس کا ہر تنکا جو زمین سے پھوٹتا ہے، خدا کے ایک ہونے کی تصدیق کرتا ہے)

یہ شعر کہہ کر وہ آسمان کی طرف دیکھنے اور فرشتوں کا انتظار کرنے لگا۔ فرشتہ تو کوئی نہ آیا۔ البتہ ایک پرندے کا اُدھر سے گزر ہوا اور وہ ایک پیغام دے کر چلا گیا۔ پیغام بیٹ کی صورت میں تھا جو فیضی کی داڑھی پر گری۔ فیضی نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا،

"قدر دانی عالم بالا معلوم شد"

اور میرے تو داڑھی بھی نہیں!

پس نوشت:

نوشابہ نے جو پیش لفظ لکھا اُس کے آخری صفحے کی پشت پر ایک نوٹ میرے لیے لکھا ہے۔

"کیڑے" میں اس کتاب کو مرتب کرتے کرتے اب تھک گئی ہوں۔مہینوں سے میں 120 سال پہلے کی دنیا میں رہ رہی ہوں۔میرا آج اب مجھے بلا رہا ہے۔کیونکہ اب تو آنے والے کل میں بھی کچھ ساعتیں ہی باقی ہیں۔جلدی سے اسے چھاپ دو۔اس کتاب کے لیے یہ میری آخری تحریر ہے۔اب مجھ سے کچھ اور نہ لکھوانا.... سمجھے!

اور ہاں کیا یاد کرو گے۔تمہارا جی چاہے تو اس کتاب سے متعلق جو چاہو لکھ دو اور یاد رکھو مجنوں گورکھپوری کے بعد یہ اعزاز تمہارے حصے میں آرہا ہے۔ورنہ میں روایت شکن ہوں۔اپنی تحریر یا تدوین پر کسی سے تحسین آمیز تحریر لکھواتے شرم سی آتی ہے۔پڑھنے والا خود پڑھ کر اُسے احتیاط سے بک شیلف پر رکھے گا یا ردّی میں بیچ کر چار آنے وصول کرلے گا۔مجھے معلوم ہے تمہارے پاس میرے لیے صرف جلے کٹے جملے ہی ہوں گے۔اور وہ جملے مجھے بہت عزیز ہوں گے۔

اور میں یہ "اعزاز" پا کر سوچنے لگا کہ اب کیا لکھوں؟ قدر دانی عالم بالا تو پہلے ہی آشکار ہو چکی!

☆☆☆

چوتھا حصہ

میرے تبصرے کتابوں پر

مٹھاس اور ترُشی کا مجموعہ

ہم ابوالفرح ہمایوں صاحب گوشہ نشین سے بھلا کیوں کر مل پاتے' باوجود اس کے کہ ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں اور پھر گذشتہ کئی دہائیاں گزر گئیں ہم انہیں پڑھتے بھی چلے آ رہے ہیں۔ خاص طور سے ان کی ترجمہ کی ہوئی کہانیاں جس کے سبب ہم مغربی ادب سے کسی حد تک واقف ہوئے۔ ایسے کمال کے ترجمے کہ کئی بار خواہش بیدار ہوئی کہ مغربی ادیب کاش زندہ ہو جائیں اور اپنی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی کہانیوں کو اردو زبان میں ڈھلتا دیکھ کر داد دیں پھر بے شک مر جائیں۔

ایسا دو دہائی پہلے ممکن ہوا کہ ہم ایک تقریب میں آمنے سامنے تھے' یہ تقریب ان کے والد محترم جناب ابوظفر زین صاحب سے منسوب اس ادارے کی جانب سے ایک تقریب تھی کہ جس میں ایک تحریری مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ نہ جانے کیسے اسی مقابلے کی ایک جج میں منتخب ہو گئی تھی جبکہ ہمارے دو ساتھی جناب ذاکر علی خان علیگ اور جناب ایس ایم معین قریشی تھے - ابوالفرح صاحب کے بھائی جو ریاض سعودی عرب میں مقیم ہیں اور کمال کی مزاحیہ شاعری کرتے ہیں کسی حوالے سے مجھے منصف بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ہم شوق کے ساتھ ابوالفرح صاحب سے ملے۔ اب بھی ملتے ہیں مگر کم کم' کیونکہ وہ اپنے گھر سے کم کم نکلتے ہیں' وہ کم کم بولتے ہیں۔ کم کم ہنستے ہیں اور زیادہ زیادہ لکھتے ہیں اور بہت بہت اچھا لکھتے ہیں۔ پہلے ان کے وہ تمام افسانے پڑھے جو ترجمہ شدہ تھے۔ بعض افسانے پڑھ کر ہمایوں صاحب کو غائبانہ بے شمار دعائیں دیں کہ میں کہاں جاتی انہیں دنیا بھر میں ڈھونڈنے۔

کمال کے افسانے اور کمال کے ''ترجمے'' رعب میں آنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا مگر پھر ایک مسودہ میری میز پر رکھا ملا جو شاعر علی شاعر میری غیر موجودگی میں رکھ گئے تھے بغیر کسی نوٹ کے۔ میں سمجھی شاید وہ مجھے پروف ریڈر سمجھے ہیں مگر ابوالفرح صاحب کے فون سے پتہ چلا کہ کچھ لکھنے کے لیے ہے۔ حیران بھی ہوئی۔ بچنے کی کوشش بھی کی' منت سے بھی کام لیا۔ دیگر کئی ''اچھا'' لکھنے

والوں کا حوالہ بھی دیا مگر ابوالفرح صاحب ڈٹے رہے۔

دونوں بھائی امتحان لیتے رہتے ہیں' جانتے ہوئے کہ میری ساری عمر طالب علموں کو امتحان میں مبتلا کرنے میں گذری ہے۔ لیجے امتحانی حل شدہ پرچہ حاضر ہے۔

یادوں کی برسات "یادوں کی بارات" یا "یادوں کے دسترخوان" کی طرح چونکا دینے والی تحریر ہے۔ ایک ایک کہانی پڑھی۔ یقین جانئے ایک ایک حرف پڑھا۔ رمضان کا مہینہ تھا' باورچی خانہ صرف ایک وقت بلاتا ہے۔ ہم خواتین کو اس مہینے تھوڑا سا وقت بونس کی صورت مل جاتا ہے

ابوالفرح صاحب پیدائشی خوش مزاج ہیں۔ ہمیشہ مسکرا کر بات کرتے ہیں۔ دوسروں کی طرح خوشی کی تلاش میں کہیں اور نہیں جاتے بلکہ خوشی اور ہنسنے ہنسانے کا سامان خود پیدا کر لیتے ہیں۔ کہتے بھی ہیں "خدا کے پاس ہنستے ہوئے جاؤ' اگر مرنا ہی ہے تو ہنسی خوشی مرو۔ رو دھو کر مرے تو کیا مرے"۔

لگتا ہے ابوالفرح صاحب صرف مزاح کے آدمی ہی نہیں مزاح کا غرور بھی ہیں' ان کی کاٹ دار تحریریں طفلِ نوزائیدہ کے چہرے کی مسکراہٹ کی طرح ہیں۔ اسلوب کی یوں تو بہت ساری تعریفیں کی گئی ہیں مگر ایک عملی اور قابل قبول تعریف یہی ہے کہ مناسب لفظ مناسب جگہ پر۔

کیا یہ صحیح نہیں کہ الفاظ کے معنی لغت سے ہی معلوم نہیں ہوتے بلکہ اچھے ادیبوں کی نگارشات ان کی سند ہوتے ہیں۔ "یادوں کی برسات" میں جگہ جگہ ایسے ٹکرے ملیں گے جہاں الفاظ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر آپ کو اپنی طرف متوجہ کریں گے۔ مثلاً "پائے کی بات" میں کہتے ہیں' اس میں "اعلیٰ پائے" کی شخصیات شامل ہوتی ہیں۔ اسی طرح "شوخ سوالات اور شنگ جوابات" میں یادداشتیں کو یادداشتائیں بنا کر ذو معنی بنا دیا ہے۔

ابوالفرح ہمایوں جادوگر کے ڈبے کے مصداق ہیں' ایک ڈبہ کھولو تو دوسرا ڈبہ نکل پڑتا ہے۔ دوسرا کھولو تو تیسرے ڈبے میں ایک اور ڈبہ۔

ان کی کہانیاں نئی سوسائٹی کی بائیوگرافی کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے نہایت فنکارانہ مہارت سے ہر رخ اور ہر پہلو سے آشکار کیا ہے اور نئے سماج کی حقیقی اور چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں۔

وہ اپنی بات نہایت دھیمے، ملائم اور نرم لہجے میں کہتے ہیں اور قاری اسے دل و جان سے قبول کر لیتا ہے۔

''وقت کی وقعت'' میں وہ خوب صورتی سے تقریب بروقت شروع نہ ہونے پر آخیر وقت تک سامعین و حاضرین کو بہلاتے رہے اور اعلان کروکہ آیندہ تقریب وقتِ مقررہ سے دو گھنٹے بعد ہوگی۔

''جلیل اور ذلیل'' کے تقابل میں لکھتے ہیں۔ہم نے بے بسی کے عالم میں اپنے اوپر سولہ دسمبر طاری کرلیا ہے۔یہ ایک جملہ پاکستان کے دولخت ہونے کی پوری دکھ بھری تاریخ ہے۔

''یادوں کی برسات'' نثری مزاح میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔وہ لفظوں کی بازی گری سے گریز کرتے ہیں۔ان کی تحریر ابہام سے پاک ہوتی ہے۔طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی اسی طرح ایک دوسرے میں پیوست ہیں جیسے زردے پر لیموں کے عرق کی بوند- ذرا ذائقہ سوچیں۔ مٹھاس اور ترشی یکجا ہوکر کیا قیامت ڈھاتی ہیں۔کہانیاں پڑھیئے انہیں لکھتے وقت سوچنا نہیں پڑتا بلکہ سوچ کے دھارے کو روکنا پڑتا ہے کہ کہیں حالتِ جذب میں وہ نہ لکھ بیٹھیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔

مجھے کتابوں کے انتساب ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔انتساب اچھے نہ ہوں تو یقین کیجیے کتاب پڑھنے کے لیے کسی آنے والے دن کا انتظار کرنے کے لیے چھوڑ دیتی ہوں مگر ''یادوں کی برسات'' ایک تو ابوالفرح صاحب کی کتاب ہے' دوسرے نثری مزاح پڑھنے کو کم کم ملتا ہے کسی اور دن کا انتظار ممکن نہیں تھا مگر انتساب نے فوراً پڑھنے پر مجبور کر دیا۔''وہ جو جا کر واپس نہیں آئی۔''

زندگی بھر کی وہ جدائی جس سے وہ دو چار ہو چکے ہیں۔مسکراہٹوں والی کتاب نے پہلے مجھے آنسوؤں کی برسات سے دو چار کر دیا۔

ابوالفرح ہمایوں صاحب آپ کو مبارک ہو' ایک نئی کتاب،ایک نئی اولاد' ایک نئی قوت' ایک نیا اعتماد۔

" Be Singular in plural world" میرا آپ سے بس یہی کہنا ہے۔

☆☆☆

یادوں کی برسات،ابوالفرح ہمایوں

Miss me but let me go

ذاکر علی خان علیگ اب ہم میں نہیں رہے۔ جو پیدا ہوا ہے وہ موت کا مسافر ہے' دنیا میں آیا ہے تو جائے گا بھی۔ یہی ہمارا ایمان ہے اور یہی ہمارا عقیدہ۔ موت حیات سے بھی بڑی حقیقت ہے' آ کر رہتی ہے۔ بس یوں ہی ذاکر صاحب بھی موت کی انگلی پکڑ کر کہیں چلے گئے نہ نظر آتے ہیں نہ واپس آتے ہیں مگر یاد بہت یاد آتے ہیں۔

کسی گذرے ہوئے شخص کو ہم کس طرح یاد کرتے ہیں۔ اسی کی خوبیوں سے' اس کی خرابیوں سے' اس کی محرومیوں سے' اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں سے' اس کی تحریروں سے' تصویروں سے اور اس کے خطوط سے بھی کہ وہ اپنے خطوط میں بالکل ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہوتا ہے کہ وہ جیسے خط تحریر کرتا ہے بس وہ صرف اسے ہی مخاطب کرتا ہے اور بس خود ہی مخاطب ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کسی کا خط پڑھنا ناپسندیدہ فعل ہے۔ لیکن ادب کی دنیا میں خط نہ پڑھنا ناپسندیدہ فعل ہے۔ رجب علی بیگ وہ پہلے شخص ہیں جو خط لکھتے ہوئے پکڑے گئے یا یوں کہہ لیجیے کہ اردو زبان میں خطوط نویسی کی ابتدا کی حالانکہ اس زمانے میں فارسی زبان رائج تھی۔ غالب نے بھی اردو میں خطوط لکھے اور مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ شبلی نے اگر عطیہ بیگم فیضی کو خط نہ لکھے ہوتے اور ان کے خط محفوظ نہ ہوتے تو سیرت النبی اور الفاروق جیسی کتب کے مصنف کے دلی جذبات سے کون آگاہ ہوتا؟

مولانا ابوالکلام آزاد کو ''غبارِ خاطر'' کے ذریعے دنیا نے جانا۔ تجرباتِ زندگی اور ذاتی زندگی کے بارے میں ہم نے جو کچھ انہیں پہچانا وہ ان کے خطوط کے ذریعے ہی تو جان پائے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے خط لکھے اور مجسم سامنے آ گئے۔ صفیہ اختر نے جاں نثار اختر کو خط لکھے' گھریلو زندگی کی کہانی منظرِ عام پر آ گئی۔ خطوط تو ہم جیسے عام لوگوں نے بھی لکھے لیکن بڑے لوگوں کے خطوط شائع ہوئے

اور ہم تک پہنچے۔ ہمارے خطوط پڑھے گئے اور ضائع کر دیے گئے، ہمیں اس کا دکھ نہیں لیکن ہمیں تو آج کی نسل پر ترس آتا ہے جو لفظ خط ڈاکیہ اور لیٹر بکس سے متعارف ہی نہیں وہ اس لطیف احساس سے آشنا ہی نہیں کہ خط لکھنے میں کتنی فرصت اور تنہائی درکار ہوتی تھی۔ اور ایک خط پڑھنے میں کتنی تکرار ہوتی۔ بعض خطوط کی نوعیت تو ایسی ہوتی کہ جس کے لیے چھپ چھپا کر پڑھنا پڑتا۔ ایسے خطوط تکیے کے نیچے احتیاط سے رکھ دیے جاتے اور جواب تحریر کرنے سے پہلے کئی بار پڑھے جاتے۔ اگرچہ نہ وہ ادب کا بڑا شاہکار ہوتے نہ اس میں زندگی کی کوئی اہم کہانی پوشیدہ ہوتی نہ تاریخی اعتبار سے ان کی اہمیت ہوتی۔

کچھ بڑے لوگوں کے خطوط طالب علموں کے لیے نصاب میں بھی شامل کر دیے گئے۔ غالب کے خطوط اگر ہم نے غور سے نہ پڑھے ہوتے اور حافظے میں محفوظ نہ کیے ہوئے تب امتحانی پرچے میں نمبر ملنا محال ہو جاتا۔

ذاکر صاحب نے بھی زندگی بھر بے شمار خط لکھے۔ یہ سوچ کر ہرگز نہیں لکھے کہ وہ کبھی شائع بھی ہوں گے اور کوئی تیسرا بھی انہیں پڑھے گا۔ ایسے لکھے گئے خطوط میں جو بے اختیاری ہوتی ہے وہ دل کو بھاتی ہے۔ ایک دل سے نکلتی ہے دوسرے کے دل میں سما جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کی جو تحریریں کتابی صورت میں شائع ہوئیں ہم نے وہ سب پڑھ ڈالیں۔ رشید احمد صدیقی کے شاگردِ خاص نے وہی صنف اپنائی، ان کی تحریریں مزاح سے بھرپور ہیں۔ اندازِ تحریر شگفتگی اور بے ساختگی لیے ہوئے ہے۔ ایک پڑھا لکھا شخص ہی اس سے محظوظ ہو سکتا ہے، اسے ان کی تحریر کی خوبی سمجھ لیں یا خامی میں شمار کر لیں۔ خطوط نویسی کا فن بس دوستوں کے نام لکھے گئے خطوط میں اجاگر ہوتا ہے۔

والدین کے نام لکھے گئے خطوط میں تابعداری کی جھلک ہوتی ہے اور افسروں کے نام لکھے گئے خط میں مجبوری بول رہی ہوتی ہے۔ دوستوں کے نامے ہنساتے ہیں، رلاتے ہیں، بہلاتے ہیں اور چونکا بھی دیتے ہیں۔

خط تو وہی اچھا جو شروع ہوتے ہی اپنی گرفت میں لے۔ ذاکر صاحب کو ہنسانا بھی آتا ہے، بہلانا بھی، رلانا بھی، چونکانا بھی اور اپنی گرفت میں لے لینا بھی۔

مجھے جب ان کے خطوط پڑھنے کو ملے تب خط کا پڑھنا معیوب بات نہیں تھی کہ انہیں پڑھ کر ان کی طرزِ تحریر کو سمجھنا تھا' جانا تھا کہ تھوڑا تھوڑا پڑھ کر لکھنے کا مواد پا جائیں گے مگر پورا خط پڑھے بغیر نہ رہ سکی۔ شروع سے آخیر تک مکتوب الیہ کو جکڑ لینے والی کیفیت موجود پائی۔ اور شاید یہی ایک اچھے خط ہی نہیں ہر اچھی قوم کی خصوصیت ہوتی ہے۔ القاب خط کی جان تصور کیا جاتا ہے اور اگر میں کہوں کہ ذاکر صاحب القاب لکھنے کے ایسے ماہر ہیں کہ بڑے سے بڑا خطوط نویس انہیں استاد مان لینے میں دیر نہیں لگائے گا۔

☆ ''مثلاً چوتھی جماعت کے ساتھی اور اول درجے کے دوست پکے رام پوری، کھرے پٹھان یعنی ان کا ذکی اللہ خان کو سلام۔''
اجنبی پڑھنے والا اس شخص سے مکمل واقف ہو جاتا ہے۔

☆ اسلم جے راج پوری کے وارث اور 'حُبِّ علی گڑھ' میں رشید احمد صدیقی کے مرید و پیرو کار بھائی شمیم جے راج پوری۔

☆ اردو ادب کے جید معلم و مبلغ، خلوص و وفا کے پیکر برادرِ عزیز پروفیسر جمیل اختر خان

☆ ہمسایہ من پرتوے روہیلہ سلامت باشد

☆ قدر شناسِ برادران مخلص بے کراں بھائی اظہر زاد عنایت کم

☆ رام پور کے لارڈ فراست علی کینیڈا میں آباد کو سلام

یہ سارے تخاطب ابتدا ہی میں ہمیں اس شخص کے بارے میں بہت کچھ آگاہی دے دیتے ہیں کہ جس کے نام یہ خط تحریر کیے گئے ہیں۔

درمیان کی تحریر' موجودہ حالات' حالات زندگی' دوری' مجبوری یادیں' باتیں' محرومیاں' گزرے دنوں کی رعنائیاں' بچھڑنے کے صدمے اور جیتے رہنے کے جبر پر محیط ہوتی ہے۔ بس یہاں ہی اندازِ تحریر کا پتہ چلتا ہے۔

خط کا جواب ملنا' خط لکھنے والا پہلے ہی سے انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب جواب یوں مانگتے ہیں۔ جوں ہی موقع ملے خود نوشت صحت بلیٹن، ارسال کر دیجئے گا۔ یا یوں بھی" قلمی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بطور سمجھوتہ ایکسپریس رواں رہنا چاہیے۔

خط کے اختتام پر ایک لائن ایسی ضرور ہوتی ہے جو کسی تیسرے کے بارے میں ہوتی ہے۔

ذاکر صاحب لکھتے ہیں، آخیر میں خاندانی موسم کا احوال سنئے۔

وہ دوست جو خط کا جواب نہیں دیتا اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''عابد رضا بیدار کو خط لکھنے کا دل چاہتا ہے لیکن وہ مراسلت کے معاملے میں ''کرُک'' ہو گئے ہیں' اس لیے چھیڑنے کو جی نہیں چاہتا"۔

ذاکر صاحب کو سرسید اور سرسید کی بنائی ہوئی درسگاہ سے جو انسیت رہی ہے وہ اکثر خطوط میں عیاں ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں "مجھے اردو سے بے پناہ محبت ہے لیکن اس قدر یا اس سے بھی کچھ ماسوا مادرِ علی گڑھ سے ہے۔''

ایک خط میں یوں لکھا۔ "موجودہ تکلیف سے نجات پاتے ہی طوافِ علی گڑھ آؤں گا" ایک اور خط میں تحریر ہے۔ انشاء اللہ تعلقاتِ علیگانہ کا سلسلہ پروان چڑھے گا۔ ایک خط میں یوں لکھتے ہیں: علی گڑھ سے آنے والی ہر چیز ہمارے لیے تبرک کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ کوئی خط ہو یا کتاب یا محض سلام علیک۔ ہمارے لیے علی گڑھ سے سنائی دینے والی ہر آواز حسن سماعت افزا اور تحریر بصیرت و بصارت افروز ہے۔

ذاکر صاحب نے حج بھی کیا اور عمرے بھی' میاں کی اٹریا بھی لکھی اور حدیثِ حرم بھی اور مرحبا الحاج بھی مگر مکہ اور مدینے کی کیفیت جو خط میں اجاگر کی وہ کچھ یوں ہے۔

''واقعی اللہ میاں بھی خوب ہیں۔ اپنا نام بھی کس قدر چھانٹ کر پسند کیا ہے کہ ایک دفعہ کہہ کر جی نہیں بھرتا بار بار کہنے کو' پکارنے کو جی چاہتا ہے۔ ہنس ہنس کر' رو رو کر' سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے چین اللہ ہی کہنے میں آتا ہے۔''

خط کا اختتام اپنے نام پر ہی ہوتا ہے۔ وسلام یا خیر اندیش بہت عام ہے۔ اکثر خطوط تو بس صرف نام لکھ دینے ہی پر اختتام پذیر ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب یہاں بھی منفرد ہیں۔ ''مصروف دعا ذاکر علی خان'' یا پھر "وسلام، خیر اندیش و خیر خواہ نونہال ماضی حال و مستقبل ذاکر علی خان''۔

ذاکر صاحب نے قابل رشک زندگی گزاری۔ تعلیم سرسید کی درسگاہ سے حاصل کی اُسے لٹایا سر سید یونیورسٹی کراچی میں۔ شب و روز بسر کیے علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی فرحت بخش ہواؤں میں۔ خدمت کی رسالہ تہذیب کی۔ اچھے دوست بنائے بھی اور دوستی نبھائی بھی۔ اللہ سے لو لگائی۔ اور کیفیت تحریر کی۔ صلہ اللہ سے مانگا۔ زندگی بھر پڑھتے رہے اور لکھتے رہے۔ گویا انہیں تو گناہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اتنے خوش قسمت کہ آنکھیں بند ہو جانے اور قلم چھن جانے کے باوجود ان کی کتاب چھپ رہی ہے۔ ایسی زندگی کے تو ہم سب خواستگار ہیں۔ لیجئے یہ خط میں نے ذاکر صاحب کے نام لکھ دیا ہے۔ دیکھیں جواب میں کیا آتا ہے۔ عزرائیل علیہ السلام کی مہربانیاں۔ قبر میں جنت کے باغ کی تصویر کشی، سوال و جواب کے مکالمے اور جنت الفردوس میں پہلا قدم رکھتے ہوئے سُرور کی کیفیت۔ اور پھر یہ کہ والسلام خوش باش ذاکر علی خان۔

☆☆☆

کتاب۔ خطوط ذاکر علی خان

غالب وصغیرافراہیم سُوئے باندہ

صغیرافراہیم کی کتاب ''غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد علی'' کا مسودہ مجھے پی ڈی ایف (PDF) کے ذریعے ملا، اس اصرار کے ساتھ کہ مجھے اس پر تحریری تبصرہ کرنا ہے۔ بہرطور کوئی جائے مفرنہ پا کر اقرار کرتے ہی بنی۔

میرے نزدیک تاریخ کا مطالعہ کرنا ماضی کے پردوں میں لپٹے ہوئے حقائق کے کرم خوردہ بازوؤں کو احتیاط سے کھولنے اور پڑھنے کا نام ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی حقائق کا چہرہ اور ذائقہ مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان ازل ہی سے کھوج کا خواہاں رہا ہے اور یہ تحقیقی صلاحیت ہی اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیتی ہے۔ تحقیق کیا ہے؟ تحقیق کے لفظی معنی ہیں: مرغی کا اپنے پنجوں سے مٹی کرید کر کام کا دانہ نکالنا۔ تاہم تحقیقی عمل میں اس سے مراد وہ آئینہ لیا جاتا ہے جو کسی واقعے یا چیز کو ہر زاویے سے ایک نئی شکل میں دکھاتا ہے۔

اس کتاب کا انتساب اپنی شریکِ حیات کے نام کر کے نہایت ہنرمندی سے غالب کے قیام باندہ کو بالواسطہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جہاں تک اس کتاب کے مواد کا تعلق ہے تو اس میں غالب کے علمی اور ادبی قد کی پیمائش کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ کتاب کے سرورق کو سامنے رکھ کر غالب کے سفر اور قیامِ باندہ کے مختلف گوشوں کو منور کیا گیا ہے جو اس کا مرکزی نکتہ ہے۔ مواد کو انتہائی سادگی اور صفائی سے پیش کیا گیا ہے جس سے مصنف کی ادبی دیانت، عرق ریزی اور ذاتی تعصّبات سے بالاتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جابجا استدلالی انداز بھی ملتا ہے جو ان کے علمی اجتہاد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میرے خیال میں ایسی معلومات کا سب سے زیادہ فائدہ پچاس سال بعد آنے والے ناقدین کو پہنچتا ہے جو اپنی معروضی رائے قائم کرنے کے لیے اس کو خام مواد کے طور پر استعمال کریں گے۔

اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ ایک تحقیقی کتاب ہے، اور بقول شافع قدوائی ''تحقیق کے

واجبات بہت شدید ہوتے ہیں''، جن سے صغیر افراہیم بخوبی نبردآزما ہوئے ہیں۔ 1990ء میں صغیر افراہیم کی شادی باندہ میں سیما سے ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی ذاتی رشتے کی ڈور پکڑے وہ غالب اور باندہ تک جا پہنچے۔ اس کتاب کے قارئین شاید یہ کہیں کہ اس میں غالب کے بارے میں کوئی چونکا دینے والی بات، کچھ دھما کہ خیز معلومات اور رنگ آمیزی کے نمونے نہیں ملتے۔ میں کہوں گی یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ فاضل مصنف نے غالب کے اس سفرِ باندہ کو داستانی دھند اور طلسماتی کہر میں لپیٹنے کے بجائے سفید روشنی میں دیکھنے اور دکھانے کا اہتمام کیا ہے۔ کسی جگہ بھی بناوٹ، ملاوٹ اور افسانہ طرازی کا عنصر نہیں ملتا۔ ہر جگہ حقائق صاف ستھرے اور نکھرے انداز میں سامنے لانے کی کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ وہ علمی و تاریخی حقائق کے سلسلے میں انتہائی محتاط رویہ رکھتے ہیں جس میں انہوں نے استادانہ کمال پیدا کیا ہے جو اب ان کی شناخت بن گیا ہے۔

زیرِ نظر مسودہ کے وہ چیدہ چیدہ پہلو جو ایک سرسری اور غیر منضبط مطالعے کے دوران میرے سامنے آئے ہیں، اور جن پر مجھے رائے قائم کرنے کا موقع ملا ہے وہ مختصراً یہ ہیں:

(1) انہوں نے اولاً دیوان محمد علی کا صحیح نام لکھا ہے۔ زیادہ تر محققوں نے دیوان محمد علی کو دیوان محمد علی خاں لکھا ہے۔

(2) تحقیق غالب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

(3) صفحہ 53 اور صفحہ 56 میں درج تواریخ میں قدرے تضاد ہے۔ مثلاً

روانگی غالب از لکھنؤ صفحہ 53 پر درج ہے 21 جون 1827ء (26 ذی قعدہ 1242ھ بروز جمعہ)'

روانگی غالب از لکھنؤ صفحہ 56 پر درج ہے 27 جون 1827ء (26 ذی قعدہ 1242ھ بروز جمعہ)

میں مانتی ہوں یہ اقتباس نقل مطابق اصل ہے اور نقل کفر کفر نباشد۔

اس میں صغیر افراہیم کا کوئی دوش نہیں، لیکن پھر بھی ذہن کے کسی گوشے میں یہ حقیقت بوجھل محسوس ہوتی ہے۔ نشان دہی کی یہ جسارت محض تاریخی درستی کے لیے ہے، نہ کہ بغرضِ اعتراض۔

(4) اس کتاب میں حواشی نے تو چار چاند لگا دیے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے نہ صرف مآخذ کی نشان دہی بلکہ بہت سے توضیح طلب نکات کی بھی وضاحت ہوگئی ہے۔ ایسے بہت سے امور حواشی میں شامل ہیں جو متن کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔ بنا بریں علمی اور تحقیقی مواد بطریق احسن قارئین تک پیش ہوسکتا ہے۔

(5) یوں تو انسان ہمیشہ سے تلاشِ معاش کی خاطر یا محض بر بنائے تجسس سفر کرتا ہے، لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ صغیر افراہیم نہ تو تلاشِ معاش میں اور نہ ہی محض تجسس، بلکہ ایک خاص نصب العین کے پیشِ نظر علی گڑھ سے باندہ کے لیے نکلے ہیں تلاشِ غالب میں۔

(6) انسانی زندگی میں مکتوبات کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے آدھی ملاقات کہا جاتا رہا ہے۔ بقول شخصے ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور صاحبِ علم اپنے مکتوبات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔'' ''نامۂ ہائے فارسی غالب'' (Persian Letters of Ghalib) سید اکبر علی ترمذی کی زبردست دریافت ہے۔ یہ خطوط اہم ریکارڈ فراہم کرتے ہیں۔ شاعر کے سفرِ کلکتہ کے بارے میں یہ تفصیلات اب تک سامنے نہیں آئی تھیں۔

(7) بدقسمتی سے مکتوب الیہ دیوان محمد علی کے متعلق کسی نے تفصیلی معلومات درج نہیں کیں، حالانکہ ان کے نام غالب کے 37 خطوط ہیں جن سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(8) اس کتاب کے گیارہ ابواب ہیں۔ مصنف نے حقائق کی ترتیب اور ابواب کی پیش کش میں کچھ ایسا التزام کیا ہے کہ تمام ابواب ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود آپس میں مربوط ہیں، اور یہ حسنِ ترتیب ان کے فکری ارتقاء اور قلم کی چابکدستی کا مظہر ہے۔ اس کتاب کی تحقیقی اہمیت تو اپنی جگہ مسلّم ہے ہی، لیکن میں سمجھتی ہوں اس کتاب کے چند ابواب وسعت اور امکانات کے سبب نہایت قابلِ توجہ ہیں۔

(9) ہم سب کے اندر ایک دادی اماں چھپی بیٹھی ہے، اور وہی ذات اس سے نت نئی کہانیاں کہلواتی رہی ہے اور کہلواتی رہے گی۔ صغیر افراہیم لکھتے ہیں کہ ''گھر میں قصہ کہانی سننے کا ماحول تھا، وہ اناؤسے باندہ کے سفر کو بڑے دلچسپ واقعات کے ساتھ بیان کرتیں۔'' چنانچہ باندہ سے دلچسپی بچپن ہی سے ان کے شعور میں رچ بس گئی تھی۔

(10) غالب کی مشہور غزل

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

قیام باندہ یا سفر باندہ کی دین ہے۔

(11) اردو اور فارسی کے اشعار نہ صرف حُسنِ بیان میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ بات کی تفہیم میں بھی آسانی کا سبب بنتے ہیں۔

(12) غالب جب باندہ تشریف لائے تو ان کی عمر تقریباً اُنتیس برس، جب کہ دیوان محمد علی عمر کے قریباً 53 سال گزار چکے تھے۔ لہٰذا ان سے واسطہ ایک بزرگ کا تھا اور غالب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

(13) خیال تھا کہ یہ تحقیق بوجھل اصطلاحات کی زد میں آکر قاری کو مصیبت میں ڈال دے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا، اور ہمیں ایک ایسی کتاب پڑھنے کو ملی جو دلچسپ اور رواں زبان میں لکھی گئی ہے جس کی تحقیق پر تخلیق کا گماں ہوتا ہے۔ یہ کتاب محض آیند وروند تک محدود نہیں بلکہ تاریخی واقعات پر ایک نقطۂ نظر کا اظہار بھی ہے۔

مجھے امید ہے آپ جب یہاں سے جائیں گے تو غالب کے ہمراہ باندہ کو بھی لے جائیں گے جو سیاحت کا مرکز ہے، اور اس کے کن دریا (KEN RIVER) سے شجر کے پتھر نکلتے ہیں جو زیورات میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں تعلیم 82 فیصد ہے۔

غالب۔ باندہ اور دیوان محمد علی
ڈاکٹر صغیر افراہیم۔ علی گڑھ

☆☆☆

سفرنامہ کراچی

سفری داستان کو لکھنا سفرنامہ کہلاتا ہے۔ دنیا کا پہلا دریافت شدہ باقاعدہ سفرنامہ یونانی سیاح میگس تھینز کا تحریر کردہ Indica (سفرنامہ ہند) ہے جسے 300 قبل مسیح لکھا گیا۔ ہاں اردو زبان میں لکھے گئے سفرنامے کی بات کریں تو یوسف خان کمبل پوش کا (تاریخِ یوسفی) معروف ''عجائباتِ فرنگ'' ہے۔

سفرناموں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود قرآن میں ''سیروا فی الارض'' کا حکم دے کر سفر کی ترغیب دی گئی ہے۔

حضرت موسیٰ اور خضر کا سفرنامہ بھی موجود ہے۔ اور پھر ایک شاہکار سفر زمین سے آسمان تک کا سفر واقعہ معراج ہے جیسے نہایت خوب صورت اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر یہ سفر تحریر نہ کیا جاتا تب بعد کی دنیا کو اس سفر کی دلچسپی، مقصد اور جزئیات کا علم ہرگز نہ ہو پاتا۔ علم حاصل کرنے کے لیے چین تک جانے کا حکم دے کر گویا سفر کی اہمیت کو علم سے جوڑ دیا گیا ہے۔

اردو ادب میں سفرنامے سب سے زیادہ بیسویں صدی میں تحریر کیے گئے چونکہ ہمیں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے اس لیے صرف ان کی اہمیت، ضرورت اور مقصد پر نظر رکھنے رکھنا ہے۔

ہمارے سامنے جناب ماہر ندیم صاحب کا سفرنامہ ''کراچی نامہ'' کے نام سے موجود ہے۔ پڑھنے کے لیے کتاب کا ہونا دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ مگر جدید دنیا نے چھوٹے سی اسکرین یعنی موبائل کی pdf کو کتاب بنا دیا ہے۔ ورق پلٹنے کے بجائے انگلی کی حرکت مزا نہیں دیتی مگر ماہر ندیم صاحب کے کراچی نامے کے لیے بار بار انگلی کو حرکت دینا تکلیف دہ یوں نہیں بنا کہ ساری کی ساری تحریر ہمارے پیارے شہر کراچی سے متعلق تھی۔ ہم کراچی میں بڑے ہوئے اور مرنے کے لیے تیار ہیں۔ ابدی آرام گاہ بھی یہیں ہوگی سُو شوق سے کراچی نامہ'' پڑھتے گئے۔

سفرنامے کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ سفر نامہ نگار ایک سیاح کا مزاج لے کر سفر پر نکلے' مشاہدہ تیز ہو' تخیل قوی ہو' صاحب بصارت ہو۔ صاحبِ بصیرت ہو' غیر متعصب ہو' محقق بھی ہو' کلیات سے نتائج نکالے نہ کہ جزئیات سے۔ وہ کیفیت جو سفر کے دوران اس پر طاری ہوئی ہوا سے بیان کرے۔ صرف لفظوں سے نہیں کبھی خوشیوں سے' کبھی دکھوں سے' کبھی مایوسی سے' کبھی رولے' کبھی ہنس دے اور اپنے ساتھ اپنے قاری کو لے کر چلتا پھرتا رہے۔

ماہ اگست کے 22 دنوں پر محیط اس سفرنامے میں یہ تمام ضروری لوازمات موجود ہیں۔ شہر کراچی کو دیدہ وروں کا شہر کہا۔ وہ صاحبِ بصارت اور بصیرت ثابت ہوئے۔

اپنے ان عزیزوں سے ملنے وہ شہر کراچی آئے جو ہجرت میں ان سے بچھڑ گئے تھے۔ ملے اور ان سے گلے مل کر انہیں ایسا ہی لگا کہ سرحدوں کی باڑھ نے محبتوں کو مرنے نہیں دیا ہے۔

انہوں نے ان اداروں کا بھی رخ کیا جو خود ان کے وطن میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً انجمن ترقی اردو۔ سرسید یونی ورسٹی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن' یہ ادارے ہمارے مشترکہ ادارے ہیں جب ان کی بنیاد پڑی تب یہ خطہ نہ ہندوستان تھا نہ پاکستان' یہ برصغیر تھا۔ اس کے بانی ہمارے بھی تھے۔ ہم آئے تو خالی ہاتھ لیکن اپنے بانیوں اور قائد کی یاد اور کام ساتھ لائے تھے۔

ماہر ندیم صاحب نے ان اداروں میں جب قدم رکھا تب انہیں یہ ادارے اجنبی نہیں لگے۔ جس انداز سے انہوں نے رپورٹنگ کی وہ بہترین ہے' اس میں بڑی اپنائیت بھی ہے اور والہانہ پن بھی ہے۔

سفر میں ان کے ساتھ ساتھ تاریخ جغرافیہ اور ثقافت ہر قدم پر موجود تھی۔ کبھی انہیں لال قلعہ یاد آیا کبھی علی گڑھ' کبھی وہاں کی ہوا اور فضا' اور کبھی اسی شہر کراچی کی۔

مجھے نہیں معلوم ہندوستان کے لوگ گوشت کتنا کھاتے ہیں مگر ماہر صاحب کی تحریر سے اندازہ ہوا کہ بہر حال کراچی والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ جتنا گوشت دنیا میں کھایا جاتا ہے اس کا 60 فی صد اہل کراچی کی غذا ہے۔ یہ تاثرات اور محسوسات کا بیانیہ ہے۔ تجربہ بھی بول رہا ہے۔ یقیناً ہر گھر میں انہوں نے گوشت کی ڈش ضرور پائی ہوگی۔

میرے سفرنامے چشم نم میں' میں نے اگرچہ یہ نہیں لکھا کہ میرے میزبانوں کو میری آمد سے قبل

یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ ان دنوں ہندوستان میں گوشت پر کچھ پابندی تھی تو وہ میری میزبانی کیسے کر پائیں گے۔ انہوں نے سکھ کا سانس اس خبر کے بعد لیا کہ میں سبزی خور ہوں اور زندگی بھر کبھی گوشت کیا اس کا شوربہ بھی نہیں چکھا۔ میرے سبزی خور ہونے پر انہیں حیرت بھی ہونی چاہیے اور ایک دو فیصد کی کمی بھی کردینی چاہیے۔ ماہر ندیم صاحب کا اسلوب عمدہ ہے۔ پڑھتے ہوئے اور پڑھتے رہنے کی خواہش موجود ہوتی ہے اور یہ لکھنے والے کی بڑی کامیابی مانی جاتی ہے۔

انہوں نے سڑکوں، ہوٹلوں، گلیوں، چوراہوں، عمارتوں کو غور سے دیکھا، ان کے ناموں پر حیران بھی ہوئے اور گلی محلے، چوراہے کے ناموں سے محظوظ بھی ہوئے۔ انہوں نے اتنے نام لکھ ڈالے جتنے خود ہمیں بھی معلوم نہیں۔ وہ ایک کالونی میں بھی گئے جس کا نام ''خاموش کالونی'' ہے۔ یہ نام تو ہم بھی جانتے تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ خاموش کالونی کے لوگ ضرورت سے زیادہ بولتے ہیں۔ ان کا یہ تجربہ دلچسپ بھی ہے اور حیرت ناک بھی کہ وہ کہاں پہنچ گئے۔

چودہ اگست کے باعث انہوں نے شہر کراچی کو سبز ہلالی پرچم سے سجا ہوا دیکھا، انہیں اپنے ملک کا جھنڈا یاد آ گیا۔ انہیں حفیظ جالندھری بھی یاد آئے جو قومی ترانے کے خالق ہیں۔

ایک شکایت ہمیں ماہر صاحب سے ہے۔ ہم قائداعظم محمد علی جناح کو اسی پورے نام سے پکارتے ہیں۔ انہوں نے قائداعظم کو بریکٹ میں کیوں لکھا؟ کیا سرسید احمد خان کا نام لکھتے ہوئے ''سر'' کو بریکٹ میں لکھنا اچھا لگے گا؟ یہ خطاب نام کا حصہ ہوتے ہیں انہیں نام کے ساتھ ہی جوڑ کر لکھنا چاہیے۔

''شہر کراچی کی شام کو بڑے خوب صورت پیرائے میں بیان کیا۔ یہ شام مغرب کے بعد شروع ہوتی ہے، دیر تک سڑکوں پر رونقیں براجمان رہتی ہیں، لوگ دن بھر مسائل سے الجھتے لڑتے گرتے سنبھلتے اپنے اپنے آشیانوں پر پہنچتے ہیں لیکن سلام ہے ان کی ہمت کو، شام کو یہی تھکے ماندے جسم ایک نئی قوت، نئی توانائی اور نئے جوش کے ساتھ اپنے اہل وعیال کے ہمراہ بدن سے تھکن نوچ پھینکتے ہیں اور ایک نئی صبح کے لیے خود کو تیار کر لیتے ہیں۔''

ان چند اقوال سے شہر کراچی کا مکمل تعارف ہوجاتا ہے اور یہیں سادگی سفرنامے کو دلچسپ بناتی

ہے۔

کراچی میں رہتے ہوئے انہیں رشتوں میں حدّت کا احساس ہوا کہ اب بھی برقرار ہے۔ وہ مانتے اور جانتے ہیں کہ یہاں کے لوگ ملنسار ہیں اور مہمان نواز بھی ہیں۔ ان کا یہ تجزیہ ان کی باریک بینی کا مظہر ہے۔

سفرنامے کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ سیاح کے ساتھ قاری بھی قدم سے قدم ملا کر چلے۔ ان کے سفرنامے میں میں بھی مسلسل ساتھ ساتھ رہی۔ بعض جگہوں پر تو انہوں نے میرے ہی شہر کو مجھ سے ملا دیا۔

عمدہ اسلوب اور تاثرات و مشاہدات کا سلیقہ جا بجا مجھے ان کی تحریر میں نظر آیا۔ جو ایک اچھے بھرپور اور کامیاب سفرنامے کی دلیل ہیں۔

اس شہر سے رخصت ہوتے وقت وہ خوش نظر نہیں آئے اور ہمیں یہ محسوس کرایا کہ وہ کراچی کو بھولیں گے نہیں پھر آئیں گے۔

اے کراچی اے دیارِ علم و عرفان الوداع

وقتِ رخصت یہ کلمات تو یہی باور کرا رہے ہیں۔

☆☆☆

سفرنامہ کراچی۔ ماہر ندیم (قطر)

159 ۔سال بعد

تبیین الکلام کی اشاعت غازی پور میں 1863ء میں ہوئی۔ غازی پور میرے اجداد کا شہر ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہی کے لیے موجود ہیں کہ میرے اجداد کا سر سید احمد خان سے گہرا تعلق تھا اور انہوں نے دامے، درمے، سخنے سر سید احمد خان کا ہر موقع پر ساتھ دیا' اسی باعث سیدی درس گاہ کے ظہور گیٹ پر ان کا نام آج بھی موجود ہے۔

غازی پور کا شمار ہندوستان کے قدیم اور اہم ترین شہروں میں کیا جاتا ہے۔ مغلوں نے اپنے دور حکومت میں غازی پور میں عظیم الشان عمارات، درگاہیں، خانقاہیں، باغات اور درس گاہیں بنائیں۔ یہاں علماء اور مشائخ کثرت سے آئے اور آباد ہوئے۔

سلسلہ سہروردیہ کے علاوہ یہاں سلسلۂ شطاریہ' سلسلۂ قادریہ' سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ نے جگہ بنائی۔ دریائے گنگا کے کنارے آباد اس شہر کو گلابوں کے شہر کا نام دیا گیا۔

اس پُرسکون شہر میں رابندر ناتھ ٹیگور نے گیتانجلی نام کی کتاب لکھی اور نوبل انعام جیتا۔

یقیناً سر سید احمد خان نے بھی یہاں کے دینی اور علمی ماحول میں جو دو سال گذارے وہ بڑے قیمتی سال تھے کہ انہوں نے اپنی پہلے اور بعد کی تمام کتابوں میں سب سے اہم اور ضروری کتاب یہاں بیٹھ کر سکون سے لکھی اور جس کا لکھنا وقت کی ضرورت بھی تھا۔

مذہبی چاشنی کے ماحول میں توریت، انجیل اور قرآن پاک کے حوالے یقیناً کسی پُرسکون جگہ کے متلاشی تھے جو سر سید کو میسر آئے اور یوں تبیین الکلام مرتب ہوگئی۔

کتاب کا مسودہ ہاتھ میں لے کر بار ہا مجھے یہ خیال آتا رہا کہ اس قیمتی کتاب کا کوئی صفحہ' کوئی سطر ضرور میرے اجداد کی نظروں سے گذری ہوگی بلکہ شاید تبادلہ خیال بھی ہوا ہوگا۔ کتاب کی جدید اشاعت میں کسی نہ کسی حیثیت سے میری شرکت قدرت کا انوکھا تحفہ ہے کہ 159 سال بعد اپنے اجداد کی تیسری نسل کی ایک ادنیٰ فرد ایک بار پھر صفحہ پلٹتے' پڑھنے اور اشاعت کے کاموں

میں شریک ہونے پر مامور کردی گئی ہوں جو کہ مشفق شخصیت جاوید انوار صاحب کی مہربانی ہے۔

کتاب تو مسلمانوں کی تہذیب ہے۔یعنی الکتاب کے تو ہم وارث ہیں۔از سرنو کتاب کے محرک ہمارے ممتاز اکبر کاظمی ہیں جو کائنات کے خالق اور کن فیکون کے رب کے شاہکار ہیں۔ خدمتِ خلق کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں۔ابتدائے شباب سے لے کر سر میں چاندی کے تاروں سے بجتے رباب تک زندگی کا ہر لمحہ فکر قوم اور فکر علی گڑھ تنظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسرے ہیں ہمارے جاوید انوار صاحب جو جب عشق کرتے ہیں تو انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔سرسید سے عشق ان پر فرض بن کر سوار ہے' ان کے نام سے منسوب دونوں اداروں یعنی سرسید یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے روح رواں ہیں۔سیدی درسگاہ سے منسلک جناب پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب کو اس اہم کام میں شریک کیا گیا جو نہ صرف عربی زبان کے ماہر بلکہ قلم کے دھنی بھی ہیں۔

بس چند ماہ میں 38 صفحات کے پیش لفظ تقدیم جیسی خوب صورت اور مدلل تحریر لے کر شامل ہو گئے۔

ہم چند چھوٹے موٹے لوگ نوک پلک سنوارنے میں کیوں پیچھے رہتے۔اس اعزاز پر شاداں وفرحاں ہیں۔اب اگر 159 سال بعد پھر جدید رسم الخط میں اس کتاب کی اشاعت کسی تین عاشقوں کے ہاتھوں ہوئی بھی تو ہم تو یقیناً نہیں ہوں گے مگر ہمارا ذکر ضرور ہوگا۔ہم اپنے ان تین عاشقوں کے ساتھ اپنے آپ کو بھی تبیین الکلام کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

بزرگی بہ شکل است....

اچھی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے لفاظی کی ضرورت نہیں ہوتی۔اُس کے بارے میں تو باتیں دل سے نکلتی ہیں۔ سید ممتاز اکبر کاظمی ایسی ہی شخصیت ہیں جو صرف نام کے نہیں بلکہ کام کے بھی ہیں۔ جو کام کرنے کا سوچ لیں اسے انتہا تک پہنچانے کے قائل ہیں۔اللہ نے ان کے منحنی جسم میں فولادی عزم بھر دیا ہے۔ ان کی شرافت، حلیے اور کام کے معیار کو دیکھ کر ان کی بزرگی پر بیعت کرتے ہی بنتی ہے۔ان کا مشاہدہ عمیق ہے اور تجربات وسیع ہیں۔ مہمان نوازی ان کا مشغلہ ہے،لیکن غرورِ ذات کا گناہ کبھی نہیں کیا۔ وہ توانا جذبوں کے بوڑھے آدمی ہیں۔

اُن کا قول ہے: ''انسان دنیا میں اپنے لیے اتنا رزق جمع نہ کرے کہ خود اُس کے بوجھ تلے دب جائے۔'' اسی لیے وہ انتہائی فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔انھیں دلوں میں گھر کرنے کا فن آتا ہے۔محفل آرائی کاظمی صاحب کی ذات کا حصہ ہے'ان کی گفتگو میں بلا کی دل کشی اور ساحری ہے۔ سادہ کھاتے ہیں، سادہ پہنتے ہیں اور پیچیدہ سوچتے ہیں۔سامنے والے کو متحیر کر دیتے ہیں۔

اسی پیچیدہ سوچ کے نتیجے میں انھوں نے تاریخ کے اوراق میں محفوظ کئی شخصیات کو''سرسید اور اُن کے رفقا و معاونین...... عکسی یادنامہ'' کی صورت میں پیش کر کے وقت کی اتھاہ گہرائیوں سے کئی گہر ہائے آب دار نکالے ہیں۔ اُن کی یہ کاوش دراصل تاریخی شعور کو مہمیز دے گی۔ یہ دستاویز محققین کے لیے قطب نما کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دراصل عہد ماضی کی تصویریں ہیں اور دل کی تفسیریں بھی۔ان تمام محترم شخصیات کا انتخاب ان کی کارگزاری پر کیا گیا ہے۔''سرسید اور اُن کے رفقا و معاونین...... عکسی یادنامہ'' میں ان تمام رفقا، معاونین اور محسنین سرسید کے کارہائے نمایاں نگاہوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ قارئین یاد اور روایت کے اس گنج گراں مایہ سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ ممتاز کاظمی صاحب نے اپنی پہلی آواز 15 جون 1935ء کو بھوپال میں بلند کی۔ وہ بھی کیا

دن رہا ہوگا۔

میٹرک علی گڑھ یونیورسٹی سے 1949ء میں کیا، جہاں ان کی جلا ہوئی۔ 1956ء میں NED سے سول انجینئر نگ میں ڈپلومہ کیا۔ 1956ء سے 1976ء تک آرامکو، سعودی عرب میں ملازمت کو خیر باد کہہ کر کراچی آ گئے۔

اب ان کی تخلیقی کاوشوں کا آغاز ہوا۔ اگرچہ پاکستانی کمیونٹی کے لیے ایک اسکول کی بنیاد وہ الخبر، سعودی عرب میں دورانِ ملازمت ہی رکھ چکے تھے۔ کراچی آ کر برائٹ فیوچر انگلش اسکول قائم کیا۔ بہادر آباد کراچی میں مسجدِ قرطبہ تعمیر کرائی۔ 2002ء میں خدمتِ انسانیت کے پیش نظر آسرا سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔

گھارو، ٹھٹھہ میں ''آسرا جنرل خیراتی اسپتال'' قائم کیا۔ 1978ء سے 1990ء تک ممتاز بلڈرز کے نام سے ایک ادارہ بنایا اور کام کرتے رہے۔ 1980ء سے 2016ء تک مرغ بانی، ماہی پروری اور مواشی کا ممتاز نامی فارم قائم کیا۔

یہی نہیں ممتاز کاظمی صاحب نے قلم سے بھی کام لیا۔ پانچ زبانوں پر مشتمل (انگریزی، اردو، ہندی، گجراتی اور عربی) ایک ہی جلد میں قرآن مجید کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ قرآن خوانی یا قرآن فہمی''، یتیم، سسٹر ک'' (اردو اور سندھی زبان میں)، ''جمعے کے خطبات' ویلنٹائن ڈے یا رسم گمراہی'' نام کی پانچ کتابیں تصنیف کیں۔

اتنی مختلف جہتوں میں کام اور ہر کام نوک پلک سے آراستہ، کاظمی صاحب کی شخصیت میں سلیقہ جیسے کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ سر ٹوپی کے بغیر اور ہونٹ مسکراہٹ کے بغیر کبھی نہیں دیکھے گئے۔

ہم ایک شہر میں رہتے ہوئے دیر سے ملے لیکن کچھ ہی عرصے میں دیر تک نہ ملنے کی تلافی کر لی۔ اب ہم علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے جڑے ہیں۔ اپنے علی گڑھ کی باتیں کرتے ہیں، اور وہ قرض اتارنے میں لگے ہوئے ہیں جو اس شہر نے تعلیم اور تربیت کی صورت میں اپنے شاگردوں کو عطا کیا ہوا ہے۔ میں تو خیر بالواسطہ اس عظیم ادارے سے منسلک ہوں جو میرے اجداد نے اپنی تعلیم اور اپنی خدمات کے صلے میں حصے دار بنا دیا ہے۔

کاظمی صاحب سے ملنا، ان کے کام اور شخصیت کو قریب سے دیکھنا پھر سب سے بڑھ کر بہت

کم صلاحیتوں کے باوجود ان کی اس عظیم تخلیق پر اپنے نام کا ایک صفحہ حاصل کرنا میری قسمت اور اللہ کی عنایت کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

چھوٹا ہو کر بڑوں کو دعا دینا اگر چہ رائج نہیں ہے لیکن دل کی آواز بڑا چھوٹا نہیں دیکھتی سو غالب کی زبان میں دعا ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

☆☆☆

(کتاب "سرسید اوران کے رفقاو معاونین۔عکسی یادنامہ")

ممتاز اکبر کاظمی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی

دورُتوں کا زادِ سفر

خورشید اقبال حیدر سے میری ملاقات مختلف تقاریب کے حوالے سے ہوتی رہی ہے۔ اکثر لوگ اپنے رویّے اور سلوک کی بنا پر قریب آجاتے ہیں اور عام حاضرین سے خاص بن جاتے ہیں۔ خورشید اقبال حیدر ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ان سے ملنے اور ان کے سلوک کے باعث وہ میرے لیے اہم بن گئے، لیکن مجھے ان سے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ وہ ملتے ملتے مجھ سے کچھ لکھنے اور بولنے کی فرمائش بھی کرنے لگیں گے۔ پہلی بار 2 نومبر 2007ء کو جب ان کی شعری کتاب ''تم'' کی تقریب پذیرائی منعقد ہوئی تب انہوں نے مجھے گھیر لیا۔

ایک مضمون نہ صرف لکھنے بلکہ پڑھنے پر بھی آمادہ کیا، میں بہ مشکل یہ وار سہہ گئی اور اس کے بعد پانچ سال کا عرصہ خیریت سے گزر گیا۔ ہماری ملاقات حسبِ روایت ہوتی رہی، کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ ان کی لکھت پڑھت کے بارے میں بھی دریافت کرتی رہی، لیکن اب میں ان سے بالکل خوف زدہ نہیں تھی کہ ایک بار کا تجربہ انہیں ہوشیار کر چکا ہوگا، مگر میرا اندازہ غلط نکلا اور دوسری بار ان کا حملہ اور شدید تھا۔ ''دورتوں کے درمیاں'' ان کا ایک اور شعری مجموعہ آنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ایک دن انہوں نے اس کا مسودہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور کہا کہ اس پر لکھنا ہے۔

لکھنا مشکل کام نہیں لیکن اچھا اور مطلب کا لکھنا مشکل کام ضرور ہے جو مجھے نہیں آتا، اور پھر شاعری پر لکھنا تو بالکل بھی نہیں۔ بہت سمجھایا کہ آپ سمجھ دار ہیں اور آپ کے روابط بھی بڑے بڑے لکھاریوں سے ہیں، باز آجائیں۔ مگر وہ باز نہیں آئے، اور میں وہ کام کرنے بیٹھ گئی جس پر مجھے خود بھی اعتبار نہیں۔ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لینے کے ہنر سے بھی واقف نہیں۔ سوا ایک ایک شعر کو بار بار پڑھنا، معنی مطلب تو پہلی بار ہی سمجھ میں آجاتا ہے لیکن اس کے حسن و قبح پر تبصرہ کرنا میرے بس میں کہاں!

ممتحن جس طرح امتحان کے لیے تین گھنٹے دیتے ہیں، انہوں نے از راہِ مہربانی مجھے تین دن دے دیئے۔ چلیے میں نے تو ان دنوں میں جو آیا لکھ دیا، اب پڑھنے والے جانیں اور لکھوانے والے۔

خورشید اقبال حیدر کا نام شاعری کی محفلوں میں یقیناً نیا نام نہیں ہے۔ ان کے اور بھی مجموعہ کلام چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ہاں ایک نیا مجموعۂ کلام ''دورتوں کے درمیاں'' آیا چاہتا ہے، اس مجموعے میں ایک حمد، ایک نعت اور 113 غزلیں شامل ہیں۔ ان غزلوں کے تمام اشعار عام فہم اور پُر تاثیر ہیں، جن میں ہر فرد کی زندگی کے مختلف ادوار کا عکس موجود ہے۔

میں نے ان تمام غزلوں کو بڑے انہماک اور دلچسپی سے پڑھا ہے۔

خورشید اقبال حیدر مجھے ایک سپیرے کی مانند لگے کہ جن کی پٹاری میں سانپوں کے بجائے دل بند ہیں۔ ایسی کہانیاں، کیفیات اور لمحے بند ہیں جو ہر ایک کی زندگی میں موجود ہوتے ہیں، جن کا کچھ لوگ اظہار کر پاتے اور کچھ بلکہ بیشتر لوگ اظہار نہیں کر پاتے کہ وہ قلم کے آدمی نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن بے لکھی غزلیں ہر ایک اپنے اندر پاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی حصے میں کسی شخص سے معمولی سا تعلق دل کی حساس پلیٹ پر دائمی نقش بن جاتا ہے اور زندگی کے سمندر میں وہ شخص جزیرہ بن کر ابھرتا ہے اور اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے، اس سے ایک نامعلوم اور بے نام سی محبت ہو جاتی ہے۔ وہی نقش، وہی نام احساس میں غزل کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ وہ ملے نہ ملے، اپنے اندر کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔

منیر نیازی نے کہا تھا ؂

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

خورشید اقبال حیدر کے دل میں بھی کوئی ایک ایسا ہی جزیرہ ہے، انہوں نے اس خیال کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے ؂

میں نے بھی صدا دی ہے شاید وہ پلٹ آئے
ویسے تو نہیں ممکن اب اس کے نگر جانا

دہلیز پہ تنہائی نے رو کے کہا مجھ سے
جب اس سے بچھڑ جانا تو لوٹ کے گھر جانا
گھر کا اب بھی کھلا ہے دروازہ

خورشید اقبال حیدر کی شاعری ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے میں گندھی ہوئی ہے جو ان کے دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کے ہاں زندگی جینے کا نام ہے، وہ زندگی سے منہ موڑنے کی بات نہیں کرتے، نہ اس کے قائل نظر آتے ہیں۔

پہلے اس سے ملوں اور اس کے بعد
اس کی آوازِ پا سے بات کروں
اسی کو مجھ سے عداوت اُسی کو مجھ سے گلہ
محیط ہے جو مرے خواب پر خیالوں پر
تم پر کھل جائیں گی بے تابیاں ساری میری
تم ذرا عشق کسی اور سے کر کے دیکھو

آوازِ پا سے بات کرنے کی ترکیب خوبصورت ہے۔ پھر کہتے ہیں تم ذرا عشق کسی اور سے کر کے دیکھو، بات مختلف ہے۔

خورشید اقبال نے صنعتِ تلمیح (جس میں کسی آیتِ قرآنی یا تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کیا جائے) کا اس شعر میں کیا خوب استعمال کیا ہے ؎

ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے نفرتوں کی آگ کا
مجھ کو اپنے گھر میں اپنے بھائیوں کا خوف ہے

ہم سب جانتے ہیں کہ اس شعر میں قرآن کریم کی سورہ یوسف کا حوالہ ملتا ہے جہاں حضرت یوسفؑ کو اپنے بھائیوں سے خطرہ رہا۔ اسی طرح حیاتِ مبارکہ کے اہم ترین واقعات میں آپ کا سفرِ معراج بھی شامل ہے، اس کی بھی جھلک اس شعر میں ملتی ہے ؎

وہ انساں تھے گزر آئے وہاں سے
فرشتہ بھی نہ پہنچا تھا جہاں تک

وہ ایک سفر سے پلٹ کے آیا ہے
جہاں پہ آج کے انساں کا نقشِ پا بھی نہیں

خورشید اقبال کے یہاں تجاہلِ عارفانہ بھی ہے۔ آپ محسوس کیجیے ان میں کتنا درد اور سچائی ہے ؎

محبتوں میں عجب سلسلے ہیں جانِ وفا
کبھی وہ آیا کبھی میں بلا کے لایا ہوں
جس کو کرنا تھا فراموش اسے یاد رکھا
یاد رکھنا تھا جسے اس کا پتا بھول گیا

وہ جانتے ہیں کہ زندگی زندہ رہنے کا نام ہے صرف موجودگی کا نہیں، وہ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ؎

دو پل کی مسافت ہے اور زادِ سفر اتنا
رہنا ہے ہمیشہ کیا دنیا کے نظاروں میں
گھٹن ایسی ہے کہ نہ جانے کب سانسیں اکھڑ جائیں
رہے گا کون زندہ دیکھنے کہ کب ہوا بدلے

خورشید اقبال کے ساتھ چلیے تو وہ ہمیں اپنی آنکھوں سے دیکھے خواب دکھاتے ہیں ؎

آنکھوں میں خواب، خواب میں چہرے نئے نئے
کرتے ہیں روز مجھ سے تقاضے نئے نئے
خواب سے جاگ کر ہر بار یہی سوچتا ہوں
لوگ ملتے ہیں کہاں خواب نگر کے دیکھو
تم مرا خواب ہو مگر دیکھو خواب نہ ہو جانا
یہاں لفظ و معنی میں مکمل ہم آہنگی ہے

مجھے چند شعر بہت پسند آئے، یہاں صرف دو اشعار بیان کروں گی ؎

ہمیں واپس درختوں پر لگا دو
ہوا سے خشک پتے بولتے ہیں
عجیب شخص تھا وہ جس کے لوٹ جانے سے
بجھے ہوئے ہیں سرِ شام بستیوں کے چراغ

لفظ 'گھر' بعض شعرا نے اپنے اشعار میں متعدد بار استعمال کیا ہے، جن میں انور شعور مجھے سرِفہرست نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے میں بھی لفظ 'گھر' بار بار بلکہ 39 بار استعمال ہوا ہے۔

زخم کھا کر شکار جس میں چھپا
مرا گھر تھا اسی چٹان کے بعد
ہمارے یار کئی کوٹھیاں بنا ڈالے
ہم ایک گھر ہی بنانے کی آرزو میں رہے
اب سوچ لیا ہے ہم نے اس راہِ محبت میں
گھر جاتا ہے گھر جائے سر جاتا ہے سر جائے
اُس گھر میں اترتے نہیں خوش رنگ پرندے
جس گھر میں چہکتے ہوئے بچے نہیں ہوتے

خورشید اقبال حیدر نے کئی جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر بھی شعر کا پیکر تراشا ہے۔ مثلاً:

پھول، خوشبو، دھنک، چاند تارے، فلک، ہم نشیں چھوڑ دو
اس سے پہلے کہ لاوا اگلنے لگے یہ زمیں چھوڑ دو
کچے پھل، باغ، مالی کے قصے انہیں میں سناتا رہا بچے سنتے رہے
رات ڈھلتی رہی وقت کٹتا رہا، بھوک نے پھر کسی کو ستایا نہیں
رات فلک اور چاند ستارے، جھل مل جھل مل سپنے سارے
مچھلی، پانی، جھیل کنارے جھل مل جھل مل سپنے سارے

میں نے لفظ لفظ ان کی شاعری کو پڑھا، سمجھا اور محسوس کیا۔ وہ تمام وقت اچھا گزرا جو اس کے مطالعے میں بسر ہوا۔ ہم جیسے لوگ جس قدر محسوس کرتے ہیں اس قدر خوبی سے اس کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ''دوریوں کے درمیاں'' کی آمد پر خورشید اقبال حیدر کو اسی جذبے اور شوق سے مبارک باد پیش کرتے ہیں جس جذبے اور شوق سے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔

کتاب: دوریوں کے درمیاں

خورشید اقبال حیدر

کچھ میری زباں سے

دردانہ گھر میں موتی کہلاتی ہیں۔ گویا گھر میں پیار سے پکارنے کے لیے نہ اُن کا نام بگاڑا گیا، نہ انہیں ننھی، بے بی، گڈی قسم کا اضافی نام ملا، بس اُن کے اصل نام کا ترجمہ کر دیا گیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، جب وہ پیدا ہوئیں تو واقعی موتی دانہ تھیں۔ کہتے ہیں اندھیرے کمرے میں بھی اُن کا سفید رنگ اجالا کر دیتا تھا۔ ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔ وہ گھر میں ایک خوب صورت اضافہ تھیں۔ بچپن کی ہجرت اور بچپن کی یتیمی نے یقیناً انہیں حساس بھی بنا دیا۔ کم عمری میں شادی ہوگئی۔ کراچی یونیورسٹی سے جغرافیہ میں بی اے آنرز ہی کر پائی تھیں کہ پاکستان کے شہروں میں گھومنے پھرنے لگیں۔ جلیل صاحب کیپٹن، میجر اور پھر کرنل بن کر انہیں پاکستان کے جغرافیائی خدوخال کا عملی مظاہرہ کراتے رہے، اور پھر 1971ء کی جنگ میں جنگی قیدی بن کر ہندوستان چلے گئے۔ قید کے وہ تمام دن اُن کی زندگی میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ جیسے گزرے ہوں گے، پاکستان کے دیگر ایسے فوجیوں کی بیگمات سے مختلف نہ ہوں گے۔

بعد کی زندگی کسی حد تک خوشی کی زندگی تھی۔ کوہاٹ، سیالکوٹ اور ایبٹ آباد کا کول کے قیام کے دوران اُن کے گھر ادبی محافل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُن کا ذہن اور اُن کا شجرۂ نسب ادب کے جراثیم سے گندھا ہوا تھا، لہٰذا پہلے تو انہوں نے اپنا ایم اے، پنجاب یونیورسٹی سے مکمل کیا، پھر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مختلف اخبارات ورسائل میں اپنے مضامین شائع کرواتی رہیں، لیکن شاعری کو چھپاتی رہیں۔ کب تک چھپاتیں؟ ہم تک اس کی خبر پہنچ ہی گئی۔ بڑے اصرار کے بعد اب وہ اس بات پر آمادہ ہوئیں کہ اپنا مجموعہ کلام شائع کرائیں۔

اس دوران جلیل صاحب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور وہ شہروں شہروں گھومتی کراچی میں آ کر ٹک گئیں۔ پڑھنے لکھنے کے بعد بچوں کے پَر لگ گئے۔ وہ اپنے اپنے آشیانے ڈھونڈنے نکل پڑے اور دردانہ اکیلی رہ گئیں۔ پاکستان کے بیشتر والدین کا یہی ایک مشترکہ المیہ ہے، بلکہ اب

میں تو پاکستان کو سینئر سٹیزنز کا ملک کہتی ہوں۔

آیئے میں آپ سے اُن کا مختصر تعارف کراتی ہوں۔

وہ میری بڑی بہن ہیں اور اکلوتی بہن بھی۔ ہمارے ابا شاعر تھے۔ دادی بھی شاعرہ تھیں۔ دونوں کے کلام میں نے اُن کے انتقال کے نصف صدی بعد شائع کرائے ہیں کہ میری اُن دونوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اور یہ بھی کہ وہ ہجرت سے قبل کے لوگ تھے اور ہم بعد کے۔ پردادا فارسی زبان کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ننھیال کی طرف آئیں تو ماموں، ممانی اور دیگر بہن بھائیوں اور رشتے داروں کی شاعری کے میدان میں طبع آزمائی موجود ہے۔ سو ہماری بہن نے شاعری کے جراثیم اُن ہی تمام لوگوں سے چرائے اور مدتوں اندر ہی اندر اُن کی پرورش کرتی رہیں۔ کانوں کان کسی کو اپنی شاعری کی خبر نہ ہونے دی۔ مجھے معلوم تھا اور تعلیمی زندگی کے دنوں میں جب بھی تعطیلات گزارنے اُن کے یہاں جاتی، ادیبوں اور شاعروں کی محفل میں انہیں گھرا پاتی۔ کرنل شفیق الرحمن اُن کے بہت قریبی دوستوں میں تھے جن کے ساتھ ہر شام لان پر محفل سج جاتی اور اُن کی شوخیِ تحریر سے محفل زعفران زار رہتی۔ کوہاٹ پوسٹنگ کے دوران فارغ بخاری، محسن احسان، خاطر غزنوی اور کراچی سے آئے ہوئے شبنم رومانی کے ساتھ جو محفل جمتی وہ اپنی نوعیت کی ایک ہی ہوتی۔

کرنل جلیل احمد بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے اور ''رزم و بزم'' کے نام سے اپنا مجموعہ چھپوا چکے تھے۔ ان محفلوں سے انہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ حافظے کی ملکہ ہیں۔ اپنے پسندیدہ شاعر اقبال کے کلام کو انہوں نے ذہن میں جگہ دے رکھی ہے اور موقع بہ موقع اُن کے برمحل شعر سنا کر حیران کر دیتی ہیں۔ مگر مزاجاً وہ ایک گھریلو عورت ہیں اور انہیں ایک سگھڑ عورت کے تمام کام آتے ہیں۔ چھ فٹ کے آدمی کا سوئیٹر وہ صرف دو راتوں میں بُن لیتی ہیں۔ نومولود کے لیے سوئیٹر بُننا تو گویا ان کا خاندانی فریضہ ہے ہی۔ سوئی دھاگے کا کام اس صفائی سے کرتی ہیں کہ گمان ہوتا ہے گویا رنگ اور برش استعمال کیا ہے۔ ہر دھاگا اپنی جگہ نفاست کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ ڈبل بیڈ کی چادروں پر پھول وہ یوں کاڑھتی ہیں جیسے یہ کام دنیا کا سب سے آسان کام ہو۔ چارسوتی کا کام خواہ لباس پر ہو، چادروں پر ہو یا سینری کے لیے ہو، مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ بالشت بھر چوڑی

کروشیا کی بیل بناتے انہیں دیر نہیں لگتی۔ میں نے اُن کے اس سارے ہنر سے زندگی بھر فائدہ اٹھایا ہے۔ چھوٹی بہن اور اکلوتی بہن ہونے کے باعث یہ حق بنتا ہی تھا!

میں بھلا اُن کے کیا کام آتی۔ تھوڑا بہت کھانا بنا لیتی ہوں اور اچار چٹنیوں سے اُن کا حق ادا کر دیتی ہوں۔ وہ اِسے بھی احسان سمجھ کر قبول کرتی ہیں۔

سوچا اُن کی شاعری کو جمع کر دوں۔ سو بڑی بہن بن کر ذرا اونچی آواز نکالی اور دفن شدہ کلام برآمد کرا لیا۔ ''موتی نامہ'' نام دیا جواب آپ کے سامنے ہے۔ یوں 36 برس سے چھپے چھپائے اشعار بس صرف 36 دنوں میں کتاب میں سمٹ کر چھپے چھپائے ہو گئے۔ یہ موتی دانہ تھے، موتی نامہ کہلانے لگے۔

☆☆☆

(کتاب "موتی نامہ" دُردانہ جلیل)

شمی فاروقی کی سُر آتما

شمی فاروقی نے تعلیم حاصل کی۔ ملازمت کی اور سبک دوش بھی ہو گئے۔ کراچی سے ہجرت کی، شکاگو پہنچ گئے۔ اس تمام عرصے میں اُنہوں نے جی بھر کر شاعری کی۔ غزل نظم اور گیت تینوں اصناف میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائے۔ کچھ عرصے اشتہاری ادارے میں بھی ملازمت کی اور خوب صورت جنگل تحریر کیے جو میڈیا میں بہت مشہور ہوئے۔ پرنٹ میڈیا ہو یا برقی میڈیا دھوم رہی۔ مگر واہ رے شمی فاروقی کہ انہوں نے اپنے آپ کو پردے میں چھپائے رکھا۔ نہ کسی سے مبارک باد لیتے تھے۔ نہ ان کی گردن میں تناؤ پیدا ہوا۔ اُن کے زمانے کی نسل تو دنیا سے چلی گئی یا گھر بیٹھ رہی۔ نئی نسل کے لیے ان کا نام نیا رہا۔ مشاعروں کی بیٹھک میں بھی کبھی نظر نہیں آئے۔

کلاس فیلو ہونے کے ناطے اب مجھے انہیں ڈانٹنا ضروری ہو گیا۔ اللہ کے بندے اپنی شاعری کو ترتیب دو۔ تینوں اصناف کی تین کتابیں تو لے آؤ۔ میری اس ڈانٹ یا تاکید پر وہ صرف ایک مسکراہٹ میں جواب دے دیتے۔ یوں یہ سلسلہ دو تین دہائیوں تک جاری رہا۔ پھر جب میں نے "کُٹی" کرنے کی دھمکی دے دی، تب اللہ اللہ کر کے انہوں نے اس شرط پر مجموعہ چھاپا کہ اس پر میں کچھ ضرور لکھوں گی۔ لیکن ساتھ ہی عاجزانہ لہجے میں کہا، "کچھ خیال کرنا میرے بچوں میں میری عزت باقی رہے۔"

کتاب آ گئی اور بچوں میں ان کی عزت پر کوئی حرف نہیں آیا۔ اب رہا گیت کا مسئلہ تو اس کا مسودہ کئی برس میرے پاس ان کی امانت کے طور پر محفوظ رہا۔ ہر بار کراچی آمد پر میرا اصرار ہوتا۔ اُسے چھاپو جواب ملتا تم اس پر کچھ لکھو۔ یوں کئی دہائی گزر گئی۔ اب میں نے دھمکی دی کہ اسے میں اپنے نام سے چھاپ لوں گی۔ شمی نے کہا، "جاؤ چھاپ لو۔ یہ ہے شمی کا اپنی شاعری سے سلوک۔"

اب جبکہ شمی نے دسمبر میں کراچی آنے کے وعدے کے باوجود اپنے آپ کو شکاگو کی دو گز زمین کے حوالے کر کے کبھی نہ آنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے وہ سارے ہاتھ سے تحریر کردہ

صفحات نکالے اور گھنٹوں ان پر آنسو کے قطرے بہانے کے بعد زیرِلب کہا "شبی تم جیت گئے۔ میں اپنی کم علمی کے باوجود تمہاری سُر آتما پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گی۔"

میں نے جس قدر گیت، گیت نگاروں اور گیت کی تاریخ پڑھی ہے یہ کہہ سکتی ہوں کہ کسی بھی ادب میں شاعری بہت اہمیت رکھتی ہے۔ شاعر دو لائنوں میں جو بات کہہ دیتا ہے اس کی عمر صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ گیت اُردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے کہ اس میں نہ تو الفاظ کی بازی گری ہوتی ہے اور نہ مبالغہ آمیزی بلکہ اس میں سیدھے سادھے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ گیت میں شاعری اور موسیقی ایک جان ہوجاتی ہے۔

موجودہ دور میں گیت کی اہمیت کو جاننا اور نئی نسل کو صدیوں پیچھے لے جانا اور پھر موجودہ دنیا سے ربط قائم کرانا اہمیت کا بھی حامل ہے اور مشکل بھی۔ گیت کب، کیوں اور کیسے وجود میں آئے، یہ سب ہمیں کتابوں سے پتہ چلتا ہے اور ہم اب کتابوں سے دُور ہوتے جارہے ہیں۔ اندرسبھا ایک ڈرامہ تھا لیکن وہ ایک گیتوں بھری کہانی بھی تھی جو اسٹیج پر ڈرامے کی صورت میں تحریر کی گئی۔ لہٰذا امانت لکھنوی کو اردو زبان میں گیت کی روایت کا بانی کہا جاتا ہے۔ گیت کو شعور کی پہلی کرن بھی کہنا بے جا نہ ہوگا۔

ٹیگور نے ایک موقع پر کہا تھا، "ممکن ہے میرے آرٹ کی شاہکار نظمیں فراموش ہوجائیں لیکن میرے گیت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔" گیت پڑھیں یا سنیں اس میں ہمارے رسم ورواج، تہذیب، عقائد اور رشتوں کا ملا جلا سماں ملتا ہے۔

شبی فاروقی کی شاعری خصوصاً گیت میں خود ان کے مزاج کی سادگی، برجستگی، معصومیت، بے لوث اپنائیت اور سچائی پنہاں ہے۔ اس کے گیت تصنع سے دور خلوص وجذبات میں رچے بسے ملتے ہیں۔ جابجا ایک سوز کا سا پہلو ملتا ہے۔ چونکہ گیت کا اہم موضوع ہجر وفراق کی تپش ہے۔ اس لیے ان کے گیتوں میں پریتم سے وصال کی بڑی تڑپ پائی جاتی ہے۔

شبی کا قلم اور ان کا اپنا مزاج تصنع سے دور اور خلوص وجذبات سے رچا بسا ہوا ہے۔ لہٰذا ایسا گیت جب کسی سماعت سے ٹکراتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے عقائد، نظریات، زبان، ذات پات غربت اور آسودگی کی دیوار بھی ڈھے جاتی ہے۔ قومی یک جہتی کی یہی روح ہے جو ان کے گیتوں

میں سمائی ہوئی ہے۔

شبی نے خیال آفریں الفاظ وتراکیب کے ذریعہ گیتوں کے مزاج کومشرقیت کی روح میں سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہی کوشش ان کے گیت سننے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی

میں نے شبی کے ابتدائی گیت سے لے کر آخری گیت تک کو ان کے لہجے میں سنا ہے اور بے حد متاثر ہوئی ہوں۔ مگر اپنے مزاج کے سبب کبھی تعریف نہیں کی۔ مگر ایک دوست اور کلاس فیلو کچھ نہ کہنے کو بھی سمجھ لیتا ہے۔ بس مجھے افسوس ہے کہ میں نے شبی کی خواہش کو اس کی زندگی میں پورا کیوں نہیں کیا۔؟

مگر شبی نے بھی تو ایک وعدہ مجھ سے کیا تھا کہ،"تم پر ایسا مضمون لکھ رہا ہوں کہ پڑھ کر تم چیخ پڑو گی۔ ممکن ہے مار بھی بیٹھو'' میرے مانگنے پر اس نے وعدہ کیا تھا اگلے دسمبر میں تمھیں وہ مضمون دوں گا۔

دسمبر بار بار آیا مگر وہ نہیں آیا۔ جانے وہ چیخ والے کاغذات کہاں خاموش پڑے ہوں گے۔

☆☆☆

کتاب سُرآتما۔ شبی فاروقی

پروفیسر حسنین کاظمی کی دلِ شوریدہ

یہ فیصلہ کہ ہمارے ماں باپ، بہن بھائی اور دوسرے رشتے کون لوگ ہوں گے، یہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیتا ہے۔ دوست ہم اپنی طبیعت اور افتاد کے مطابق خود چُنتے ہیں اور استاد ہمارے نصیب سے ملتے ہیں۔ اگر چہ ہمارے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں لیکن بظاہر وہ لوگ جو ہماری پیدائش کے بعد ہماری زندگی میں آتے ہیں، اس کے ذمہ دار ہم ہی ہوتے ہیں۔

میں اگر اپنے حصے کا تجزیہ کروں تو اپنے آپ کو بے حد خوش نصیب مانتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے نیک نام خاندان اور قابلِ ذکر والدین دیئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بے انتہا کرم ہے۔

جو دوست میری زندگی میں آئے اور جنہیں میں نے اپنے سے قریب جانا، جن سے دل کی باتیں کہیں، جن کے ساتھ خوب صورت زندگی گذاری، وہ میرے بہترین رفیق ثابت ہوئے۔ جن سے میں نے کبھی دھوکے نہیں کھائے، جنہوں نے میرا دل کبھی نہیں دکھایا، جو میرے ساتھ زندگی کے نرم گرم دنوں میں میری سانسوں کے ساتھ ساتھ رہے اور پھر تعلیمی زندگی میں جتنے بھی استاد ملے جنہوں نے مجھے علم کی الف ب سکھائی، بڑے بڑے فارمولے یاد کرائے اور زندگی گذارنے کے درس دیئے، وہ سب نامی گرامی استاد تھے۔ بہت چھوٹی کلاس سے شروع کروں تو وہ استانیاں جن کے نام بہت مشہور نہیں تھے لیکن جن کے درس دینے کا طریقہ دل چھو لینے والا تھا۔

اسکول کے اساتذہ تو کمال کے تھے۔ اگر صرف ایک نام صفیہ خان کا لے لوں تو سب پر بھاری ہوگا جو اپنے وقت میں اپنے شہر کراچی میں رول ماڈل کا درجہ رکھتی تھیں۔ جنہوں نے نہ صرف کلاس روم لیکچر ہی دیے بلکہ قدم قدم چلنا، پہننا، اوڑھنا، ہنسنا، بولنا، کتابوں کا چناؤ، رشتوں کا سمجھاؤ اور زندگی گذارنے کی باریک سے باریک باتیں ہماری گھٹی میں ڈال دیں۔ ہمیں ایک منفرد و منتظم اور قبول کی جانے والی عورت بنا ڈالا جو اپنے گھر کو انتہائی سگھڑاپے سے چلاتی ہے۔ ان کی تربیت ہر طالب علم کے لیے یکساں تھی۔ اب ہم میں سے کس نے کتنا سیکھا، یہ اپنا اپنا ظرف تھا۔ کالج میں آئی تو ایسے ایسے

اساتذہ ملے جو اپنے اپنے مضامین میں یکتا تھے۔ پروفیسر حسن عادل، مجتبیٰ حسین، حسن مثنیٰ ندوی، پروفیسر احمد علی، یحییٰ سلام اللہ، ظفر عمر زبیری، شمس الحق، سید مظفر اور پروفیسر حسنین کاظمی۔

قاضی فرید، پروفیسر خورشید احمد، شریف المجاہد، ذکریا ساجد، فرمان فتح پوری اور انجم اعظمی جیسے اساتذہ جو یونیورسٹی میں ملے، نہ صرف زندگی گزارنے کا سلیقہ دیتے ہیں بلکہ اڑ اڑ کر آسمان سے تارے توڑ لانے کے گر بھی سکھاتے ہیں۔ میں اپنی یادوں میں سب کو ہر دم شامل رکھتی ہوں۔ ان کے لیے دعائے خیر چاہتی ہوں اور گذر جانے والے تمام اساتذہ کے لیے بلند درجات کی اللہ سے استدعا بھی کرتی ہوں کہ یہ میرا فرض اور اُن کا حق ہے۔

حسنین کاظمی سے میں نے صرف دو سال نیشنل کالج میں اردو پڑھی۔ گنج ہائے گرانمایہ پڑھاتے ہوئے جب انہوں نے میرے والد پر لکھا جانے والا مضمون شروع کیا تب میں نے اُٹھ کر کچھ سوالات کر ڈالے اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ نے ابتدائی جملے ہی نہیں سمجھائے تو آپ آگے کیا پڑھائیں گے؟ انہوں نے تحمل سے میری نو جوانی والی سرکش گفتگو سنی۔

پھر آپ ہی سمجھا دیں تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے کہا۔

ساتھی طالب علموں کی ہنسنے کی آواز آئی۔ کچھ نے میرا ساتھ دیا اور کچھ نے اُن کا مگر میں بالکل بھی نہیں گھبرائی۔ رشید احمد صدیقی علی گڑھ سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کے خاکے لکھتے وقت بھی علی گڑھ کی فضا کو ان کی شخصیت میں گوندھ کر بیان کیا ہے۔

"بھونپو بے وقت بجا، دل دھک سے ہو گیا۔"

اس جملے سے شروع ہونے والا خاکہ میرے والد کا ہے اور رشید صاحب ان کے استاد تھے۔ استاد نے اپنے شاگردِ خاص پر دل کی روشنائی میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھا ہے۔ جو علی گڑھ کی فضا سے آشنا ہے وہ ان کی تحریر کے مزے زیادہ بہتر طور پر لے پاتا ہے۔ یونیورسٹی سے متعلق کسی بھی شخص کا انتقال ہوتا تب بے وقت سائرن بجا کرتا۔ جتنا بڑا شخص ہوتا اتنی دفعہ سائرن بجتا جسے وہاں کی زبان میں بھونپو کہتے۔ بھونپو بجتے ہی دل دھک سے ہو جاتا۔ کوئی نہ کوئی گذر گیا ہے۔

بے باکی اور بہادری سے کلاس میں یہ جملہ سمجھاتے سمجھاتے میرے آنسو چھم چھم برسنا شروع ہو گئے۔ حسنین کاظمی دونوں کیفیتوں سے متاثر تھے۔ میرے آنسوؤں سے بھی اور میری تقریر سے

بھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ یہ خاکہ میرے والد کا ہے تب انہوں نے مجھے محبت سے دیکھا۔ گھنٹہ بج گیا۔ وہ کلاس سے چلے گئے لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک اچھا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ تقدیر نے بعد کے پچاس سال بھی ہمارے ملنے ملانے کے لیے رکھ دیئے تھے۔ اس سال میں نے ایم اے پاس کیا، اسی سال علامہ اقبال کالج کراچی قائم ہوا۔ مجھے اخبارِ جہاں سے نکال کر وہ اپنے قائم کردہ کالج میں لے گئے اور مجھے شروع ہی میں وہ ذمہ داریاں سونپ دیں جو بہت تجربے کے بعد اساتذہ کو ملتی ہیں۔

ان کے اعتماد نے مجھے کام کرنے اور بہتر کام کرنے کا حوصلہ بخشا۔ میں وہاں استاد تھی اور وہ پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔ جب میں ان پر خاکہ لکھوں گی تب بتاؤں گی کہ شاگردی کی قیمت میں نے کتنی بار چکائی اور استادی کا حق انہوں نے کیسے کیسے جتایا اور اکثر ترس کھا کر یہ بھی کہتے رہے کہ اس بے چاری کو تو اس درسگاہ میں استاد بننا بھی نصیب نہیں ہوا۔

بہرحال ان ہی دنوں انہوں نے جنگ اخبار میں کالم لکھنے شروع کئے جو شروع شروع میں میں ہی پہنچاتی رہی۔

حسنین صاحب تحریک پاکستان، استحکام پاکستان، اقبال اور اسلام کے گرد اپنے قلم کو گھماتے رہتے ہیں۔ پاکستان سے محبت، قائداعظم سے عقیدت ان کی نس نس میں سمائی ہوئی ہے۔ بے حد مخلص، بہت نفیس انسان، شرافت اور پرانی تہذیب کی زندہ علامت ہیں۔ اپنی ذات سے انہیں بالکل محبت نہیں۔ انہوں نے بہت شہرت پائی لیکن کبھی اس کے جال میں نہیں پھنسے۔ مروت ان کے پاؤں کی بیڑی بنی رہی۔ اپنے لیے کسی سے کوئی رعایت طلب نہیں کی۔ دیانت اور شرافت جیسے اُن کے پاس آکر ان کے جسم ہی نہیں، ان کی روح سے بھی لپٹ گئی۔ اتنا بے غرض اور پُر خلوص انسان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ یقیناً تابندہ، طارق ضیا اور عمران اپنے والد کی عزت بھی کرتے ہوں گے اور اُن پر نازاں بھی ہوں گے۔ صاف ستھری شیروانی، سفید دھلا دھلا یا پائجامہ مسکراتا ہوا سنجیدہ چہرہ۔ یہ حسنین کاظمی کی شخصیت ہے۔ پہلو میں دلِ شوریدہ رکھتے ہیں۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو مختلف اداروں میں مروتاً کام کیا۔ لوگوں نے ان کی صلاحیت سے فائدہ اٹھایا، وہ صرف نقصان اٹھاتے رہے۔ تفہیمِ دین کے موضوع پر پی ٹی وی سے مذہبی

پروگرام مدتوں کیا مگر شہرت کی ہوس ان کے پاس بھی نہیں پھٹکی۔ "منزل پاکستان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بے شمار مضامین لکھے۔ سیکڑوں کالم لکھے اور ایک بھی اپنے پاس محفوظ نہ رکھا۔ انہیں اپنے کام سے سروکار تھا، نام سے بالکل بھی نہیں۔ مگر انہوں نے جو زندگی گذاری وہ آج کے ماحول میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص دائرے میں چارکونے سمانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چاروں کونے دائرے سے باہر ہی رہے۔ وہی ان کی شخصیت کی خصوصیت ٹھہری۔ بے غرضی نے انہیں اپنی تحریر سے بھی محبت نہیں کرنے دی۔ کہتے رہے کالم لکھتا ہوں کہ اس سے میری سوچ دوسروں تک آسانی سے اور جلدی پہنچ جاتی ہے۔ یہ بھی کہتے رہے دوسرا جنم اگر ملتا تب بھی میں استاد کے منصب پر ہی فائز ہونے کو ترجیح دیتا کہ اپنی بات روز نو جوانوں تک پہنچانا آسان ہوتا ہے اور یہی فرضِ منصبی بھی ہے۔ مادی زندگی سے بے غرضی نے انہیں کرائے کے مکان میں مقید کر دیا ہے لیکن وہ مطمئن ہیں۔ مگر میں مطمئن نہیں۔ وہ ایسے شہد میں ڈوبے ہوئے بھی نہیں ہیں کہ لوگ دوڑے دوڑے چلے آئیں۔ ان سے اب دوسروں کو کیا ملنا ہے؟ تنہائی اور ماضی کی یادیں لیے وہ پھر بھی اطمینان کی زندگی گزار رہے ہیں، کم از کم اس تنہائی کا شکوہ کرتے وہ نظر نہیں آتے۔ کاتا اور لے دوڑے کے مصداق اب ہر نو جوان شاعر اور ادیب کے ہاتھوں میں کئی کئی کتابیں ان کے نام سے چھپ کر چکی ہوئی ہیں۔ مگر حسنین کاظمی کے ہزاروں شاگردوں کے ذہن میں ان کا دیا ہوا درس ہی موجود ہے جو اب ان کا کارنامہ بھی نہیں گنا جاتا۔ اخباری کالم دوسروں تک تو پہنچ گئے مگر ایک دن کی تحریر دوبارہ پڑھنے کو بھلا کب ملتی ہے؟ میں نے اپنی زندگی کے بہت خوب صورت پچاس سال ان کے ساتھ گزارے ہیں۔ جانے کیا کیا کچھ نہیں سیکھا۔ اب ایک لمحہ مجھ پر ایسا شدید طاری ہوا کہ ان پچاس برسوں کا قرض میں کیوں کر اتاروں، شاگردی کا حق کیسے ادا کروں، ساتھی استاد کی حیثیت سے گزارے دنوں کا حساب کیوں کر کروں؟ سو میں نے سوچا کہ ان کے کالموں کا مجموعہ شائع کر کے لائبریریوں کی زینت بنا دوں کہ کتابوں کی یہ دنیا، رہتی دنیا تک قائم رہتی ہے اور پیاسوں کی پیاس بجھاتی رہتی ہے۔

مگر یہ کام آسان ہوتا اگر وہ کالم ان کے پاس موجود ہوتے۔ ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کی بیگم فرحت کاظمی سے کہا تو وہ حسرت اور محبت سے مجھے دیکھتی ہی رہیں کہ ان سے بھی میرا

رشتہ بہت پرانا ہے اور میں مذاق میں کہتی ہوں آپ کاظمی صاحب کو جتنے عرصے سے جانتی ہیں میں آپ سے دس برس پہلے سے جانتی ہوں۔ محبت اور خلوص کی پیکر ان خاتون نے، جو صرف خاتون خانہ ہیں اور کاظمی صاحب کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو اپنی خدمت سے رنگین بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں، کچھ اخباری تراشے عنایت کئے مگر وہ کافی نہیں تھے کہ میں جانتی ہوں کہ ان کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔

نثار اختر نے جو میرے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، مجھے لکھنے پر اکساتے رہتے ہیں اور میری کتابوں کی اشاعت میں دامے، درمے، قدمے، سخنے شریک رہتے ہیں، میرے ارادے کو سراہتے ہوئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اپنے اسٹیٹ بینک کی پرانی فائلوں سے کالموں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ فوٹو اسٹیٹ کرانا، ترتیب دینا اور دیگر ضروری کاموں میں ہاتھ بٹانا گویا میرے کام کو آسان کر دینا تھا۔ یوں ایک اچھی خاصی کتاب بن گئی۔ اگرچہ ابھی اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ تحریریں ادھر ادھر بکھری، جمع ہونے کی منتظر ہیں۔ زندگی رہی اور توفیق ہوئی تو وہ بھی یکجا ہو جائیں گی۔

طباعت کے لیے رب پبلشرز اس لیے چنا کہ رشید بٹ میرے یونیورسٹی کے کلاس فیلو ہیں۔ خوشامد، اصرار، ڈانٹ ڈپٹ ہر بات کا حق رکھتی ہوں۔ سو جلد از جلد شائع کرنے کا وعدہ لے کر اخباری تراشے ان کے حوالے کئے اور جتایا کہ وہ براہِ راست تمہارے استاد نہ سہی مگر میری معرفت تمہارے بھی استاد ہوئے۔ انہوں نے کچھ پبلشر کی دیر کرنے کی پکی عادت اور کچھ دوستی کی مروّت میں آخر کام مکمل کر ہی دیا۔

میں اپنے آپ ہی سرخرو ہو گئی۔ اپنے محترم استاد کو ان کی ہی تحریر پیش کرنے پر نہ جانے شاگردی کا پورا حق ادا کر پائی یا نہیں، لیکن میرا دل کسی حد تک مطمئن ہے اور میں اپنے دل کی بہت دلداری کرتی رہتی ہوں کہ یہ میرے پاس ہے تو میں بھی ہوں۔

☆☆☆

پروفیسر حسنین کاظمی، دلِ شوریدہ

4 مارچ 2013ء

شبی فاروقی ... ہمہ جہت شاعر

درس گاہیں تین قیمتی چیزیں عطا کرتی ہیں: استاد، علم اور ساتھی طالب علم۔ علم حاصل کرتے ہی طالب علم درس گاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ وہ علم جو زندگی بھر ان کے کام آتا ہے۔ ہاں یہ اور بات کہ کس نے اپنی جھولی کتنی بھری اور اس سے زندگی بھر کتنا کام لیا۔ اور استاد جو علم کا خزانہ بلاامتیاز لٹاتے ہیں وہ زندگی بھر کے لیے رول ماڈل بن جاتے ہیں۔ اب رہ گئے ساتھی طالب علم...... ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی بھی ساتھی کے چہرے کے نقوش دھندلا جائیں۔ درس گاہوں کا دیا ہوا یہ مفت عطیہ ساری زندگی ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ کسی بھی لمحے آنکھیں بند کرلیں، ماضی کی یادوں میں کھو جائیں، پھر جو سکون ملتا ہے اس کی لطافت سے تو ماضی شناس ہی آشنا ہیں۔ ماضی سے منہ موڑ کر نہ تو حال سے رشتہ جوڑا جاسکتا ہے، نہ مستقبل کو پایا جاسکتا ہے کہ جس عمارت کی بنیادیں ہی نہ ہوں اس پر نہ پہلی منزل بنائی جاسکتی ہے، نہ دوسری تجویز کی جاسکتی ہے۔

میری درس گاہ نے بھی مجھے تین چیزیں بخشی ہیں اور میں اس کی ہمیشہ ممنون رہی ہوں۔ ساتھی طالب علموں کا ساتھ زندگی کی ہزار بے کیفی کو منٹ بھر میں شادمانی سے بھر دیتا ہے۔ اگرچہ سارے ساتھی طالب علم عمر بھر ساتھ نہیں ہوتے کہ دنیا بڑی وسیع ہے اور اس کی بہت ساری سمتیں ہیں۔ بہت سے ان میں کھوجاتے ہیں۔ لیکن کچھ یا چند ایسے ہوتے ہیں جو اپنا رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔ ان ہی میں ایک شبی فاروقی ہیں۔

ہمیں وہ یونیورسٹی میں ملے اور ہمیشہ کے لیے مل گئے۔ ہم نے ساتھ ساتھ معلمی کے بہت سارے سال گزارے۔ ہماری ان کی بہت ساری لڑائیاں ہوئیں لیکن جب بھی کسی دوسرے نے ان کی برائی کی، ہم نے شبی کے حق میں جنگ کا آغاز کردیا۔ شاید دوستی اسی کو کہتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے کیسے یاد رکھتے ہیں لیکن شبی مجھے ہمیشہ ایک معصوم، مظلوم اور کھوئے کھوئے سے، بکھرے بکھرے سے، لاابالی شاعر کی حیثیت سے بہت عزیز رہے۔ یہ عجیب

خصلت کے شاعر ہیں جنہیں نہ مشاعروں کا دورہ پڑتا ہے، نہ واہ واہ کی گونج میں اپنے کو قید کرتے ہیں، نہ صفحات پر چھپنے اور چھپتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، نہ اپنے اعزاز میں کوئی شام کی تمنا رکھتے ہیں، نہ اپنا کلام مرتب کرتے ہیں، نہ ہی اپنا تعارف ایک شاعر کی حیثیت سے کراتے ہیں۔

شہر کراچی میں مشاعروں کی بہتات ہے۔ چھوٹا یا بڑا، اس کا فیصلہ تو وقت کرتا ہے، لیکن ہر پچیس برس کی عمر والا شاعر اپنے ہاتھوں میں اپنا چھپا ہوا کلام دستخط کے ساتھ کسی مستحق کو دیتا نظر آتا ہے۔ لیکن شی فاروقی ستر کی دہائی گذارنے کے باوجود آج تک کسی مجموعہ کلام سے محروم ہیں۔ بس ہماری لڑائی پچھلے چالیس برس سے اسی موضوع پر ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس کام کے لیے قدرت نے سال 2018ء ہی مقرر کیا ہوا تھا کہ میری اور شی کی لڑائی میں کمی آئی جب انہوں نے اپنی دوسری ہجرت کے بعد جو امریکا کے لیے تھی، پابندی سے سال بہ سال اپنے شہر کراچی آنا شروع کیا اور وعدہ کیا کہ اگر لڑائی ختم کروگی تب میں غزلوں کا مجموعہ تمہارے ہاتھ میں پکڑاؤں گا۔ میں نے وعدہ کرلیا۔ شی فاروقی صرف غزل کے شاعر ہی نہیں ہیں، خوب صورت نظمیں بھی کہتے ہیں۔ دوہے اور گیت کا تو کیا ہی کہنا۔ قارئین کو بتاتی چلوں کہ ان کے گیتوں کا مسودہ پچھلی صدی سے میرے پاس محفوظ ہے جس کی کاپی شاید ان کے پاس بھی نہیں۔ آج تک نہیں چھپ سکا کہ اس کے لیے شرط ہے کہ میں ان کے گیتوں پر اپنی رائے لکھوں گی۔ اور اگر کبھی نہیں لکھی تو یہ کبھی نہیں چھپے گی۔ میری شرط یہ تھی کہ پہلے غزلوں کا مجموعہ لاؤ پھر تمہاری شرط پوری کروں گی۔

شی فاروقی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر ایک میں کامیاب ہیں۔ لیکن شی صرف شاعر ہی نہیں، ساتھ میں ایک اچھے انسان اور بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ بہت مخلص، بہت شرمیلے، اپنے آپ میں مگن، دوستوں کے دوست اور اپنے بارے میں کی گئی کسی بھی تعریف پر اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ زبردستی کرنے پر شعر سناتے ہیں۔ داد ملے تو تعجب سے پوچھتے ہیں ''کیا واقعی؟'' اب ایسا شاعر اگر آپ لوگوں نے کہیں دیکھا ہو تو ضرور بتایئے گا۔

جب شی نے مجھ سے کہا کہ کتاب پر کچھ لکھ دو۔ تب میں نے بھی تعجب سے پوچھا تھا ''کیا واقعی؟'' کہنے لگے ''ڈر تو لگ رہا ہے لیکن بس ایک درخواست ہے، کچھ بھی لکھو یہ خیال رکھنا کہ میرے بچوں میں میری عزت بنی رہے''۔ اس درخواست پر ہم دونوں خوب ہنسے اور دیر تک ہنستے

رہے۔

سو شبی! تمہاری شاعری بہت اچھی ہے۔اس کا پوسٹ مارٹم تو اہلِ قلم کریں گے ہی، ہم تو بس صرف یہ کہیں گے کہ تمہارے اشعار سن کر اور پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے، تنہائی دور ہوتی ہے۔ دکھی ہوں تو سکھ ملتا ہے۔ سکھی ہوں تو اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ گویا یہ وہ ٹانک ہے جو زندگی میں حرارت پیدا کرتا ہے۔ میں اس کی معقول خوراک اپنے خالی لمحوں کے لیے اپنی ڈائری کے صفحات میں چھپا کر رکھتی ہوں۔ مجموعہ آجائے گا تب اسے اپنے سرہانے رکھوں گی۔ بک شیلف پر سجاؤں گی۔ ہر آنے جانے اور جاننے والوں کو بتاؤں گی کہ شبی مجھے جامعہ کراچی کے شعبہ معاشیات میں ملے تھے۔

میں آنرز فائنل میں تھی اور وہ ایم اے کے پہلے سال میں داخل ہوئے۔ ہماری کلاسیں ساتھ ہوتی تھیں۔ ہم کلاس میں معاشیات پڑھتے تھے۔کلاس کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر شعر سنتے اور سنایا کرتے، جب سے آج تک دوست ہیں۔ یہ کہنا میرے لیے فخر کا باعث ہوگا۔

''عمر میں کم و بیش تمہارے برابر ہوں، مگر کیا برابر والے ایک دوسرے کو دعا نہیں دیتے؟ جیتے رہو، لکھتے رہو اور چھپتے رہو کہ یہ صلاحیت خدا کی دین ہے اور تم اس کے امین ہو۔''

☆☆☆

خواب دربستہ

مجموعہ نظم۔کلام

مسلسل مشق سے گزرنا ضروری ہے ... سیما شاہد

سیما شاہد سے میں کبھی نہیں ملی شاید اس لیے کہ وہ مشاعروں کی شاعرہ نہیں ہیں۔ اپنی گھریلو مصروفیات میں گم ہیں۔ ایک تو انہیں اپنی مصروفیات کے سبب شعر گوئی کا زیادہ وقت نہیں ملتا، دوسرے محافل میں اشعار نہ سنانے کے سبب اُن میں اپنی ہی شاعری کے سلسلے میں کچھ جھجک موجود ہے جس کی وجہ سے ان میں ابھی تک وہ اعتماد پیدا نہیں ہو سکا جو شعر گوئی کے لیے ضروری ہے مگر اس کے باوجود وہ ان بہت سی شاعرات سے بہتر شاعرہ ہیں جو اس وقت میدانِ سخن میں موجود ہیں۔

جو ہم پہ گزرتی ہے وہ شعروں میں لکھیں گے

اپنے اس مصرعے میں انہوں نے شعر کہتے رہنے اور لکھتے رہنے کا عزم تو کیا ہوا تھا مگر وہ اپنی اس جھجک کی وجہ سے اپنے اشعار دوسروں تک نہیں پہنچا پا رہی تھیں۔ دوسروں تک شعر پہنچانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ پسند ناپسند کا پتہ چل جاتا ہے۔ پسندیدگی سے حوصلہ بڑھتا ہے اور تنقید سے بہتری پیدا ہونے لگتی ہے۔ ہمارے یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے، کہ وہ اپنی کیفیات سے مغلوب ہو کر خیالات صفحات پر تو منتقل کر دیتے ہیں لیکن انہیں دوسروں تک پہنچا نہیں پاتے یوں بہت سے کلام وقت کی گرد میں دب کر گمنام رہتے ہے۔ سیما نے شاید اپنے اندر یہ حوصلہ پیدا کر لیا ہے جب ہی تو وہ اپنا کلام ہم تک اور سب تک لے آئی ہیں۔

ایک مدت سے سو رہی تھی میں
اب ضروری ہے جاگنا میرا

ان کی جھجک بے وجہ تھی وہ اچھی خاصی شاعری کر لیتی ہیں۔ صبح سے شام تک وہ مکمل گھریلو عورت کی تصویر بنی رہتی ہیں۔ عورت کو مکمل عورت بنا ہی رہنا چاہیے اس میں بھلا دورائے کہاں ہیں مگر

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

کے مصداق مشقِ سخن کی چکی بھی چلانے میں کیا قباحت ہے کہ بہت سے کام ایک وقت میں نبٹانے کا فن عورت سے زیادہ بھلا مرد میں کہاں پایا جاتا ہے۔

بہت اچھا کیا سیما نے کہ اپنے دل کی واردات کو کتابی شکل دے ڈالی اور ان بہت ساری خواتین کی طرح نہیں بنیں اور اپنے قابلِ قدر خیالات اور خدا کی دین کو پامال ہونے سے بچالیا کہ "جو حرف چھپ گیا وہ رہ گیا۔"

انہوں نے خود بھی تو کہا ہے۔

مرے اشعار کتابوں میں رہیں گے زندہ
اب مجھے بھول نہ پائے گی یہ دنیا شاید

سیما کا سارا کلام میں نے توجہ سے پڑھا اور مجھے سیما مکمل ایک ماں اور بیوی کے روپ میں دکھائی دیں۔ بچوں کی ضروریات اور گھریلو کام میں انہوں نے اپنے آپ کو گم کر رکھا ہے۔ یہ کوئی منفی عمل نہیں ہے لیکن پھر وہی بات کہ مشقِ سخن کے لیے وقت نکالنا بھی ان پر فرض بن جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی رحمت ہے جو ہر کسی کو نہیں بلکہ کسی کسی کو ملتی ہے۔ سیما نے اپنی آنکھیں بند نہیں رکھی ہیں، ساتھ ساتھ اپنے گردوپیش کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کرتی نظر آتی ہیں۔ مایوسی اور ناامیدی ان کے یہاں ہرگز نہیں ہے اور جہاں یہ منفی جذبات نہ ہوں وہاں تعمیر اور ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا ان کا یہ شعر اسی دلیل پر پورا اترتا ہے۔

در و دیوار سے ہوتی ہے وحشت
تمنا ہے ہواؤں میں اڑوں میں

"سخن وری میری" سیما شاہد کا پہلا مجموعہ ہے بس اسے آخری نہیں ہونا چاہیے، یہ میری بھی خواہش ہے اور میرے خیال میں اسے پڑھنے والے ہر قاری کی بھی یہی خواہش ہوگی۔

سیما نے کہا ہے۔

میں اکیلی اس جہاں میں ہوں کہاں
ساتھ میرے گردشِ ایام ہے

گردشِ ایام ساتھ ہوتو ان کی چکی چلتی رہتی ہے۔بس اسے "مسلسل مشق" سے گذرتے رہنے دینا چاہیے۔

میں سیما سے بس یہی کہنا چاہتی ہوں......

سیما شاہد۔کتاب سخن وری میری

☆☆☆

محبت اور خوشبو کا امتزاج

شہرِ کراچی کے ماضی میں طالب علمی کا ایک مخصوص دور پایا جاتا ہے جو جامعہ کراچی، شہر کے ڈھیر سارے کالج اور ریڈیو اسٹیشن کے گرد گھومتا ہے۔

طالب علمی کے دور میں ساتھی طالبِ علم اور اساتذہ میں سے کوئی نہ کوئی دل کے کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس کی ذات اپنی ذات میں گھل مل جاتی ہے۔ زمانے کی بے ثباتی اسے نظروں سے اوجھل بھی کر دیتی ہے لیکن اس کی ٹھنڈی میٹھی یادیں دل میں مستقل بسیرا کیے رکھتی ہیں۔

میری زندگی میں بھی ایسے کئی ساتھی طالبِ علم آج بھی داخل ہیں، ایسے کئی اساتذہ ہیں جن کے وجود سے دل اور ذہن کا کونا کونا آباد ہے۔ لیکن شہر کراچی کی ایک ایسی شخصیت جو نہ ہمارے ساتھ کالج میں تھی نہ یونی ورسٹی میں، لیکن طالبِ علمانہ زندگی کا تصور آتے ہی وہ شخصیت اپنے بھر پور وجود کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ ذات یاور مہدی کی ہے۔ ان کے اس پورے نام میں سے "مہدی" یوں غائب ہے گویا ان کے نام کا یہ کبھی حصہ رہا ہی نہ ہو۔ تعلیمی زندگی کے جتنے ساتھی ہیں، ان کے ساتھ آج بھی جب ہم بیٹھتے ہیں تو یادیں ادھر ادھر سے بھٹکتی ہوئی یاور بھائی تک پہنچ جاتی ہیں جو چھوٹے اور بڑے ہر ایک کے یاور بھائی تھے۔ جامعہ نگری سے نکل کر سیدھے گھر جانا ہمارے لیے ممکن ہی نہ تھا جب تک کہ ہم ریڈیو اسٹیشن کے چکر نہ لگا لیتے جہاں یاور بھائی فرداً فرداً ہر ایک کے منتظر ہوتے۔ چہرے پر وہی ایک مخصوص مسکراہٹ، ایک جیسی تراش خراش کے لباس اور ادلتے بدلتے کمروں کے باوجود ان کا وجود ہر کمرے میں ایسا کہ جیسے ہمیشہ سے یہیں بیٹھے ہوں۔ مسکراہٹ، محبت اور خوشبو کا امتزاج "یاور بھائی" کہلاتا ہے۔

"بزمِ طلبا" کے گرد ہماری شخصیت گھومتی تھی اور ہماری شخصیت، ہمارا مزاج بنانے والے یاور بھائی تھے۔ وہ غصہ بھی کرتے مگر بالکل مصنوعی لگتا، وہ جھنجلاتے بھی مگر وہ کسی اور کی جھنجلاہٹ معلوم

ہوتی ۔ وہ اکثر کسی کسی کو نظر انداز بھی کرتے لیکن معلوم یوں ہوتا کہ وہ اس سے پیار کر رہے ہیں۔ وہ ڈانٹتے بھی لیکن لہجے کی شیرینی ڈانٹ کے اثر کو بالکل زائل کر دیتی ۔ میں اس وقت بھی یہی سوچتی تھی اور آج بھی یہی سوچتی ہوں کہ ایسے مزاج کی شخصیتیں اور کتنی ہوں گی ۔

آج جبکہ زمانے کے مزاج سے محبت غائب ہوگئی ہے، ماحول میں خلوص کی کمی ہے، چہروں سے مسکراہٹ دُور ہوگئی ہے، فضا میں مروت کی کہیں بھی خوشبو نہیں؛ ہر طرف دھند ہے بے گانگی کی، بے زاری کی، بے مروتی کی، نظر انداز کر دینے کی؛ کہیں کسی سے لگاؤ نہیں؛ کسی کے لیے کچھ کر گذرنے کی تڑپ نہیں ہے، کسی کا کسی کو انتظار نہیں....لیکن آج بھی یاور بھائی کی ذات میں محبت، خلوص، مسکراہٹ، مروت، پہچان اور کسی کے لیے بھی کچھ کر گزرنے کا جذبہ جوان ہے۔

سفید بالوں والے یاور بھائی ہمیشہ سے ہی اتنے معتبر تھے جتنے کہ آج ہیں کہ ان پر نوجوانی کا دور کبھی آیا ہی نہیں، شاید اس لیے کہ نوجوانی میں نوجوانوں کی سرپرستی اور رہبری انھیں سونپ دی گئی تھی اور وہ وقت سے بہت پہلے بڑے ہو گئے تھے جبھی تو وہ ہر بڑے کے راہ رو بھی تھے اور محتسب بھی ۔ آج وہ لوگ جو اپنے اندر بولنے، لکھنے لکھانے اور خود اعتمادی کا جوہر پاتے ہیں، اپنی بات دوسروں کو سمجھانے کا فن جانتے ہیں، وہ کسی نہ کسی اعتبار سے یاور بھائی کے مقروض ہیں اور اپنے اپنے ٹھکانے پر حسن وخوبی سے اپنا فریضہ انجام دیتے ہوئے ان کا قرض مسلسل چکا رہے ہیں ۔ یاور بھائی کے جینے کے لیے ان کا یہ فعل یقیناً کافی ہوگا ۔

آج جب ہم طالبِ علم نہیں اور "بزم طلبا" کا وہ زمانہ بھی نہیں اور ریڈیو اسٹیشن "ممنوعہ علاقہ" بھی ہے، یاور بھائی آج بھی ہمارے "یاور بھائی" ہیں کہ محبت ہمارے وجود کا حصہ ہے ۔

کتاب ۔ یاور مہدی

☆☆☆

کچھ اور اعتبارِ شب و روز چاہیے

فن اور پرندوں کے لیے کوئی سرحد مخصوص نہیں ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ جغرافیائی تقسیم، موسم، حالات اور معاشرتی دباؤ مختلف سرحدی حصار میں مختلف طور پر جنم لیتے ہیں، پلتے ہیں اور اپنی شکل بنا لیتے ہیں۔لیکن سفر ان کی سرشت میں موجود ہوتا ہے۔

ہم آسمان پر اکثر نظریں دوڑاتے ہیں خصوصاً صبح کے وقت جب سورج طلوع ہو رہا ہوتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایسے ہی آسمان دیکھ کر کہا تھا۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اور اس وقت بھی جب سورج رخصت ہو رہا ہوتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

آسمان پر نظر دوڑانے کے لیے میں نے یوں کہا ہے کہ اس وقت پرندے سفر میں ہوتے ہیں۔ وہ غول کی صورت میں اچانک کہیں سے آتے ہیں۔ آسمان پر لکیر کی صورت سفر کرتے ہوئے، ملک کی سرحدوں کی پروا نہیں کرتے۔ ادھر ادھر محو پرواز رہتے ہیں۔ انہیں کوئی روکتا بھی نہیں اور روک سکتا بھی نہیں۔

اسی طرح فن کی بھی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ وہ یقیناً ایک خطے، ایک موسم، ایک معاشرے کی سوچ میں جنم لیتا ہے لیکن جنم لیتے ہی خوشبو کی طرح پھیل جاتا ہے۔ پروین شاکر نے کہا ہے

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

جی ہاں فن خوشبو کی طرح پھیل کر پذیرائی حاصل کرتا ہے۔ فنِ شاعری کا سفر بھی خوشبو کی مانند ہوتا ہے۔ میرے پاس بھی سرحد پار سے چند اشعار اڑ کر پہنچے ہیں۔ ایسے شاعر کے جسے میں نے نہیں دیکھا ہے۔ پہلے پڑھا بھی نہیں ہے۔ لیکن میرے بھائی عابد سلیم پوری نے مجھ تک چند اشعار یوں پہنچائے کہ میں پہلے تو انہیں پڑھ کر مرعوب ہوں، مسحور ہوں اور پھر اپنی رائے کا اظہار کروں۔

میرے والد، دادی، پردادا۔ ماموں وغیرہ سب اپنے اپنے وقت کے مشہور و مقبول شاعر تھے۔ ان میں سے ہر ایک صاحبِ دیوان ہے۔ اور اتفاق یہ ہے کہ یہ سب ہجرت سے قبل کے شاعر ہیں۔ جنہیں میں نے نہ دیکھا نہ ان سے ملی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ غازی پور یو پی شہر کے مولوی عبدالصمد اور قاری محمد علی دونوں بھائی آسی غازی پوری کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور جن کے حلقۂ احباب میں مرزا غالب بھی دلی بیٹھے بیٹھے شامل رہے۔

یہ وہ لوگ تھے جو میری پیدائش سے قبل اپنی طبعی عمر گذار کر اور اپنے کارنامے چھوڑ کر دنیا سے جا چکے تھے۔ والد اور دادی کا غیر مطبوعہ کلام مجھ تک پہنچا۔ اگر چہ ہجرت کی تاریخ ہم پر گزاری جا چکی تھی۔ دونوں کا دیوان خود چھاپا۔ پڑھا۔ متاثر ہوئی۔ لیکن اپنے آپ کو نثر کے میدان میں کھڑا پایا۔ مگر شاعری کی خوشبو ہمیشہ دل کو بھاتی رہی۔

شاید اسی لیے ننھیال سے متعلق میرے بھائی عابد سلیم پوری نے عندلیب صاحب کے چند اشعار مجھ تک پہنچائے اور مجھے امتحان میں ڈال دیا کہ میں ان پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ یہ ان کی محبت سہی مگر میں اسے امتحان سمجھتی ہوں۔ وہ پروفیسر ہیں۔ اپنی پروفیسری دکھا گئے۔ مگر انجانے میں انھوں نے وار تو اپنی بہن پر کیا ہے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ پروفیسری ادھر بھی ہے جو امتحان لینا اور دینا جانتی ہے۔

عندلیب زمانی کے جو چند اشعار مجھ تک پہنچے ہیں۔ پہلا پہلا تاثر ان کا مجھ پر یہ ہوا کہ ان کی تحریر یا سوچ میں ہلکی ہلکی سی کسک ہے۔ آنسوؤں کی روانی نہ سہی مگر آنسو آنکھوں میں بھرے ہوئے ضرور ہیں۔ اور چھلک پڑنے کے لیے بے قرار و بے تاب ہیں۔ اداسیاں اور ماضی کی کچھ تلخ یادیں ان کا پیچھا کرتی ہیں۔ وہ ان یادوں سے دامن چھڑانا بھی چاہتے ہیں اور یہ جانتے بھی ہیں کہ یہ تو اب زندگی بھر کا روگ ہیں۔

بے وفائی اعتمادِ زندگی کو ڈس گئی
ہستیٔ موہوم بن کر پتھروں کے گھر میں ہوں

وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نہیں آنا چاہتے لیکن اگر آ بھی جائیں تو انہیں جو کچھ جواب میں ملے گا وہ ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ کہتے ہیں

میں اپنی تشنہ لبی کو عیاں تو کر دوں
وہ میرے حالِ دل پہ صرف مسکرا دے گا

اور پھر ان کا اپنا ایک ماضی ہے جو شاید کبھی خوب صورت تھا۔ مگر اب اس کی یاد خوب صورت نہیں

میز پہ میں نے بس رکھے ہیں یادوں کے خطوط
اپنے ماضی کا یہ سرمایہ اٹھا لے جاؤ

یا پھر یہ شعر...

ذہن کے بند دریچے پہ یہ کس کی دستک ہے
بھولی بسری ہوئی یادوں کی ہوا ہے شاید

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں "اٹھا لے جاؤ"۔ یا دوسرے شعر میں "کس کی دستک" "یادوں کی ہوا" اسے سمجھنے کے لیے ایسے ہی دکھ سے گزرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ دکھ شاید ہر حساس انسان کے حصے میں آتا ہے۔ بس یوں شعر میں بیان کر دینا کسی کسی کو آتا ہے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی حصے میں کسی شخص سے معمولی سا تعلق دل کی حساس سلیٹ پر دائمی نقش بن جاتا ہے۔ شاعر کے دل کی سلیٹ تو ہوتی بھی بڑی حساس ہے۔ اس میں جو درد شعر بن کر ڈھلتا ہے وہ کچھ یوں ہوتا ہے

ملے تھے مجھ کو جزیرے حسین لفظوں کے
مشاہدوں کے سمندر کے پار اترے تھے
بس ایک بار پیا تھا کسی کی آنکھوں سے
تمام عمر اسی جام کا سرور رہا

میری چاہت میرے انکار کا حاصل کیا ہے
رات سے صبح تک سوچ کے مر جاتا ہوں

تلاشِ معاش آج کل ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیتا ہے
گھر پہ میرے نہ رہنے سے بچے بگڑ گئے
میں ساری عمر پیسہ کمانے میں رہ گیا

یہ شعر اسی حقیقت کا عکاس ہے۔ جہاں باپ روزی کی تلاش میں گھر سے دُور ہو جاتا ہے اور اپنے بچوں کے بڑھتے قد کے خوب صورت لمحوں سے لطف نہیں لے پاتا ۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر وہ اس ملال سے گزرتا ہے کہ تربیت کی جو ذمہ داری قدرت نے اسے سونپی تھی وہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر پایا۔ اس دوڑ دھوپ نے ہماری روایات اور اقدار کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے عندلیب زمانی کا یہ شعر ہمارے دور کی مکمل ترجمانی کر رہا ہے۔

میرے علم میں ہے کہ عندلیب صاحب کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ پہلے بچے کی مانند ہوتا ہے۔ امیدوں سے بھر پور اور دل کے بہت قریب ۔ مگر ایسے میں ڈر بھی لگتا ہے کہ امیدیں اور محبت اپنے لیے کافی نہ سمجھ لی جائیں ۔ گامزن رہیں۔

عشق کے اور امتحان ۔ اور ستاروں سے آگے اور جہان کے امکان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔
میرا کہنا ہے کہ " چلے چلو کہ منزل ابھی نہیں آئی۔ "

عندلیب زمانی کے اشعار
بنارس (انڈیا)

☆☆☆

نوشابہ صدیقی کی کتاب چشم حیراں دیکھی اور رکھ دی ۔ اسے کیا پڑھنا ان کی تحریر پہلے پڑھی نہیں تھی ۔ لیکن بیٹھے بیٹھے یوں ہی اس کے اوراق پلٹنا شروع کئے تو پہلے ہی خاکے نے ہمیں پکڑ لیا ۔ یہ خاکہ جمیل جالبی کا ہے ۔ پڑھنا شروع کیا تو پڑھتے ہی چلے گئے ۔ کتنے ہی خاکے تھے ۔ہم پروفیسر صاحبہ کی نظر سے انہیں دیکھ رہے تھے ۔ ہم ان شخصیتوں کی قلمی تصویروں ہی سے لطف نہیں لے رہے تھے بلکہ میٹھی میٹھی اور چٹخارے دار زبان کا بھی مزا لے رہے تھے ۔ بلکہ اچھی زبان پڑھ رہے تھے ۔ اور اچھی زبان ہماری کمزوری ہے ۔

مسعود شعر

نوشابہ صدیقی کا انداز تحریر پُراثر ہے اور ان کے الفاظ جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں ۔ ان کی منظر نگاری اور حسن فطرت کی تصویر کشی بھی بہت خوب صورت ہے وہ رومانی مشرقی جذبے کی تشکیل بہت سلیقے سے کرتی ہیں ان کے ناول صلیب کے زخم میں مشرق کا رومان کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔

فیصل عظیم

نوشابہ صدیقی کہانی میں زیادہ موڑ نہیں مڑتیں ۔ لیکن جہاں مُڑتیں ہیں ایک دم پہاڑی راستوں کی مانند مڑ جاتی ہیں ۔ ہر ہر جملے میں آپ کا مطالعہ اور مشاہدہ آپ کی تعلیم اور تربیت بولتی، سنائی اور دکھائی دیتی ہے ۔ جہاں ان کی آنکھوں میں نمی اترتی ہے قاری دھاڑیں مار مار کر رو دیتا ہے ۔ یہ تحریر کا حسن اثر اور سحر ہے ۔ نہ آپ نکل سکتے ہیں نہ ہی نکلنا چاہتے ہیں

فرید بھٹہ



میرے قلم سے اور بھی

A Text Book of Economic Theory
for B.A, B.Com. M.A

کتاب معاشیات	انٹر کامرس کے لیے
صلیب کے زخم	ناول
افکار حسن	مرتب (والد کی شاعری)
سرشام	خاکے مضامین
زندگی بھر کی بات	ناول
کلام اشرف کمال حسین	ترتیب وتدوین
دل شوریدہ	مرتب
چشم حیراں	خاکے۔مضامین
چشمِ نم	سفرنامہ

Fazlee's BOOK
507/3, Temple Road, Urdu Bazar, Karachi
0336 2633887
fazleebook@gmail.com
From Ideas to Pages – Perfect Book Printing, Digitally Crafted!
ISBN 978-969-441-353-2
9 789694 413532
Rs. 1000/-